Marfat.com

1085/2

عُلماءِ ہند کا شاندار ماضی

مصنف

جلد دوم

مُسلمانانِ برِّصغیر اور تحریکِ آزادی

حُجتہ الاسلام شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے انقلاب انگیز حالات

از

حضرت مولانا سیّد محمّد میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مُحدِّث، فقیہ، مُورِّخ، مُجاہد فی سبیل اللہ، مُؤلِّفِ کُتبِ کثیرہ

مکتبہ محمودیّہ۔ لاہور

Marfat.com

حقوق طباعت محفوظ بنام مولانا سید حامد میاں صاحب مہتمم جامعہ مدنیہ - لاہور

58864

سالِ اشاعت ...... ۱۳۹۷ھ، ۱۹۷۷ء

ناشر .... مکتبہ محمودیہ جامعہ مدنیہ لاہور

تعداد .... ۱۰۰۰ (ایک ہزار)۔

قیمت جلد دوم وسوم (مجلّد) -/۴۲ روپے

قیمت (مجلّد) ۴ جلدیں -/۱۱۲ روپے

مطبع ۔ المکہ پریس ۵ شارع فاطمہ جناح لاہور

ملنے کے پتے

مکتبہ محمودیہ جامعہ مدنیہ لاہور

کتب خانہ شانِ اسلام راحت مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

سبحانی اکیڈمی - اُردو بازار، لاہور

مکتبہ رحمانیہ - اُردو بازار، لاہور

نعمانی کتب خانہ - اُردو بازار، لاہور

مکتبہ چراغ اسلام - اُردو بازار، لاہور

Marfat.com

1085/2

فہرست مضامین

شاندار ماضی - جلد دوم

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی سیاسی تحریک ۱
اٹھارویں صدی پر ایک نظر ۱
شاہ ولی اللہ کے سیاسی نظریات ۶
تشریحات و اقتباسات ۱۰
تحریک کا نصب العین ۲۳
جماعت اور زعماء ۲۸
مشکلاتِ راہ ۳۲
شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ۳۸
کارپردازانِ حکومت کا سلوک ۴۵
سیاسی بحران اور متحارب طاقتیں ۴۸
انگریزوں سے معاہدے کے بعد گروپ بندی ۷۱
انگریز دشمن طاقتوں کا حسرتناک انجام ۷۳
اٹھارویں صدی کا خاتمہ ۷۶
انگریزی اقتدار کی نوعیت ۷۷
شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ ۷۹
انیسویں صدی کے پہلے پچیس سال ۸۴
انقلابی پروگرام کی ذمہ داریاں اور تقسیم کار ۸۹
حرکتِ عمل انقلاب انگیز دورے ۹۲
سید صاحب کے قافلہ کا پہلا دورہ ۹۳
سماجی اصلاحات اور جہاد فی سبیل اللہ ۹۴
کے لئے تربیت
مقامی نقیب اور ذمہ دار ارکان ۱۰۴
سہارنپور سے دہلی ۱۰۸
دارالحکومت لکھنؤ ۱۱۴
سید صاحب اور آپ کے قافلہ کا ۱۲۷
دوسرا دورہ
دوسرے دورہ کے مختصر حالات ۱۳۳
مقامی حضرات ۱۴۸
اصلاح و تربیت ۱۵۶
رہنمایانِ تحریک کے ذاتی اوصاف ۱۶۳
شیخ الاسلام مولانا سید عبدالحی صاحب ۱۶۸
حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید ۱۷۰
شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات ۱۷۷
ولی اللّٰہی فوج کا انقلابی اقدام ۱۸۲
عارضی حکومت کا مقصد ۱۹۲
عارضی حکومت کی آزاد فوج کا کردار ۱۹۷
عارضی حکومت کے مخالفین ۲۰۸
جنگی اقدامات اور ان کے نتائج ۲۱۶
شہادت کے بعد ۲۲۳
مشرقی محاذ ۲۲۴
لفظ "وہابی" کی حقیقت ۲۲۶
مدمقابل ۲۳۶
سکھ مسلم تعلقات ۲۴۲
دہلی کا مرکز ۲۴۹
ضمیمہ ۲۵۲

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اولٰئک ھم الراشدون

دامانِ خلافت ذی النورین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے

شواھدِ تقدس

اور

تردیدِ الزامات

مودودی صاحب کی "شیعیت" "خلافت و ملوکیت" کے آئینے میں

بصیرت افروز محققانہ مباحث کا مجموعہ

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

رئیس التحریر ادارہ مباحث فقہیہ ہند

صدر مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ امینیہ، دہلی

مکتبہ محمودیہ

بیت الحمد

جامعہ مدنیہ کریم پارک

Marfat.com

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

انتساب اور وجہِ تالیف

علماء ہند کا شاندار ماضی پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ برطانوی دور تھا جنگ کا زمانہ۔ فوراً ہی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا گیا۔ کتاب ضبط اور مصنف گرفتار اُس زمانہ کی اُمنگیں اور تھیں۔ جیسے ہی مقدمہ اور اُس کی ہلکی سی سزا سے نجات ملی، کتاب پر نظرِ ثانی شروع کردی، اور تھوڑے ہی دنوں میں جلد اوّل ۱۶۰ صفحات کے بجائے تقریباً ایک ہزار صفحات میں اور پانچویں جلد ڈیڑھ سو صفحات کے بجائے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات میں پھیل کر پریس میں چلی گئی اور اب اُن کے نام یہ ہوگئے:

۱: علماء ہند کا شاندار ماضی جدید۔ جلد اوّل

۲: علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے۔ (دو جلد)

پھر ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا۔ اُس نے عمل کا دوسرا میدان پیش کردیا، شاندار ماضی کی باقی جلدوں پر نظرِ ثانی کے مسودے بھی کاغذوں کے طومار میں دب گئے اور اُن کے پورا کرنے کا تصور بھی دماغ سے نکل گیا۔

اپریل ۱۹۵۳ء اور جنگِ آزادی کی تاریخ

انقلاب ۱۹۴۷ء سے چھ سال بعد اپریل ۱۹۵۳ء میں مرکزی حکومت کے وزیر ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کی زیرِ صدارت، تحریکِ آزادیِ ہند کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند اور رفیقِ محترم حضرت الحاج مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ناظمِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی کا اصرار ہوا کہ احقر

Marfat.com

دوبارہ قلم ہاتھ میں لے اور نیا نِب لگا کر خامہ فرسائی شروع کردے۔ ابھی احقر سوچ وچار ہی کر رہا تھا کہ ڈاکٹر سیّد محمود صاحب نے یاد فرما کر اس فرمائش میں "حکم" کی قوّت پیدا کردی اور یہ صورت تجویز کی کہ احقر اپنے انکشافات کے نوٹ تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کے حوالہ سے کمیٹی کو پہنچاتا رہے اور خود بھی مستقل کتاب کی شکل میں اشاعت کا انتظام کرے۔

تاریخ آزادی مرتب کرنے والی کمیٹی کا کام تو ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم نے اس شکستہ حال کو نہ صرف ایک جلد بلکہ اس کے بعد کی جلدوں کی ترتیب کی توفیق بھی بخش دی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔ اس وقت یہ جلد علماء ہند کے شاندار ماضی کی جلد دوم کی حیثیت سے خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

انتساب

یہ حقیر تصنیف ایسے تمام حضرات کی خدمت میں نذر ہے جو صحیح تاریخ کے آرزومند ہیں تاکہ وہ تلخیاں جو برطانوی سامراج کے دَور میں تاریخ کو مسخ کر کے پیدا کی گئی ہیں، ختم ہوں اور ہندوستان پھر سے پریم و محبّت کا باغِ ارم بنے۔ آمین۔

محمد میاں عفی عنہ

۲۷ ر ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ　　۲۶ ر جولائی ۱۹۵۷ء

ذخیرہ
لاہور پاکستان

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله وکفٰی و سلام علٰی عبادہ الّذین اصطفٰی

ہندوستانی مسلمان اور تحریکِ آزادی

حصّہ اوّل

○

شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی کی سیاسی تحریک

شاہ ولی اللہؒ اٹھارویں صدی کا آغاز تھا کہ اس جلیل القدر فاضل، آزاد خیال مفکر اور انقلاب آفریں مصلح کی کتابِ زندگی کا افتتاح ہوا۔ اور ساتویں دھائی کے پورے دو سال بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء میں اُس نے صحیفۂ حیات کا آخری ورق پلٹ دیا۔

اٹھارویں صدی پر ایک نظر یہ وہ انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز صدی تھی جس میں ایک شاہنشاہیّت کا آفتاب ڈھلتے ڈھلتے غروب کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور ایک دوسری شاہنشاہیت کی صبحِ کاذب ہندوستان کے مشرق میں صبحِ صادق بنتی جا رہی تھی۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو قندھار سے آسام تک، نیپال اور تبت سے مالابار و کھمبات تک پورے ملک کا سیاسی مرکز ایک تھا۔ مگر ابھی پہلی دھائی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فروری[1] ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد وہ قیامت برپا ہوئی کہ شیرازۂ ملک کا ایک ایک ورق جدا ہو گیا اور یورپ کی وہی سفید فام طاقتیں جن پر عالمگیر کے دادا پردادا

---

[1] ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ یوم جمعہ (سیر المتاخرین) ۱۹ فروری ۱۷۰۷ء (تقویم ہجری و عیسوی)

Marfat.com

نے مہربانیوں اور شاہانہ عنایات کی بارش کی تھی، جن کو عالمگیر کے باپ (شاہجہاں) نے شکنجۂ تادیب میں کسا تھا، جن کو عالمگیر نے پہلے ملک بدر کیا تھا پھر معاف کر کے تجارت کی اجازت دی تھی، ابھی سو سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ عالمگیر کی راجدھانی پر اس کا تسلّط، اور عالمگیر کا پوتا شاہ عالم اس کا وظیفہ خوار تھا۔

دوسرے الفاظ میں اس صدی کے مدّوجزر کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی شاہنشاہانہ عظمت سے اس کا آغاز ہوا۔ اور خاتمہ اُس فدائے ملک وملّت کی شہادت پر ہوا جس کو دُنیا سلطان ٹیپو کے نام سے پہچانتی ہے۔ جس کے خونِ شہادت میں لتھڑے ہوئے جنازہ کو دیکھ کر انگریز فاتح کی زبان بے ساختہ پکار اُٹھی تھی:

"آج ہندوستان ہمارا ہے"

اس صدی کے قیامت خیز ہنگاموں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مرکزی حکومت کے ارکان میں ایرانی، تورانی یا شیعہ سُنّی اختلاف و کش مکش کا مرض جو عالمگیر کی زندگی تک دبا رہا تھا، وفات کے بعد پوری شدّت سے اُبھرا، اور وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں صرف پچاس سال کے عرصہ میں (۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۷ء) تختِ دہلی پر دس تاجدار بٹھائے گئے اور اُتارے گئے۔ اُن میں صرف چار اپنی موت سے مرے۔ باقی کے سر قلم کئے گئے یا تخت سے اُتار کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔

(۲) صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے، اور مغل شاہنشاہ ایک دعاگو "مرشد" بن کر رہ گیا۔

(۳) جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل طاقت بن گئی۔

(۴) دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اس کے مقابل اودھ کی وزارت نے شاہنشاہیت اختیار کر لی۔

(۵) دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت اُبھری۔ اور

(۶) شمال مغرب میں خالصہ (جو اَب تک مذہبی فرقہ رہا تھا) ایک مستقل سیاسی

Marfat.com

طاقت بن گیا۔

ان طاقتوں کے تصادم سے سرزمین وطن کا چپّہ چپّہ میدانِ کارزار بنا۔ بار بار اُن کے سیلاب دہلی تک پہنچے اور تین سو سالہ شاہنشاہیت کے احترام کو پامال کیا۔ ان جنگ جُو طاقتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے باہر کی طاقتوں سے بھی ساز کیا۔ ایک گروپ نے نادر شاہ کو بُلایا۔ تو دوسرے گروپ نے ابدالی کو دعوت دی۔ نوعیت میں کسی قدر فرق رہا۔ مگر وطن اور اہلِ وطن کو نقصان[1] پہنچانے میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھے رہے۔

یہ حال اُن طاقتوں کا تھا جن کا مرکز ہندوستان یا ایران و افغانستان تھا یا جو پایۂ تخت دہلی سے قریب کا تعلّق رکھنے والی تھیں۔ باقی رہیں یورپ کی وہ سفید فام طاقتیں جو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں قدم جما چکی تھیں۔ وہ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کی حریف ہوگئی تھیں مگر ہندوستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھانے میں سب شریک تھیں۔ بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمّہ داروں نے تمام یورپین ساتھیوں سے آگے بڑھ کر اس خانہ جنگی سے وہ فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جو ایک بیدار مغز چست و چالاک حریف

---

[1] نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء (۱۱۵۱ھ) میں جو قتلِ عام کیا اسمیں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہیں تھی، بلکہ جانی اور مالی تباہیوں کے شکار بننے والے عموماً مسلمان تھے کیونکہ یہی مدِّ مقابل تھے انہیں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور اور انہیں کے قبضہ میں ملک کے خزانے تھے اور انہیں کی غلط کاری نے نادر شاہ کو قتلِ عام کیلئے اُبھارا تھا (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم) ابدالی کا سب سے بڑا تصادم بیشک مرہٹوں سے ہوا مگر اس کے بار بار حملوں میں مسلمانوں کا نقصان بھی مجموعی حیثیت سے کچھ کم نہیں رہا۔ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مرحوم، نادر شاہ کی قوت دو روزہ تھی اور ابدالی کی فوجیں دو ماہ تک دہلی کو اس طرح لوٹتی رہیں کہ نادر گردی کو بھی بھلا دیا۔ گو احمد شاہ ابدالی اپنی طبیعت اور مزاج سے نادر شاہ کی مانند بے رحم اور سفاک نہ تھا مگر اسکی سپاہ نادر کی سپاہ سے زیادہ اُجڈ اور وحشی تھی۔ وہ اس کے کہنے میں نہ تھی۔ ۱۱ ستمبر ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۷ء) کو وہ داخل ہوا اور دو مہینے تک برابر لوٹتا رہا۔ بڑے بڑے امیروں کے گھر میں جھاڑو کا تنکا تک نہ چھوڑا (صفحہ ۲۹۷ تاریخ ہندوستان ج ۹)

Marfat.com

ایسے موقع سے حاصل کر سکتا ہے۔

اُس نے بنگال میں اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی[1] انتہا یہ کہ ایک طرف ابدالی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کا خاتمہ کر رہی تھیں تو دوسری جانب بنگال میں انگریزی فوجیں سراج الدولہ کو موت کے گھاٹ اُتار کر غیر ملکی شاہنشاہیت کے پرچم لہرا رہی تھیں۔

شاہ ولی اللہؒ

تشخیصِ مرض اور فکرِ علاج

یہ تمام تباہ کن خونیں ڈرامے، شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی میں اُن کی چشمِ بینا کے سامنے ہو رہے تھے۔

ایک طرف آپ کے قلبِ حساس میں بربادیٔ وطن کا درد تھا۔ دوسری طرف آپ کا مغزِ بیدار، اسبابِ مرض کی تلاش اور فکرِ علاج میں مشغول تھا۔

اسی اضطراب اور بے چینی میں آپ نے اصلاحی جِدّ و جُہد شروع کی جس کی شدّت سے مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مسجد فتحپوری سے نکلتے ہوئے آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔

اسی ادھیڑ بُن میں آپ نے ۱۷۲۸ء / ۱۱۴۳ھ میں حجاز شریف کا سفر اختیار کیا۔ وہاں دو[2] سال قیام کر کے علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔ ترکی حکومت کو اگرچہ سماجی خرابیوں کا گھُن لگ چکا تھا مگر پھر بھی وہ اس زمانہ میں ایشیا کی سب سے بڑی حکومت

لہ ۱۷۴۷ء / ۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ قتل کیا گیا۔ اس کی جگہ فوج نے احمد شاہ ابدالی کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اسی سال ۱۷۴۷ء سے احمد شاہ کے حملے ہندوستان پر شروع ہو گئے۔ جنگِ پلاسی کے سال یعنی ۱۷۵۷ء / ۱۱۷۰ھ میں اُس نے متھرا اور دہلی کو لوٹا اور واپس چلا گیا۔ پانی پت کی وہ مشہور لڑائی جس میں مرہٹوں کا غیر معمولی قتلِ عام ہوا، جنگِ پلاسی سے ساڑھے چار سال بعد ۶ جمادی الاخری ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی۔

Marfat.com

تھی۔ تمام مشرقِ وسطیٰ پر اُس کے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ بحرِ عرب میں عدن تک اس کا قبضہ تھا اور یورپ و افریقہ کے بھی بہت سے حصّے اُس کے زیرِ اقتدار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس سب سے بڑی حکومت کے اندرونی حالات کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"احوالِ ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است۔ بلادِ عرب نیز دیدیم و احوال مردم ولایت[1] از ثقات اینجا شنیدیم[2] ع"

ان تمام ممالک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے گہرے سوچ بچار اور اعلیٰ تدبر نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ سماجی، معاشی یا اقتصادی تباہیاں اس وقت موجود ہیں اُن کا اصل سبب "ملوکیت" اور "شاہنشاہیّت" ہے۔

اس سفرِ حجاز میں آپ کے ضمیر کی آواز نے یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ ان تباہیوں اور بربادیوں کا واحد علاج "فک کل نظام" ہے۔ یعنی ایسا ہمہ گیر اور مکمّل انقلاب جو سماج کے معاشی، سیاسی، اقتصادی، غرض ہر ایک ڈھانچہ کو بدل ڈالے۔ کیونکہ اس وقت کا ہر ایک نظام، اس کا تعلّق کسی بھی شعبہ سے ہو، شاہنشاہیت کا پروردہ ہے اور وہ امراض جو شاہنشاہیّت کے ساتھ لازم ہوتے ہیں، ہر ایک نظام میں سرایت کر چکے ہیں۔ بس کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہر ایک نظامِ کہنہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ نظامِ نو تعمیر کیا جائے۔ یہی ہے "فک کل نظام"۔

انقلاب کا طریقہ شاہ صاحبؒ فوجی انقلاب کے حامی تھے۔ مگر وہ فوجی انقلاب جو جہاد کے اصول پر ہو یعنی جس کا نصب العین سب سے بہتر و برتر ہو اور جس کا

---

[1] ترکی حکومت کے یورپین مقبوضات۔ [2] کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید بحوالہ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۴۔

ع ہندوستان کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان خود اپنا وطن ہے۔ ممالکِ عرب بھی دیکھ لئے ہیں اور ولایت والوں کے حالات وہاں کے معتمد لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ہر ایک مجاہد ذاتی اغراض[1] سے یہاں تک بلند ہو کہ خود اپنی شخصیت کو بھی فنا کر چکا ہو، یہانتک کہ فنا کو بقاء اور نصب العین کے لئے قربان ہو جانے کو ابدی زندگی تصور کرے۔

ایسا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان رضا کاروں کے ذریعہ ہو سکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو، جو نصب العین کو سمجھیں اور اصلاحی نظریات پر پہلے اپنے آپ کو ہموار کریں۔ اس کے بعد اُن کو کامیاب بنانے کیلئے قربان ہو جانا اپنی زندگی کا آخری مقصود بنالیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سب سے پہلے یہی خدمت انجام دی۔ آپ نے اصلاحی نظریات مرتب کئے۔ ساتھ ساتھ ٹریننگ کے سنٹر قائم کئے مگر آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس خدمت کی تکمیل آپ کے پس ماندگان بالخصوص خلف اکبر حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے سپرد ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پہلے اصلاحی نظریات ملاحظہ فرمائیے۔

شاہ ولی اللہؒ کے اصلاحی نظریات

ہندوستان اس خوش قسمتی پر جس قدر فخر کرے کم ہے کہ اس دور میں کہ ابھی انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء جس کو انقلاب پسندانِ عالم کے لئے نشانِ راہ کہا جاتا ہے نصف صدی بعد آنے والا تھا۔ اور کمیونزم کے معلّمِ اوّل کارل مارکس اور اس کے نفسِ ناطقہ اور رفیقِ عزیز "اینگلس" کی پیدائش میں پوری ایک صدی باقی تھی اور اس سے تقریباً چالیس

[1] مذہبی اصطلاح میں اس کا نام للّٰہیت ہے یعنی صرف خدا کیلئے جس کی حدود یہ ہیں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ سب سے بہتر وہ ہے جو خدا کے کنبہ کی بھلائی اور بہتری کیلئے قربانی دے مگر اس لئے نہیں کہ خلقِ خدا اس کا احسان مانے یا اُس کا نام بلند ہو یا اسکی تاریخ روشن ہو بلکہ اسلئے کہ خدا پرستی کا یہی تقاضا ہے، حق و صداقت کا یہی فیصلہ ہے اور ایک انسان کا بحیثیت شریف انسان کے یہی فرض ہے کہ وہ نام و نمود کا خواہاں نہ ہو۔ نہ قیادت و سیادت اُس کے پیش نظر ہو بلکہ ان سب اغراض سے بالا ہو کر وہ کام کرے۔

Marfat.com

سال پہلے کہ یورپ میں مشینوں اور کلوں کا آغاز ہوا، ہندوستان کے ایک سپوت نے اقتصادیات کے بارہ میں طے کیا کہ:

اقتصادی اصولع

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشتکار قوّتِ کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون، مدنیت (شہریت) کی روحِ رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں[1]

(۲) جوا، سٹّہ اور عیاشی کے اڈّے ختم کئے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیمِ دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا، اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے[2]

(۳) مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دماغی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ اُن کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لئے خطرہ ہے، اُس کو ختم ہو جانا چاہیئے[3]

(۴) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے۔ مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے، اُس کو ختم ہو جانا چاہیئے[4]

(۵) ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں۔ جبتک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے[5]

(۶) جو پیداوار یا آمدنی تعاونِ باہمی کے اُصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے[6]

(۷) کام کے اوقات محدود کئے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا

ع اس باب میں صرف حوالے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد عبارتیں تشریحات و اقتباسات کے زیرِ عنوان ملاحظہ فرمایئے۔ [1] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدینہ۔ البدور البازغہ مبحث الارتفاق۔ الثالث اور الخیر الکثیر۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔ [4] حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدینہ ایضاً باب الرسوم السائرہ بین الناس۔ [5] ایضاً باب ابتغاء الرزق۔ [6] ایضاً۔

Marfat.com

چاہیئے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کرسکیں اور اُن کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے[1]

(۸) تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا اس کو تعاون کے اُصول پر ہی جاری رہنا چاہیئے۔ پس جس طرح تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے "کمپی ٹیشن" سے روحِ تعاون کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لئے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے[2]

(۹) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کردے، مُلک کے لئے تباہ کن ہے[3]

(۱۰) وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے، اور اُن کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے[4]

سیاسیات اور نظامِ حکومت کے بنیادی اُصول (۱۱) زمین کا مالکِ حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ باشندگانِ مُلک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے حقِ انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو[5]

(۱۲) سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ مُلک

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم و باب ضبط المبہم۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ باب البیوع المنہی عنہا۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاق الرابع و باب البیوع المنہی عنہا۔ [4] حجۃ اللہ البالغہ باب الرسوم السائرۃ بین الناس و باب سیاست المدینہ و ایضاً باب ابتغاء الرزق و باب البیوع المنہی عنہا۔ [5] حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔

Marfat.com

ملک الناس، مالکِ قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصوّر کرے۔ نہ کسی کیلئے جائز ہے کہ وہ کسی صاحبِ اقتدار کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرے[1]

(۱۳) اسٹیٹ کے سربراہِ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متوّلی کی۔ وقف کا متوّلی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گذار سکے[2]

بنیادی حقوق حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ وغیرہ تصانیف میں ارتفاقات (مفاداتِ عامہ) کے عنوان سے بہت مفصّل بحث کی ہے ان کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱۴) روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچّوں کی تعلیم و تربیت کر سکے۔ بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۱۵) اسی طرح مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، اُن کے جان و مال کی حفاظت، اُن کی عزّت و ناموس کی حفاظت، حقِ ملکیت میں آزادی، حقوقِ شہریت میں یکسانیت ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۱۶) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

(۱۷) **بین الاقوامی تحفظات** ان حقوق کے حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہئے کہ اپنے جیسے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہو۔ اُس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔

---

[1] منصب امامت مصنفہ مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب۔ (ذکر سلطنت ضالہ)۔ [2] ازالۃ الخفا جلد دوم عہد فاروق اعظم۔

Marfat.com

۱۸ **مذہبیات** الف : دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے۔ اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ب : داعیانِ صداقت ہر ملک اور قوم میں گذرے ہیں۔ اُن سب کا احترام ضروری ہے۔

ج : سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لئے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

د : ساری مہذّب دنیا کے سماجی اُصول، اور اُن کا منشا و مقصد ایک ہے مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جُرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلّقات کے لئے مرد اور عورت میں ایک معاہدہ، ہر ایک فرقہ میں ضروری ہے البتہ معاہدہ کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ اپنے مُردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر[1]۔

۱۹ **جہاد** ایک مقدّس فرض ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مقدّس اصول کے لئے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی ان اصول کے لئے فنا کر دے[2]۔

تشریحات و اقتباسات

جو اصول اُوپر بیان کئے گئے ہیں، حاشیہ میں ان کے ماخذ کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ ان تمام کا ترجمہ پیش کرنا طوالت ہے۔ البتہ چند اقتباسات جن سے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب اصل الدین واحد۔ البدور البازغہ فصل حقائق الارتفاقات اور مقالہ ثالثہ وغیرہ

[2] البدور البازغہ، مبحث الارتفاق الثالث و حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۷۔

شاہ صاحب کے نظریات پر مجموعی طور سے روشنی پڑتی ہے، یہاں پیش کر دینے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اصل عبارتیں بخوفِ طوالت یہاں بھی نقل نہیں کی گئیں صرف ان کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

البتہ ترجمہ سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے زمانہ میں وہ مشینیں اور کلیں جن کی بناء پر اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں سرمایہ داری نے خاص شکل اختیار کی اور وہ سوالات پیدا ہوئے، جنہوں نے کمیونزم کو کامیاب بنایا، بلاشبہ نہیں تھیں۔ مگر جاگیرداری اور خاص خاص منصبوں اور وظیفوں کی اجارہ داری نے اقتصادی توازن درہم برہم کر رکھا تھا۔

بادشاہ، اُمراء اور بالادست حکّام وہ چھوٹے بڑے جاگیردار تھے جو شاہانہ زندگی اور عیش پرستانہ رنگ رلیوں کے لئے کاشتکاروں کا خون چوستے تھے اور خانقاہ نشین، پیشہ ور فقراء اور سجادہ نشین اور نام نہاد علماء نے گویا کلیسائی نظام کا چربہ ہندوستان میں اُتار رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقے محنت سے ناآشنا تھے۔ ملک کی دولت میں ان کے ذریعہ کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ بقول شاہ صاحبؒ یہ ملک کے لئے بارِ گراں تھے۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدینہ کے آخر میں آپ فرماتے ہیں:

"اس زمانہ میں بربادیٔ ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں:

(۱) خاص خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کئے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بناء پر، مثلاً اس لئے کہ وہ قاری یا عالم ہیں، یا اُن کا تعلق شعراء یا سجادہ نشینوں یا فقراء کے اس حلقے سے ہے جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں یا اسی قسم کی دریوزہ گری اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانۂ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں اور ملکی دولت کے وسیع دامن تنگ کرتے

Marfat.com

رہتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر ملک کی کوئی خدمت نہیں بلکہ رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعۂ معیشت فراہم کرنا اُن کا نصب العین ہوتا ہے ان مہذّب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے۔ اس طرح باشندگانِ ملک کی زندگی تنگ کر رہے ہیں، اور ملک کے لئے بارِ گراں بنتے رہتے ہیں۔

(۲) کاشتکاروں، سوداگروں اور دستکاروں پر بھاری ٹیکس مقرّر کئے جاتے ہیں اور اُن کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے، جس کے فرو کرنے کے لئے جبر و تشدّد سے کام لینا پڑتا ہے اور بے انتہا فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور رفاع پر بقدرِ ضرورت صرف کیا جائے۔"

ب: اقتصادی حالات کا اثر رُوحانی ترقّی پر:

ہندوستان اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ فخر کرتا رہا ہے کہ اس کی تہذیب و سیاست کبھی مذہب اور خدا پرستی سے بیگانہ نہیں ہوئی۔

ہندوستان کا بلند مرتبہ سپوت (شاہ ولی اللہ) جس کو تاریخ نے آج تک بُھلائے رکھا ہے، اس خصوصیت کا آئینہ دار ہے۔ بیشک وہ عالمِ دین اور رُوحانیت اور فلسفۂ اخلاق کا بہترین ماہر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جاننے والے اس کو "شاہ" کا لقب دیتے ہیں، جو رُوحانی بزرگوں کو از راہِ عقیدت دیا جاتا ہے۔ لیکن اس عالمِ دین اور رُوحانی پیشوا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تباہی اور بدحالی جو مذہبی نقطۂ نظر سے سوسائٹی میں پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب یہی اقتصادی بحران ہے جس نے سرزمین ہند کو پُرشور بنا رکھا ہے۔

Marfat.com

اس مذہبی رہنما کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت میں ہمیشہ یہ ہی ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدمِ توازن نے مذہب کے سربفلک قلعوں کو مسمار کیا ہے۔ اس لئے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور رُوحانی کمالات کے لئے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ انتہا یہ کہ یہ مذہبی بادشاہ (شاہ ولی اللہ رح) سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ذرائع معیشت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض (جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدمِ توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا) ایران اور روما وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

پس اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کے دل میں القاء کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے۔ جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشوونما پا رہے تھے۔ پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرما دی"۔

(ابواب ابتغاء الرزق ص۹۸ - ج ۲)

یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر موضوع کی اہمیت اس طوالت کو جائز قرار دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اٹھارہویں صدی کے مسلمان عالم کو دیکھیں گے کہ وہ بیسویں صدی کے کمیونسٹ کی زبان بول رہا ہے۔

Marfat.com

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت (یعنی ساتویں صدی عیسوی میں) ایران اور روما کی سلطنتیں عروج پر تھیں۔ مگر اقتصادی عدمِ تعاون نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب انہیں دو سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدہ کے لئے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کے وجوہات

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے لئے روشن مثال ہے، اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو، اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو۔"

دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدّن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اہلِ ثروت اور حکمران طبقہ میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سرِ سلطنت میں زیادہ جواہر ٹکے ہوئے ہیں۔

اربابِ حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلّفات نبھانے کے لئے ہر ایک صاحبِ اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشتکاروں کا خون چوسنے لگے، اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے اُنہوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب

Marfat.com

اس با اقتدار طبقہ کی تمام عملی اور فکری طاقتیں ترقیِ ملک و دولت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی، اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں، اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اُٹھانے والے گدھوں گھوڑوں کی مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زر اندوزی کے لئے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مُجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا۔ اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائشِ انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکرِ مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو گئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدمِ توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا ان میں بہت سے صاحبِ فن و اہلِ علم بھی ہوتے تھے۔ وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے مگر اُن کا مطمحِ نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار،

Marfat.com

اُن کی جدّ و جہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فنِ سپہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین جنرل یا کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدّس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنونِ لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شانِ خسروانہ یہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا امراء کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمیٔ مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب؛ درباری آداب ایک خاص فن بن گیا۔ اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدّن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مُٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور اُنکی خوشنودی کے لئے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر رُوحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جس کو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالےٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ رُوحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اُصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض

Marfat.com

کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے"۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اقتصادی حالات کا رُوحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت شاہ صاحب جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں، اُس کا نقشہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو۔ شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو۔ ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو۔ ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہو گی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور رُوحانی ترقی حاصل کر سکے۔ لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جائے، تو اُس کے ہوش و حواس گُم ہو جائیں گے۔ اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنّم بھرنے نہیں پاتا۔

(حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم)

ج: عوام کی خوش حالی کا بنیادی اصول اور اقتصادی بدحالی کے انسداد کی پہلی شرط

خوش حالی بہت اچھی چیز ہے۔ وہ انقلابات جو گذشتہ ڈیڑھ صدی میں دنیا کے سیاسی پلیٹ فارم پر رونما ہوئے، اُن کا مقصود یہ ہی ظاہر کیا گیا کہ ملک کے تمام باشندے آسودہ اور فارغ البال ہوں۔ عوام کی خوش حالی کے لئے بہت سے پروگرام بنائے گئے اور اُن کو تجربوں کی آماج گاہ میں لایا گیا۔ مگر کیا یہ مقصد پورا ہوا؟ بیشک انقلاب کے ان طوفانوں میں انسانی خون کی بے شمار ندیاں بہائی گئیں۔ مگر کیا گوہرِ مقصود کسی قوم کے ہاتھ لگا؟ اور کیا وہ فارغ البالی اور جمہور کا وہ

Marfat.com

اطمینانِ کُلی جس کے لئے یہ کھیل کھیلے گئے تھے حاصل ہوا؟ ممکن ہے کہ کمیونزم کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مگر کیا کمیونزم خود بھی اپنی اس سیرچشمی کا معترف ہے کہ وہ غیر کمیونسٹوں کے لئے بھی اطمینان اور فارغ البالی کی بخشش کر سکا؟ شاہ صاحب کے نظریات اگر سامنے رکھے جائیں تو اس ناکامی کا سبب ایک خاص نکتہ ہے جو اُنیسویں اور بیسویں صدی کی تمام انقلابی تحریکات میں نظر انداز ہوتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان انقلابات میں ملوکیت اور سرمایہ داری بیشک ختم کی گئی لیکن وہ چیزیں جو انسانی دل و دماغ میں شاہ پرستی اور سرمایہ داری کے بیج بوتی ہیں، ختم نہیں کی گئیں۔ بلکہ بسا اوقات خود انقلابی رہنماؤں کا طرزِ عمل اس تخم کی آبیاری کرتا رہا۔ فکر و عمل کے اس تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے ختم ہونے پر بھی گوہر اطمینان مفقود اور جنس اضطراب کی فراوانی روز افزوں ہے۔

مذہب کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرزِ معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کرکے غریب کے دل میں سرمایہ داری کی ہوس اور شاہ پرستی کا شوق پیدا کرتا ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زربفت و زردوز، زرق برق ریشمی لباس، وہ فیشن اور وہ تکلفات جو دولت مندوں کے دماغوں میں کبر و غرور اور تصوّرِ برتری پیدا کرتے ہیں، اور ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع کا وہ اضطراب پیدا کرتے ہیں، جو اُن کو زیادہ ستانی رشوت، چوری، خیانت، استحصال بالجبر اور عصمت فروشی وغیرہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ غرض سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلّفات سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک قانون ان کی اجازت دیتا ہے گا سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں ارتکابِ جرائم کا میلان بڑھتا رہے گا۔

شاہ صاحب ایک طبقہ کی ایسی خوش حالی کو جو ان تکلّفات سے مرصّع ہو

Marfat.com

جس سے اقتصادی توازن بگڑ جائے رفاہیتِ بالغہ سے تعبیر کرتے ہیں اور سوسائٹی کے لئے اس کو بدترین جُرم اور اس کے خلاف جنگ کو مقدّس جہاد قرار دیتے ہیں ان کی تصانیف رفاہیتِ بالغہ کی مذمّت سے بھری ہوئی ہیں۔

جہاد تحریک شاہ ولی اللہ کے عملی پروگرام میں "جہاد" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور گذشتہ صدی میں یورپ کے اربابِ صحافت اور مصنّفین لفظ جہاد کو اس قدر بدنام کر چکے ہیں کہ ایک سنجیدہ دماغ بھی اس لفظ سے اُس کے اسلامی تصوّر تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تشریحات کے ضمن میں جہاد کے متعلق بھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کی وضاحت کر دی جائے۔

لفظی معنے لغت کے لحاظ سے جہاد کے معنی ہیں زیادہ سے زیادہ درجہ کی کوشش۔

یہ کوشش اگر ذاتی اغراض سے علیحدہ ہو کر صرف حق کی فتح اور صداقت کی سربلندی کے لئے ہو تو اس کے مبارک اور مسعود ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم، ذاتی اغراض تو درکنار، قومی یا نسلی اغراض کا گرد و غبار بھی دامنِ جہاد پر برداشت نہیں کرتا۔ قرآن حکیم کی رو سے ہمہ گیر حق و صداقت، انسانی شرف و عظمت اور اعلیٰ اخلاق کے نام پر جو جدّ و جہد ہو، وہ اُسی وقت جہاد قرار دی جا سکتی ہے جب کہ نہ قومی یا نسلی اقتدار کا تصوّر سامنے ہو اور نہ فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل کسی فتنہ و فساد کی تخم ریزی کر سکے[1]

وہ اپنی ذاتی اغراض اور اپنے نفس کی خواہش سے یہاں تک دست بردار ہو چکا ہو کہ بہادری کی نمائش، اپنے قبیلہ یا خاندان کی عزّت و شہرت، سیاسی دنیا

---

[1] تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوًا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین ○ وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ اُن کو جو نہیں چاہتے چڑھنا ملک میں اور نہ بگاڑ ڈالنا اور آخر بھلا ہے تقویٰ والوں کا (حضرت شاہ عبدالقادر)

Marfat.com

میں نام آوری یا صفحاتِ تاریخ میں تذکرہ کا تصوّر بھی اس کے دماغ کو منتشر نہ کر سکے[له]

اس جدّوجہد (جہاد) کے وقت ایک فریق کو شکست دے کر ختم کر دینے کا جذبہ یقیناً کارفرما ہوگا مگر یہ جذبہ ہر قسم کی خودغرضی اور تنگ نظری سے بالکل پاک ہوگا، اور اس وقت ہوگا جب کہ اصلاح کی تمام کوششیں ختم ہو چکی ہوں اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کے لئے اس آپریشن کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا ہو۔ اس بنا پر اس جذبہ کو پاک جذبہ اور اس عداوت کو مقدّس عداوت کہا جائے گا۔

اصطلاحی معنےٰ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جن مختصر اور جامع الفاظ میں "جہاد" کی تعریف کر رہے ہیں وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

الجهاد شرواق العداوة القدسية فى صورة القتل والاسر۔
(الخیر الکثیر ص۱۰۱)

ایک مقدّس عداوت (جو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات سے بالکل پاک صرف عمومی مفاد اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد اور بلند تر مصالح کیلئے ہو) قتل کرنے یا قید کر لینے کی صورت میں اس پاک عداوت کا پُرشوکت ظہور "جہاد" ہے۔

له سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الرجل يقاتل شجاعة و يقاتل حمية فاى ذلك فى سبيل الله۔ فقال من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا۔
(حدیث شریف)
(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۵۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، کہ ایک شخص بہادری کی نمائش کے لئے جہاد میں شریک ہوتا ہے، کوئی شخص نسلی یا قبائلی حمیت و غیرت کی بنا پر جنگ کرتا ہے تو کیا اس کو فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ فرمایا فی سبیل اللہ اور راہِ خدا میں اُس شخص کا جہاد مانا جائے گا جو اس لئے قربانی پیش کر رہا ہے کہ اللہ کا بول بالا اور حق و صداقت کی بات اونچی ہو۔

Marfat.com

عداوت اور دشمنی کے ساتھ پاک کا لفظ بہت ہی اجنبی ہے مگر جہاد کیلئے یہی اجنبی صفت لازمی شرط ہے، کیونکہ اپنی جان دینے یا دوسرے کی جان لینے کے لئے کسی بھی ذاتی غرض یا کسی بھی نفسانی خواہش کی شمہ بھر پلیدی کی آمیزش ہو گی تو یہ جہاد نہیں بلکہ جہالت، وحشت اور ظلم ہو گا۔ (معاذاللہ)

شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جہاد کے وقت ایک حق پرست اپنے آپ کچھ نہیں ہو گا۔ وہ جو کچھ ہو گا، مقاصدِ حق کا آلۂ کار ہو گا۔ حق و صداقت کا جو تقاضا ہو وہ اُس کی عین تمنّا اور آخری آرزو ہو گی اور اسی کی تکمیل کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہو گا۔[1]

شاہ صاحبؒ کا عقیدہ ہے کہ خود غرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن و امان، باشندگانِ ملک کے اطمینان، آزاد کاروبار، خوش حالی، آزادیٔ رائے وغیرہ حقوقِ انسانیت اور حقوقِ شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو چیرہ دست، ظالم و جابر طاقت کا ختم کر دینا حق و صداقت کا تقاضا اور عدل و انصاف کا مطالبہ[2] ہو گا۔ کیونکہ یہ چیرہ دست، ظالم و جابر طاقت، سارے انسانوں (نوعِ انسان) کے لئے، بالخصوص اس ملک کے نظام کے لئے جو ایک جسم کی حیثیت رکھتا ہے، سرطان جیسا مرض ہے۔ ہر ایک ہمدردِ انسانیت کا فیصلہ یہی ہو گا کہ اُس کا آپریشن کر دیا جائے۔ ورنہ سارا ملک موت کے گھاٹ اُتر جائے گا۔[3] لہٰذا ایک حق پرست کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہو گا کہ اس سرطان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کیلئے جان کی بازی لگا دے۔

---

[1] نفث هذه الداعية في القلب لا يكون الا بالتشبه بالملئكة الخ (ص۱۵۶ ج۲، حجة الله البالغه)۔ [2] والحاجة الثالثة ان اجتماع الناس لا يخلو عن التحاقد والتحاسد والشحناء الخ (البدور البازغه ص۱۱۱ مبحث الارتفاق الثالث)۔ [3] فالمدن الفاسدة التي تغلب عليها نفوس سبعية ويكون بهم تمنع شديد انما هو بمنزلة الآكلة في بدن الانسان لا يصلح الانسان الا بقطعه الخ (ص۱۵۷ ج۲ حجة الله البالغه)

Marfat.com

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اسلام کی تعلیم اور شاہ صاحب کے عقیدہ کے مطابق جہاد کا مقدس فرض پورے تقدس کے ساتھ وہی پارٹی انجام دے سکتی ہے جس کی تربیت خاص مقاصد کے لئے خاص طور پر کی گئی ہو۔ جس کا ہر ایک فرد اپنے ذاتی اغراض ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہو۔[1]

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ جہاد کی اصل قوت ضبطِ نفس، صبر و استقامت، ذوقِ فنا اور وہ جذبہ ہے جو مصیبت کو راحت اور موت کو جامِ نوش گوار بنا دے۔

مہاتما گاندھی نے تحریکِ آزادیٔ اہنسا اور ستیہ گرہ کے اُصول پر چلائی۔ ستیہ گرہ، اہنسا اور جہاد کے الفاظ میں بہت فرق ہے مگر ایک سپرٹ سب جگہ کار فرما ہے یعنی نصب العین کے لئے قربان ہو جانے کا جذبہ۔

زیادہ تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ فیصلہ ہو گا کہ اہنسا جہاد کی ایک شکل ہے جو خاص خاص حالت میں اختیار کرنی پڑتی ہے[2]۔

آزادیٔ وطن میں مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ اور اہنسا کو بہت دخل ہے یہاں تک کہ انقلاب ۱۹۴۷ء کو اسی تحریک کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ بتانا

---

[1] لا يقدم اليه الا من اخلص دينه لله - و آثر الآخرة على الدنيا - و صح اعتماده على الله (ص ۱۵۷ حجة الله البالغه ج ۲) - [2] مثلاً مکی زندگی کا پروگرام یہی تھا۔ كفوا ايديكم و اقيموا الصلوٰة۔ اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو یعنی مخالفوں کی تمام ایذا رسانیوں کا جواب ضبط و تحمل سے دیتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرو اور نصب العین کو پختہ کرو۔

58864

Marfat.com

مشکل ہے کہ گاندھی جی کی قیادت کے تیس[1] سالہ دور میں کتنے نوجوان اہنسا کے اصول پر پوری طرح تربیت پا سکے۔ حالانکہ نشر و اشاعت کے تمام ترقی یافتہ ذرائع مہاتما گاندھی کو حاصل تھے۔ بین الاقوامی حالات بھی بڑی حد تک مددگار تھے اور عوام میں جذبۂ آزادی بھی بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔

ہمارا منشا یہ ہے کہ ہمیں تعجب نہ ہونا چاہیئے اگر ہم شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد تقریباً پچاس برس تک کوئی ایسی فوج نہ دیکھ سکیں جو شاہ ولی اللہ کے اصول پر تربیت یافتہ ہو، جبکہ اُس زمانہ میں دوسروں کو مؤثر کرنے کے وہ تمام ذرائع مفقود تھے جو بیسویں صدی میں رائج ہوئے۔

تحریک کا نصب العین

انقلاب، ہمہ گیر انقلاب، سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب

جبکہ عقائد و جذبات یہ ہوں جس کا خلاصہ پہلے صفحات میں پیش کیا گیا تو یہ تصوّر سراسر ظلم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے ساتھی سلطنتِ مغلیہ کے اُس ڈھانچہ کو سنبھالنا چاہتے تھے جو دن بدن بے جان ہو رہا تھا۔

اصول مذکورہ بالا کی شہادت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور اُنکے ساتھی سلطنتِ مغلیہ کے بوسیدہ تخت پر پالش کی کوشش تو کیا کرتے۔ وہ سرے سے اس ملوکانہ نظام ہی کو دامنِ اسلام پر بدنما داغ سمجھتے تھے جس کا دھوڈالنا (شاہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی رائے میں) ملک و ملّت کی سب سے بڑی خدمت تھی۔

گذشتہ ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے روما اور ایران کی جابرانہ شاہنشاہیوں اور اُن کے ملوکانہ نظام کی وجہ سے عوام کی اقتصادی

---

[1] کیونکہ گاندھی جی نے اہنسا کی تحریک ۱۹۱۷ء میں شروع کی تھی۔

Marfat.com

بدحالی کی مثال میں اپنے زمانہ کے نظامِ حکومت کو پیش کیا تھا اور ایسے نظام کو ختم کر دینا انبیاء علیہم السّلام خصوصاً محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا تھا۔ یہاں آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کا ایک اور مختصر اقتباس اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

فالمدن الفاسدة التی یغلب علیها نفوس سبعیّة و یکون لهم تمنع شدید۔ انما هو بمنزلة الاکلة فی بدن الانسان لا یصح الانسان الّا بقطعه والذی یتوجّه الی اصلاح مزاجه واقامة طبیعته لا بد له من القطع۔ والشرُّ القلیل اذا کان مفضیًا الی الخیر الکثیر واجب فعله۔	تباہ حال شہر جن پر درندہ صفت انسانوں کا تسلّط ہو، اور ان کو اپنی حفاظت اور دفاع کی پوری طاقت حاصل ہو۔ یہ (ظالم و جابر پارٹی) جسدِ انسانیت کے لئے سرطان ہے کہ انسان اس وقت تک تندرست نہیں ہو سکتا جب تک اس سرطان کو کاٹ کر نہ پھینک دیا جائے۔ جو ڈاکٹر بھی اس انسان کے مزاج کو درست کرنے اور اس کی صحت بحال کرنے کی طرف توجّہ کرے گا، اس کے لئے ضروری ہو گا کہ پہلے اس سرطان کا پورا آپریشن کر ڈالے تھوڑی سی برائی کو عمل میں لانا جبکہ اس کا نتیجہ خیر کثیر (اور بہت بڑی
(ص۱۵۷ ج۲ باب الجہاد حجۃ اللہ البالغہ)	بھلائی) ہو واجب اور ضروری ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کے مشہور رہنما حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید نے شاہ ولی اللہ صاحب کے اس اصول کی شرح اور تفسیر میں پوری ایک کتاب لکھ دی ہے۔ جس میں "امامت" یعنی سیاسی قیادت (پولیٹیکل لیڈرشپ)

58864

Marfat.com

کی قسمیں اور اسلامی اصول کے مطابق اُن کے احکام بیان کئے ہیں اور اس کی وضاحت کی ہے کہ کس قیادت کے ساتھ عام مسلمانوں کو کیا سلوک اور کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔[1]

بدترین قیادت کی دو علامتیں بیان کی ہیں جو اُس زمانہ میں سلطنتِ مغلیہ کے ذمہ داروں میں پائی جاتی تھیں۔ پھر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے:

پس دریں صورت برا فراختن	پس ایسی صورت میں علمِ بغاوت بلند
اعلام قتل و قتال و بر انداختن	کرنا اور اس گمراہ کو جو مذہب کے نام
آن مبتدع ضال۔ درحق ملت	پر من مانی کر رہا ہے معزول اور برخاست
و اہلِ ملت منفعتے خواہد بخشید و الا	کر دینا ملت کیلئے بھی مفید ہوگا اور اہلِ
بعوام و خواص بے شک مضرتے	ملت کیلئے بھی۔ ورنہ ملک کے تمام ہی عوام و

[1] یہ انکشاف کس درجہ حیرت انگیز ہوگا کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ سلطنتِ مغلیہ کے اولوالعزم فرماں رواؤں کی حکومت کو بھی "سلطنتِ ضالہ" اور گمراہ قیادت قرار دیتے ہیں اور علماء کرام اور پاکباز مسلمانوں کے متعلق فرماتے ہیں۔ "ازیں دور دور میگریزند و ازیں قرب و جوار می پرہیزند و از مجالس سلاطین دست بردار می شوند و از مصاحبت ایشاں بیزار۔ یعنی اکابرِ ملت اور بزرگانِ اُمت ان سے دُور بھاگتے ہیں اور اُن کے پڑوس سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ان بادشاہوں کی ہمنشینی سے دست بردار اور ان کی مصاحبت سے بیزار رہتے ہیں (چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کو سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے علماء کے اُس بورڈ میں شرکت کی دعوت دی جو اسلامی لاء (فتاویٰ) مرتب کرنے کے لئے عالمگیر نے بنایا تھا۔ مگر شاہ عبدالرحیم صاحب نے بورڈ کی رکنیت منظور نہیں فرمائی۔ یہ قانون مرتب ہوا جو فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیری کے نام سے آج بھی موجود ہے اور اُس کے مطابق فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں مگر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بورڈ میں شریک نہیں ہوئے لیکن کبھی کبھی بورڈ کے اراکین کی رہنمائی کرتے رہے) البتہ ایسے فرمانروا جبتک رعایا پروری اور انصاف سے کام لیتے رہیں تو اسوقت تک حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا درست نہیں سمجھتے (منصبِ امامت از ص۹۱ تا ص۹۴)

خواہد رسید۔ خواص کو بہت بڑا نقصان اُٹھانا پڑیگا۔

(منصبِ امامت ص۹۶ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی)

تقریباً ایک صفحہ کے بعد فرماتے ہیں:

جہاد بر ایشاں از ارکانِ اسلام است و اہانتِ ایشاں اعانتِ سید الانام۔	اُن کے مقابلہ میں جہاد کرنا اسلام کا رکن اور فرض ہے اور اُن کو ذلیل اور کمزور کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و اعانت ہے۔

(منصب امامت ص۹۷)

اس کے بعد صفحہ ۹۸ پر اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کئے ہیں بہرحال یہ خیال کہ سلطنتِ مغلیہ کی گری ہوئی دیوار کو سنبھالنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک کا مقصد تھا۔ نہ صرف حضرت شاہ صاحب بلکہ وطنِ عزیز کی شاندار تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے[1]۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اصلاحی اور سیاسی جدّ و جہد کے آغاز ہی میں جب حجاز تشریف لے گئے تو شب جمعہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۳۱ء کو مکہ معظمہ میں آپ نے ضمیر کی یہ آواز سُنی کہ ملک و ملّت کی فلاح صرف اسی صورت میں ہے کہ دورِ حاضر کے تمام نظاموں کی دھجیاں بکھیر دی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب[2] برپا کیا جائے۔ جب آپ اس مقدس سفر سے

---

[1] اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ وطنِ عزیز کا کوئی قابلِ فخر سپوت کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر نظر انداز ہو جائے۔ [2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ حال ہی میں مولانا خلیق احمد صاحب نظامی استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجیب الدولہ کو آپ کی سرپرستی حاصل تھی اور اگرچہ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو نظام الملک آصف جاہ اور حافظ رحمت خاں اور نجیب الدولہ روہیلہ سرداروں نے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی تاکہ اپنے سیاسی حریف شیعہ نوابوں ور مرہٹوں وغیرہ کے مقابلہ میں ان کو قوت حاصل ہو اور سلطنتِ دہلی کی (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

واپس ہوئے تو آپ کا نصب العین یہی تھا۔[1]

فک کلّ نظام

یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب۔

پروگرام | ممکن تھا کہ اُس زمانہ کے جنگ جُو سرداروں کی طرح آپ بھی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور فوج بھرتی کر کے کسی شہر پر قبضہ کر لیتے، یا کسی جنگ جُو حکمران کے ساتھ ہو کر اس کی فوج کو تقویت دے دیتے۔ مگر اس طرح وہ "ہمہ گیر انقلاب" جو پارٹی کا نصب العین تھا، پورا نہ ہوتا۔ بلکہ آپ بھی کسی حکمران کا ضمیمہ بن جاتے نصب العین کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی تھی جب رائے عامہ آپ کے اصلاحی نظریات کو اپنا لیتی، اُس کے لئے جنگ و جہاد سے پہلے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پارٹی کا پہلا پروگرام یہی قرار دیا گیا، اور اُس کے لئے ملک میں چند مرکز قائم کئے گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وزارتِ عظمیٰ اُن کے پلے پڑ جائے۔ مگر خطوط کے اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابدالی کو ایک خط حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا تھا اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو ابدالی سے امداد طلب کرنے کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس دَور کی افراتفری اور رات دن کی اُن آفتوں کا جو مرہٹوں جاٹوں میواتیوں اور کبھی کسی اور گروپ کی طرف سے دہلی پر آتی رہتی تھیں وقتی تدارک ہو جائے کیونکہ "فك كل نظام" یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب جس کا نصب العین ہو، وہ بادشاہوں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لئے ایسی فتح و شکست سلسلہ کی کڑی تو بن سکتی ہے، سفرِ انقلاب کی آخری منزل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ وقتی ہنگامے یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے اور شاہ صاحب کی تحریک کا انقلابی قافلہ برابر چلتا رہا۔ جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے (انشاء اللہ)۔

(صفحہ ہذا) [1] ملاحظہ ہو فیوض الحرمین اور شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۶۔

Marfat.com

جماعت (پارٹی) اور اُس کے زعماء

نمایاں ارکان تاریخ کی بہت بڑی کوتاہی ہے کہ اس پارٹی کے تمام ارکان کی فہرست محفوظ نہیں رکھ سکی۔ البتہ آپ کی تصانیف نے چند ساتھیوں کے نام بتائے ہیں، جن کی تحریک و تاکید اور جن کے مشورہ پر یہ کتابیں تصنیف کی گئیں اُن کا مختصر تعارف یہ ہے:

(۱) **مولانا محمد عاشق صاحب:** یہ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر کے رہنے والے شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ابتدا سے شاہ صاحب کے شریک اور ساتھی رہے۔ سفرِ حجاز میں بھی آپ کے ساتھ تھے جہاں "مکمّل اور ہمہ گیر انقلاب" کا نصب العین طے ہوا تھا۔ خود شاہ صاحب کا اعتراف ہے کہ:

> "یہ میرے راز داں ہیں۔ میری تصانیف کی لائبریری ہیں۔ ان ہی کے اصرار پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ میرے بعد میرے اصول کی اشاعت ہوگی[1]"

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے بعد اُن کے حلقہ کے ارکان بالخصوص شاہ صاحب کے فرزند جانشین (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) کی تربیت آپ ہی نے کی۔

(۲) **مولانا نور اللہ صاحب:** ساکن بڈھانہ (ضلع میرٹھ) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ آپ ہی کی فرمائش پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور تصنیف "تفہیماتِ الٰہیہ" مرتب ہوئی۔

مولانا نُور اللہ صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے اُستاذ بھی ہیں اور خُسر بھی ہیں۔ مولانا نُور اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا ہبۃ اللہ اور

---

[1] تفہیماتِ الٰہیہ ص۱۲۵ ج ۱۔

Marfat.com

پوتے مولانا عبدالحی صاحب ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب نے تحریک میں نمایاں اور غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آپ کی وفات شمالی مغربی سرحد کے علاقہ میں ہوئی۔ جب آپ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے ساتھ میدانِ جہاد میں تھے۔ (تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ)

(۳) **مولانا محمد امین صاحب کشمیری** : شاہ صاحب کے مخلص رفیق ہیں۔ شاہ صاحب کے بعد شاہ صاحب کے حلقہ (پارٹی) کی تربیت میں مشغول رہے۔

(۴) **حضرت شاہ ابوسعید صاحب** : ساکن رائے بریلی۔ آپ رائے بریلی کے مشہور بزرگ شاہ علم اللہ صاحب کے پوتے تھے۔ آپ ہی کے نواسے حضرت سید احمد صاحب شہید تھے، جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کی۔ پھر شمالی مغربی سرحد میں علمِ جہاد بلند کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ سلطان ٹیپو کا خاندان آپ سے اور آپ کے صاحبزادے شاہ ابو اللیث سے بیعت تھا۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ)

(۵) **حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب** : شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادے، جن کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔

(۶) **مولانا مخدوم صاحب لکھنوی** : شاہ صاحب کے مخصوص شاگرد۔

پارٹی کے مرکز (۱) علمی اور عملی تربیت کا سب سے بڑا مرکز دہلی[1] تھا۔ جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد آپ کے فرزند جانشین (مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) نے زندہ رکھا، اور اُس کو چار چاند لگائے۔ اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

---

[1] مولانا عبیداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ کی دہلی ایسا مرکز تھی جس میں اقوامِ عالم کے سب نمونے ملتے ہیں۔ دہلی میں یہ استعداد ہے کہ اس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہندوستان پھر دنیا میں پھیل سکے (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۴۲۔ نیز ملاحظہ ہو آثار الصنادید)۔

Marfat.com

(۲) دوسرا مرکز رائے بریلی کا وہ مشہور دائرہ تھا جو "تکیہ شاہ علم اللہ"[1] کے نام سے مشہور تھا۔ جو اودھ کے علاقہ میں تقریباً نصف صدی پہلے سے تعلیم و تربیت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ یہی مرکز ہے جس سے سلطان ٹیپو کا روحانی تعلق تھا۔

انگریزی اقتدار کے خلاف جب دہلی کے مرکز سے جہادِ حریت کا فتویٰ صادر ہوا تو رائے بریلی کے اسی مرکز سے انقلاب کی وہ مشہور تحریک[2] اٹھی، جس کو "وہابی تحریک" کے نام سے بدنام کیا گیا۔

اس مرکز میں کام کرنے والے نسبی لحاظ سے حضرت شاہ علم اللہ صاحب سے وابستہ تھے۔ لیکن علمی اور عملی لحاظ سے وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تربیت گاہ سے فیض پائے ہوئے تھے۔

حضرت شاہ محمد واضح، حضرت شاہ ابوسعید، حضرت سیّد محمد معین اور حضرت سیّد محمد نعمان نے (جو حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے پوتے اور پرپوتے تھے) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا سیّد قطب الہدیٰ، مولانا سیّد محمد اسحاق اور حضرت

---

[1] شاہ علم اللہ صاحب (المتوفی ۱۰۹۶ھ، تقریباً ۱۶۸۵ء) نے اس مکان کی بنیاد رکھی، جو تکیہ شاہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر دین کی محبت کے ساتھ حبِ وطن کا یہ سنگم ملاحظہ ہو کہ مکہ معظمہ سے واپس ہوتے ہوئے خانۂ کعبہ کا نقشہ اور اس کی صحیح پیمائش ساتھ لیتے آئے ۱۰۸۴ھ، ۱۶۸۵ء میں اس نقشہ اور پیمائش کے مطابق اپنے وطنِ عزیز میں سئی ندی کے کنارے ایک مسجد تعمیر کی۔ جس کی بنیادوں میں آبِ زمزم ڈالا۔ اس خانۂ خدا کی تعمیر میں بھی سُنّتِ ابراہیمی پر عمل کیا یعنی خود اپنے ہاتھ سے یہ مسجد تعمیر کی۔ آپ کی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح اپنے باپ کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ (سیرت سیّد احمد شہید ص) [2] اس تحریک کے پہلے علمبردار حضرت سیّد احمد صاحب شہید تھے۔ اُن کی شہادت کے بعد تحریک کا مرکز صادق پور پٹنہ ہوا، اور جب اس کو تباہ کر دیا گیا تو باقی ماندہ مجاہدین نے آزاد قبائل میں اپنا محاذ قائم کیا جس کا باقیماندہ سلسلہ انگریزوں کی روانگی یعنی انقلاب ۱۹۴۷ء تک انگریزی اقتدار کے لئے دردِ سر بنا رہا۔

Marfat.com

سید احمد صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کیا۔[1]

ان کے علاوہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے دو مرکزوں کا اور پتہ دیا ہے۔ مدرسہ نجیب آباد[2]، اور مدرسہ ملا محمد معین، ٹھٹھ سندھ۔ ہم ایک اور مرکز کا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ اودھ کا دارالحکومت لکھنؤ تھا جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردِ رشید مولانا مخدوم لکھنوی[3] نے تقریباً نصف صدی تک چشمۂ فیض جاری رکھا۔

پھر مرزا حسن علی صغیر محدث اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی جیسے فاضل نوجوان نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقۂ درس سے فیض یاب ہو کر لکھنؤ میں عرصہ تک اس شمع کو روشن رکھا۔[4]

---

[1] سیرۃ سید احمد شہید طبع ثالث۔ [2] یہاں نواب نجیب الدولہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص طریقہ کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ نواب نجیب الدولہ سلطنتِ مغلیہ کے اس آخری دور میں وہ بیدار مغز جرنیل تھا جس نے سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے رکھا اور اپنی وفات کے وقت سنہ ۱۷۶۹ء تک انگریزی اقتدار کے سیلاب کو دہلی کی طرف نہیں بڑھنے دیا۔ [3] مولانا مخدوم لکھنوی ابنِ حافظ محمد نواز بن مولوی عبدالسمیع بن سید محی الدین مشہدی۔ آپ کے دادا سید محی الدین مشہدی، اول مشہد سے آکر دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ پھر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ مولانا مخدوم صاحب نے درسی کتابیں مُلّا نظام الدین صاحب خلف مولانا قطب الدین صاحب سہالوی سے پڑھی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب بحر العلوم کے ساتھی اور ہم جماعت تھے۔ درسِ نظامی سے فراغت کے بعد آپ دہلی حاضر ہوئے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے استفادہ کیا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر تمام عمر تعلیم و تربیت میں صرف کر دی۔ آخر عمر میں منطق و فلسفہ کے اسباق بند کر دیئے، صرف حدیث شریف اور کتبِ دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے تاریخ لکھی۔

سید مخدوم از جہاں رفت — گفتند بزرگ و خرد صد حیف
تاریخِ وفات گفت ناسخ — مخدومِ زمانہ مُرد صد حیف
۱۲۲۹ھ

(تذکرہ علماء ہند ص ۲۲۳ مطبوعہ نولکشور)

[4] آپ کا تذکرہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب کے سلسلہ میں آگے آئے گا۔ (ان شاء اللہ)

Marfat.com

مُشکلاتِ راہ

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فلک کل نظام یعنی مکمّل اور ہمہ گیر انقلاب کا نصب العین ایک چراغ تھا جو شاہنشاہیّت، شاہ پرستی اور اجارہ داری کی طوفان انگیز آندھیوں میں روشن کیا گیا تھا۔

مغل شاہنشاہ کی فوجی طاقت، اگرچہ کمزور ہوگئی تھی مگر دو سو سالہ مغل شاہنشاہیت کی عظیم الشان تاریخ نے مغل بادشاہ کی تعظیم و تکریم کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ فتنہ پرور گستاخ طاقتیں جو مغل بادشاہ کو قتل کر دیتی تھیں، مجبور تھیں کہ اکبر اور عالمگیر کی اولاد ہی میں سے کسی کو معزول یا مقتول بادشاہ کا جانشین بنائیں۔

مغل بادشاہ ہی کو ملک کا حقیقی مالک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ صوبوں کے گورنر باوجودیکہ خودسر اور خود مختار ہوگئے تھے، مگر اپنی حکومت کے جواز کیلئے بادشاہ کی سند ضروری سمجھتے تھے۔ بُرہان الملک نواب سعادت علی خاں نے مغل بادشاہ کی وزارت کا لیبل لگا کر اودھ میں اپنی بادشاہت قائم کی، اور نظام الملک آصف جاہ نے امیر الامرائی کا موٹو لے کر دکن میں اپنے استقلال کا جھنڈا لہرایا۔ اور مرہٹوں کی بغاوت کا بھی بڑا منشا یہی تھا کہ کوئی ایسا ہی طغرہ ان کے ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ جب باجی راؤ پیشواز اور مادھوجی سندھیا کو امیر الامرائی کا منصب مل گیا تو سسکتی ہوئی مغل شاہنشاہیّت بھی اُن کے نزدیک تعظیم و تکریم اور حفاظت کی مستحق ہوگی۔

انتہا یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے تسلط کے جواز کے لئے سندِ دیوانی ضروری سمجھی، اور دہلی فتح کرنے کے بعد بھی نصف صدی سے زائد تک تختِ دہلی پر مغل بادشاہ کا گڈا بٹھائے رکھا۔

Marfat.com

علاوہ ازیں مکمّل اور ہمہ گیر انقلاب کا نعرہ صرف بادشاہ اور شاہ پرستوں کے لئے پیغامِ فنا نہیں تھا۔ بلکہ اُن تمام طاقتوں کیلئے بھی پیغام موت تھا، جو سلطنت مغلیہ کا جانشین بننا چاہتی تھیں، یا پیشہ ور سپاہیوں کی مدد سے ملک کے چپہ چپہ پر جاگیر دارانہ نظام کا جھنڈا گاڑے ہوئے تھیں۔

بادشاہ، نوابوں اور اُمراء کے علاوہ حضرت شاہ صاحب نے علما مشائخ اور شعراء پر بھی سخت تنقید کی تھی۔ آپ کے تنقیدی مضامین "تفہیمات الٰہیہ" میں آج بھی چھپے ہوئے موجود ہیں۔ ہر ایک مضمون تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے۔ پبلک انہیں علماء، مشائخ یا شعراء کی حلقہ بگوش تھی۔ لہٰذا عوام اور برسر اقتدار طبقے سب ہی اس نصب العین کے مخالف تھے۔ ان شدید مخالفتوں کی آندھیوں میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ہمہ گیر انقلاب کا چراغ روشن کیا۔

نشر و اشاعت کی مشکلات

پریس کی طاقت سے محرومی

مارکس، اینگلس اور لینن کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کو پریس کی طاقت میسّر آگئی، اور انہوں نے تھوڑے عرصہ میں لاکھوں کروڑوں انسانوں تک اپنے خیالات پہنچا دیئے۔ مگر شاہ صاحب کا انقلابی فکر، اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی اور سحر آفریں قوّتِ تحریر کے باوجود پریس کی طاقت سے محروم تھا۔ انشا اور صحافت کی جس طاقت سے آپ پریس کے ذریعہ پُورے ہندوستان کو متأثر کر سکتے تھے وُہ صرف اُن قلمی کتابوں میں محدود ہو کر رہ گئی جن کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہو سکی۔ اس وقت نشر و اشاعت کا ذریعہ تقریریں تھیں یا تعلیم و تربیت کے وہ حلقے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا۔

انقلابی منشور (مینی فسٹو) طوائف الملوکی اور رات دن کے قیامت خیز

ہنگامے، جن میں مرہٹوں کا دہلی پر یلغار[1]، نادر شاہ کا قتلِ عام[2]، دہلی کی بے پناہ لُوٹ[3]، احمد شاہ ابدالی کی جنگِ پانی پت[4] بھی شامل ہے۔ ان ہلاکت بار طوفانوں نے اس کا موقع نہ دیا کہ حضرت شاہ صاحب انقلابی منشور (مینی فسٹو) کو یک جا مدون اور مرتب کر سکیں۔

آپ نے انقلابی نظریات کو کبھی ترجمہ قرآن شریف کے رنگ میں پیش کیا۔ کبھی تصوّف اور اسلامی فلسفہ[5] کے دامن میں چھپایا۔ کہیں نصیحت[6] و موعظت کے پیرایہ میں ادا کیا، اور کہیں اس کو تاریخ اسلام[7] اور خصائلِ صحابہؓ کا جامہ پہنایا۔

شاہ پرستوں کا عتاب اس احتیاط کے باوجود آپ اور آپ کے جانشین قاتلانہ حملوں اور وحشیانہ سزاؤں سے نجات نہ پا سکے۔ چنانچہ جب آپ نے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ مرتب کیا جو اصلاحی انقلاب کی طرف پہلا قدم تھا تو آپ پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا۔ جس سے آپ معجزانہ طور پر محفوظ رہ سکے[8]۔

غیر مسلموں کا اشتراک مذکورہ بالا اصول میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہیں تھی اور بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ہندو نوجوانوں میں بھگوت گیتا کی تعلیم سے انہیں اصول کے مطابق انقلابی سپرٹ پیدا کی جا سکتی تھی۔ مگر اُس زمانہ کی سیاست کے لحاظ سے انقلاب کا مختصر راستہ یہی تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں جو حضرت شاہ صاحب سے زیادہ قریب تھے، صحیح احساس اور قوتِ عمل پیدا کر دی جائے۔ کیونکہ :

---

[1] ۱۱۴۹ھ، ۱۷۳۶ء۔ [2] ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ فروری ۱۷۳۹ء۔ چند گھنٹوں میں یعنی صبح سے دوپہر تک شہر دہلی مردہ لاشوں سے پٹ گیا۔ مقتولین کی تعداد آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک بیان کی گئی ہے۔ [3] اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ستر کروڑ کی دولت لُوٹی گئی۔ شاہی محل کے زیورات جواہر اور تختِ طاؤس وغیرہ کی قیمتوں کا اندازہ مشکل ہے۔ [4] ۱۱۷۴ھ، ۱۷۶۱ء۔ [5] مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، فیوض الحرمین وغیرہ۔ [6] مثلاً تفہیمات الٰہیہ۔ [7] مثلاً ازالۃ الخفاء۔ [8] ملاحظہ ہو حیاتِ ولی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم وغیرہ۔

Marfat.com

الف: پورے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے زیادہ حصہ میں برسرِ اقتدار طبقہ مسلمان - یہ فنِ سپہ گری کے ماہر اور فوجی قوّت کے مالک تھے۔

ب: شمالی ہند اور وسطِ ہند کی راجپوت ریاستیں مسلمانوں کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کئے ہوئے تھیں - اُن کے راجہ سلطنتِ مغلیہ کے منصب دار اور دربار کے ایرانی یا تورانی گروپ میں شامل تھے - چنانچہ اس نازک دَور میں اس علاقہ کی کسی ایک ہندو ریاست نے بھی سلطنتِ مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گُل کرنے کی کوشش نہیں کی - اس دَور کی مرہٹی طاقتوں کے متعلق بھی یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ مغل بادشاہ کو ختم کرنے کے درپے تھیں - یا مغل دربار میں اپنا اقتدار تسلیم کرانا چاہتی تھیں - پھر ۱۸۵۷ء میں تو مرہٹوں کی باقی ماندہ طاقت نے یہ تسلیم کر ہی لیا کہ انقلاب کا راستہ صرف یہی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے کسی وارث کو وارثِ تخت و تاج تسلیم کر لیا جائے اور اس گدی کو دوبارہ آباد کیا جائے لہٰذا اخلاق اور مذہب دونوں کا تقاضا تھا کہ انقلاب کے لئے سب سے پہلے اس کی تربیت کی جائے جس کے اقتدارِ اعلیٰ پر سارا ملک اعتماد کئے ہوئے تھا۔ اور جس کی گردن پر تمام وفاداروں کی ترقی اور فلاح و بہبود کی ذمّہ داری کا بوجھ لدا ہوا تھا۔

ج: ایشیا میں بین الاقوامی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا - لہٰذا مسلم نوجوانوں کی[1]

---

[1] کچھ عرصہ کے بعد جب ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی پارٹی کا نوجوان رہنما سید احمد شہیدؒ نواب امیر خاں کے ساتھ مرہٹی راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ انگریز کے مقابلہ میں صف آراء ہے تفصیل آگے آئیگی انشاء اللہ اور اس کے بعد اسی سلسلہ کے فیض یافتہ اور جانشین ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کے ساتھ انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں پھر جب بیسویں صدی کے آغاز میں انڈین نیشنل کانگریس نے آزادی کی تحریک شروع کی تو اسی سلسلہ کے ہزاروں علماء جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، کانگریس کے مشترک پلیٹ فارم پر ہندوؤں کے دوش بدوش آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

Marfat.com

اصلاح پورے ایشیا کی اصلاح ہوسکتی تھی جو یورپ کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روک سکتی تھی۔

بہرحال یہی وجوہات ہیں کہ جو پارٹی اس عرصہ میں تربیت یافتہ ہوئی اسمیں صرف مسلمانوں کے نام سامنے آتے ہیں۔

مُلکی طاقت کا انحطاط شاہ ولی اللہ صاحب جب پیدا ہوئے، ہندوستان کی طاقت عروج کے آخری نقطہ پر تھی۔ قندھار سے آسام اور مدراس تک پورا ہندوستان ایک مرکز کے ماتحت متحد تھا۔

تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ آخری باب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُس انحطاط کا تذکرہ کر دیا جائے جو شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات ۱۷۶۳ء مطابق ۱۱۷۶ھ تک ہندوستان کی طاقت میں آچکا تھا۔

۱۷۳۸ء۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کا مشہور حملہ ہوا جس نے ۲ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ، مارچ[1] ۱۷۳۸ء دہلی میں قتلِ عام کر کے ہندوستان کی شہ رگ کا خون چُوس لیا۔

اس قتلِ عام میں مرنے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک کیا گیا ہے[2] بائیس کروڑ روپیہ نقد خزانۂ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ کے جواہرات اور تختِ طاؤس وغیرہ قلعہ سے لُوٹے گئے[3] اور جو دولت شہر سے لُوٹی گئی اس کی تعداد بھی ستّر کروڑ تک بتائی گئی ہے۔ اس مالی بربادی اور تباہی کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملکی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ شمال مغرب میں دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اور پنجاب کے چند محال کا دہلی کے بجائے ایران کے ساتھ باقاعدہ الحاق کر دیا گیا[4] دریائے سندھ سے دہلی تک اگرچہ محمد شاہ کی حکومت رہی مگر اس افراتفری میں مرکزی حکومت کا وقار کم از کم اس علاقہ میں ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہ اقتدار بھی بے وقار رہا۔ مشرق میں علی وردی خاں مہابت جنگ نے موقع غنیمت دیکھ کر

---

[1] تقویم کے حساب سے ۱۷۳۹ء ہوتا ہے۔ [2] تاریخ ہندوستان شمس العلماء، جلد ۹ ص۲۵۸۔
[3] عماد السعادت ص۳۱۔ [4] تاریخ ہندوستان ص۲۵۹ و عماد السعادت ص۳۱۔

Marfat.com

مستقل حیثیت اختیار کرلی اور اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ مرکز سے علیحدہ ہو گئے۔[1]

حملۂ نادری سے دس سال بعد ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۷ء سے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے۔ پہلے حملہ میں بادشاہ دہلی نے صوبہ پنجاب و ملتان دے کر جان چھڑائی۔[2] دوسرے حملہ میں ابدالی ایرانی فوجوں سمیت دہلی پہنچا اور دہلی کو دو ماہ تک اس طرح لُوٹا کہ نادر گردی بھی مات ہو گئی۔[3] حملہ نادر شاہ سے بیس سال بعد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں علی وردی خاں کے نواسہ سراج الدولہ کا خاتمہ ہوا۔ علی وردی خاں کے غصب کردہ علاقہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا جھنڈا لہرانے لگا اور اس طرح ایک رقیب و حریف طاقت کے قدم ہندوستان میں جم گئے۔

جنگ پلاسی سے ساڑھے چار سال بعد ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر تیسرا حملہ ہوا اور ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء ۶ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ کو پانی پت کا مشہور معرکہ ہوا جسمیں مرہٹہ طاقت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ہاں روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خاں کی حکومت اور جنوبی ہند میں آصف جاہ کی سلطنت مستقل مملکتیں بن گئیں۔

بہر حال شاہ صاحب کی وفات کے وقت مُلک کی وحدت پارہ پارہ اور ملکی طاقت کو بہت کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ مگر عوام کا ایک عقیدہ، ایک قسم کی وحدت کا تصور اب تک باقی رکھے ہوئے تھا۔ یعنی عقیدہ یہ تھا کہ ملک کا حقیقی اور جائز مالک مغل بادشاہ ہے۔ عوام کے اسی عقیدہ کا اثر یہ تھا کہ خود مختار صوبے بھی مجبور تھے کہ مغل بادشاہ کو کم از کم مربّی، سرپرست اور مرشد کی حیثیت میں تسلیم کریں۔ بغاوت کرنے والوں کی بھی آخری کوشش یہ ہوتی تھی کہ مغل بادشاہ سے اپنے مقبوضہ علاقہ کے لئے سندِ جواز حاصل کرلیں۔

---

[1] عماد السعادت ص ۳۲ و سیر المتاخرین۔ [2] تاریخ ہندوستان و سیر المتاخرین۔ [3] تاریخ ہندوستان و سیر المتاخرین و عماد السعادت۔

Marfat.com

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات[1] کے بعد اُن کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحبؒ[2] کو اُن کا جانشین تسلیم کیا گیا۔ ہمیں سلسلۂ جانشینی سے دلچسپی نہیں لیکن اس جانشین نے جو خدمات انجام دیں وہ یقیناً تاریخ کی گراں قدر یادگار ہیں[3] تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ اس قابل و فاضل جانشین کے دَور میں یہاں تک ترقی کر گیا کہ پورے ہندوستان میں کوئی علمی حلقہ ایسا نہیں رہا جس کا تعلّق اس علمی مرکز سے نہ ہو۔

"فک کل نظام" ہمہ گیر انقلاب کا تصوّر جو شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات تک چند دماغوں کی مخصوص امانت تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کے وقت ملک کا عام جذبہ بن چکا تھا۔ ہزاروں نوجوان اس کے لئے زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ اور اس کی صدائے بازگشت ہندوستان سے گذر کر ایشیا کے دُور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔

مقاصدِ تربیت اس تربیت گاہ سے فیض پانے والوں کے حالات فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں[4] میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر چند بزرگوں کے حالات اس باب کے

---

[1] ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء۔ [2] اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ [3] ان عظیم الشان خدمات نے ثابت کر دیا کہ آپکی جانشینی اہلیت و صلاحیت کی بِنا پر تھی، صاحبزادگی کی بِنا پر یہ اعزاز سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ [4] مثلاً الیانع الجنی (عربی) و ابجد العلوم (عربی) از نواب صدیق حسن صاحب بھوپال۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ۶ (عربی) وقائع احمدی منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء۔ آثار الصنادید۔ سر سید احمد صاحب بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نور احمدی مصنفہ مولوی نور احمد صاحب نگرامی۔ مخزن احمدی مصنفہ سید محمد علی صاحب خواہر زادہ سید احمد صاحب شہید۔ الدر المنثور فی احوال صادق پور وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

آخر میں پیش بھی کئے جائیں گے۔ ان حالات و سوانح کی شہادت یہ ہے کہ تربیت کے مقاصد یہ تھے۔

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریات کو ذہن نشین کرانا۔

(۲) خدا پرستی، خوفِ خدا اور پاک بازی کا سچا جذبہ پیدا کرنا۔

(۳) ملوکیت اور شاہ پرستی کے جراثیم کو دماغوں سے نکالنا۔

(۴) جذبۂ فدائیت۔ یعنی نصب العین کیلئے قربان ہونے کا شوق پیدا کرنا۔

(۵) خدمتِ خلق، بالخصوص نوعِ انسان کی ہمدردی اور غم خواری اور خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانے کا عادی بنانا۔

(۶) شاہانہ تکلفات ختم کرنا اور سادہ زندگی کا عادی بنانا۔

(۷) فوجی سپرٹ پیدا کرنا۔ جفاکشی، محنت اور ہر قسم کے حالات برداشت کرنے کا عادی بنانا۔

(۸) ایسی رسومات کو بند کرانا جو سوسائٹی کو پستی کی طرف لے جا رہی تھیں۔

(۹) عیاشی کے اڈے ختم کرنا، اور ایسے تمام جراثیم کی اصلاح کرنا جو سوسائٹی کو عیش پرست، آرام طلب اور پست ہمت بنا رہے تھے۔

تربیت کے طریقے تین تھے (۱) درس و تدریس[1]۔ جس کا حلقہ اتنا وسیع ہوا کہ

[1] شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جسکی بنیاد شاہ عبدالرحیم صاحب ڈال گئے تھے، طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ یہ مدرسہ اُسی مقام پر تھا جہاں اب شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کی اولاد کی قبریں ہیں جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے (حیات ولی ص ۲۲) جب شاہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف و اکناف سے آنے لگے اور مدرسہ رحیمیہ اُن کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگا تو محمد شاہ بادشاہ نے ایک عالی شان مکان مدرسہ کو دیا۔ اب پُرانا مدرسہ غیر آباد ہوگیا اور اس نئے مدرسہ نے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے استحکام کی حالت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء تک یہ اپنی حالت پر قائم رہا مگر اس ہنگامہ میں (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں رہا جس کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے نہ ہو[1]

(۲) رُوحانی تربیت : جس کے لئے صوفیا کے طریقے اختیار کئے جاتے تھے، اور اس کا سب سے زیادہ ضروری اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ جو کچھ بنایا جاتا ہے، عملی طور پر اُس کا عادی بنایا جائے۔ خود غرضی، نفس پرستی، اقتدار پسندی جیسی صفات سے دل پاک کیا جائے۔ صبر وضبط، جفاکشی، محبّت و شفقت اور ہر ایک مادی غرض سے بالا ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت اور اُس کے لئے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ مدرسہ لُٹ گیا۔ اس کے کڑی تختے تک اُتار لئے گئے اور زمین ضبط ہو گئی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب یہاں پورا محلہ آباد ہے، جو اب تک مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے۔ (دارالحکومت دہلی - از مولوی محمد بشیر صاحب ج ۲ ص ۲۸۶۔ ج ۳ ص ۱۶۷)۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] امام عبدالعزیز صاحب سے تربیت پا کر اُن کے داعی اطرافِ ہند میں پھیل گئے۔ اس زمانہ کے ایک عالم نے اس لئے سیاحت کی کہ اُسے علمِ حدیث کا کوئی ایسا استاذ ملے جو امام عبدالعزیز صاحب کا شاگرد نہ ہو۔ مگر ہند میں اُسے ایک مدرس بھی ایسا نہیں ملا۔ (سیاسی تحریک ص ۱۱۸)۔ [2] نہ صرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بلکہ آپ کا پورا گھرانہ اس تربیت میں کمال رکھتا تھا۔ انہیں روحانی کمالات کا ایک اثر یہ تھا کہ اس خاندان نے کبھی شاہی منصب یا شاہی جاگیر منظور نہیں کی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب سلطان عالمگیر کے زمانہ کے مشہور عالم تھے۔ بادشاہ نے آپ کو اس علماء کے بورڈ کا ممبر بنانا چاہا جو فقہ حنفی کے فتاویٰ مرتب کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ آپ کی والدہ کی بھی خواہش ہوئی کہ اس بورڈ میں شریک ہو جائیں تو عزّت و عظمت بھی حاصل ہو، اور رات دن آٹے دال کی فکر سے بھی نجات ملے۔ مگر آپ نے بادشاہ کو صاف جواب دے دیا۔ ماں سے معذرت کر دی اور اسی نانِ جویں پر خدمتِ خلق کرتے ہوئے زندگی گذار دی۔ البتہ وقتاً فوقتاً اُن علماء کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

(۳) پبلک جلسوں اور عام اجتماعات میں تقریریں۔

چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا مقررہ پروگرام تھا کہ ہفتہ میں دو[2] مرتبہ عام اجتماع میں تقریر ضرور کیا کرتے تھے۔ دہلی اور بیرونِ دہلی کے ہزاروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رہنمائی اور مفید مشورے ضرور دیتے رہے جو بورڈ میں کام کرتے تھے۔ ایک طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عظمت و عزّت کا یہ عالم ہے کہ شاہزادے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور پاؤں دبانے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں (ملفوظات صـ۵۳) - بر سرِ راہ نوابوں اور اُمراء سے ملاقات ہو جاتی ہے تو وہ اپنی سواریوں سے اُتر کر مصافحہ اور مزاج پُرسی کرتے ہیں (صـ۵۲) بادشاہ سے بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی مصافحہ کرنے میں پورے احترام سے پیش آتے ہیں۔ پریشانی کے اوقات میں آپ سے دُعا کی استدعا کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف قناعت اور سیر چشمی کا یہ عالم ہے کہ کسی شاہی عطیہ کا قبول کرنا تو درکنار، بادشاہ اور امراء کی ہمّت بھی نہیں پڑتی تھی کہ وہ کچھ پیش کریں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری پیش کش نظرِ حقارت سے مسترد کر دی جائے گی ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں — خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں (خسرو)

ملفوظات کے حوالہ سے ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

دہلی میں وبا پھیلی مسلمانوں نے طے کیا کہ جامع مسجد میں جمع ہو کر دوگانہ پڑھیں اور دُعا کریں۔ بادشاہ کی طرف سے اجتماع کا انتظام کرایا گیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بادشاہ کی طرف سے خاص ایلچی نے حاضر ہو کر اس اجتماع میں شرکت کی درخواست کی۔ ۸ بجے کا وقت مقرر تھا۔ جب شاہ صاحب پہنچے اُسی وقت بادشاہ کی سواری بھی پہنچی۔ جامع مسجد کے زینہ پر ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور معذرت کی کہ یہاں تشریف لانے میں جناب کو تکلیف ہوئی۔ وقتِ عزیز صرف ہوا، معاف فرمائیے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب: یہ سب کچھ خلقِ خدا کے نفع کے لئے ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

آدمی ان اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پروگرام کی پابندی یہانتک تھی کہ مرض الموت میں بھی جب تک بولنے کی طاقت رہی اس تقریر کے پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد بادشاہ نے درخواست کی کہ چھوٹے بھائی مولانا رفیع الدین صاحب سے فرمائیے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ یہ منصب امام جامع مسجد کا ہے اُن سے فرمائیے وہی نماز پڑھائیں گے۔ نماز کے بعد دُعا اور استغفار کا وقت آیا۔ بادشاہ نے اصرار کر کے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اپنے پاس بُلایا۔ آپ مجبوراً بادشاہ کے قریب پہنچے۔ مگر دہلی کے ایک بزرگ شاہ غلام علی صاحب کو آگے بڑھا کر خود پیچھے ہٹ گئے (ملفوظات صفحہ ۷۷-۷۸) مختصر یہ کہ بادشاہِ وقت کی نظر میں یہ احترام تھا مگر نہ بادشاہ کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ کچھ پیش کریں اور نہ اس طرف یہ امکان تھا کہ شاہی پیش کش منظور کر سکیں جس کے حلال اور پاک ہونے میں بھی شبہ تھا اور جس سے یہ بھی خطرہ ہو سکتا تھا کہ آزادیٔ رائے باقی نہ رہ سکے۔ آپ ایک دارالعلوم اور یونیورسٹی کے اعزازی پرنسپل اور صدر مدرس بھی تھے۔ دارالعلوم میں لنگر جاری رہتا مگر گھر کے آدمی فاقہ کے خوگر تھے۔ ایک مرتبہ چند وقت کے فاقہ نے بچّوں تک کو نڈھال کر دیا۔ ایک خادمہ نے کہیں اس کا تذکرہ کر دیا۔ آپ نے اُس خادمہ کو علیحدہ کر دیا کہ ہمارے گھر کا راز فاش کرتی ہے (امیر الروایات) ایک دوست نے مطالعہ کے لئے کچھ کتابیں منگائیں۔ ان کی جلدیں بوسیدہ تھیں تو نئی جلدیں بندھوا دیں۔ جب حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس پہنچیں تو چونکہ یہ دوست سرکاری وظیفہ دار تھے، شاہ صاحب نے وہ جلدیں تڑوا دیں کہ سرکاری آمدنی کا کوئی ذرّہ بھی اپنے کام میں نہ آنے پائے۔ مولانا رحیم بخش صاحب کی روایت یہ ہے کہ وفات کے وقت شاہ عبدالعزیز صاحب نے وصیّت فرمادی تھی کہ وفات کی اطّلاع بادشاہ کو نہ دی جائے (حیات ولی صفحہ ۳۴۴)۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خدمتِ خلق کے جذبہ نے اس خاندان کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ طبابت کو ذریعۂ معاش بنائیں۔ (ملفوظات صفحہ ۴۳)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو کوچہ چیلان (دہلی) (پرانے مدرسہ) میں مجلسِ وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں خواص و عوام مور و ملخ سے زیادہ جمع ہو جاتے تھے۔ آپ کی معجزانہ تقریر میں وہ اثر ہوتا تھا کہ مخالفین گھروں سے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

تربیت یافتہ علماء جو علماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہ سے تربیت پاکر ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب بنے اُن کی فہرست بہت طویل ہے چند نام یہاں[1] ذکر کئے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعتراض کا ارادہ کرکے چلتے لیکن وہاں بجز سکوت اور تسلیم کے کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ آپ کا طرزِ بیان ایسا عجیب تھا کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی مجلس سے خوش ہوکر اُٹھتا تھا اور آپ کی کوئی بات کسی پر گراں نہیں گذرتی تھی۔ آپ کو خلق خدا کی خدمت کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ انتہا یہ کہ زیادتی مرض کے زمانہ میں جب وعظ کا دن آیا تو آپ نے دوسروں کے سہارے بیٹھ کر وعظ شروع کیا۔ تقریر شروع ہوئی تو آپ نے سہارا دینے والوں کو بھی الگ کر دیا اور حسبِ معمول تقریر فرماتے رہے۔ لب و لہجہ سے کمزوری اور ناتوانی کے آثار نمایاں تھے مگر استقلال ویسے ہی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھا۔ ختمِ تقریر پر آپ نے دُعا کی۔ چند وصیتیں فرمائیں۔ پھر چند روز بعد وفات ہوگئی (حیات ولی)

تقریر میں کیا ہوتا تھا ملفوظات کے ایک فقرہ سے ان تقریروں کے مضمون کا اندازہ ہوجائے گا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر مجھے غازی الدین حیدر (شاہِ اودھ) اپنے یہاں بُلائیں (بشرطیکہ جاگیر اور منصب کی کوئی رنج لگی ہوئی نہ ہو) تو میں ضرور پہنچوں اور اس انداز سے تقریر کروں کہ اُن کی آنکھیں کُھل جائیں اور راہِ راست پر آجائیں۔ پھر فرمایا۔ اب مجھے اپنے قتل کئے جانے کا بھی خوف نہ رہا۔ صرف یہ وسوسہ آتا ہے کہ اگر اسی حالت میں قتل کر دیا جاؤں تو جو کام پیشِ نظر ہے وہ ادھورا رہ جائے گا۔ (ملفوظات ص۵۱)

غازی الدین حیدر، اودھ کے نواب تھے۔ ان کے باپ دادا (سعادت علی خاں، شجاع الدولہ صفدر جنگ وغیرہ) اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ اُن کو دربارِ دہلی سے منصبِ وزارت حاصل ہے مگر آپ نے دربارِ دہلی کا یہ تعلق منقطع کر دیا اور انگریزی گورنر جنرل کی زیرِ سرپرستی اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ (قیصر التواریخ۔ تاریخ اودھ۔ عماد السعادت وغیرہ)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مولانا محمد رحیم بخش صاحب دہلوی مصنف حیاتِ ولی نے مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کو بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تلامذہ میں شمار کرایا ہے۔ مگر مولانا خیرآبادی بلا واسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ آپ حضرت شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے شاگرد تھے۔ (سیر العلماء، و تذکرۂ علماء ہند وغیرہ)۔

Marfat.com

جاتے ہیں۔ (ان بزرگوں کے مفصل حالاتِ زندگی ایک مستقل جلد میں پیش کئے جائیں گے (انشاء اللہ العزیز)۔

(۱) مولانا شاہ رفیع الدّین صاحب (۲) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب

(۳) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب

یہ تینوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کی تربیت کی مگر یہ تینوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔

(۴) مولانا شاہ محمّد اسحاق صاحب، خلف جناب شیخ محمد افضل صاحب (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے)۔

(۵) مولانا شاہ محمّد یعقوب صاحب۔ " " " " " "

(۶) مولانا شاہ عبدالحی صاحب (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد)

(۷) مولانا شاہ محمّد اسمٰعیل صاحب۔ خلف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب برادرِ خورد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب۔

(۸) حضرت سیّد احمد صاحب شہید۔ تذکرہ آگے آئے گا۔

(۹) مولانا رشید الدّین صاحب دہلوی۔

(۱۰) مولانا مفتی صدر الدّین صاحب دہلوی۔

(۱۱) مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلہ

(۱۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی

(۱۳) مولانا مخصوص اللہ صاحب (خلف مولانا رفیع الدّین صاحب)

(۱۴) مولانا کریم اللہ صاحب دہلوی، خلف مولانا لطف اللہ صاحب فاروقی۔

(۱۵) مولانا میر محبوب علی صاحب دہلوی

(۱۶) مولانا عبدالخالق صاحب دہلوی

Marfat.com

(۱۷) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی

(۱۸) مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی

کار پردازانِ حکومت کا سُلوک

مغل بادشاہ عموماً اس خاندان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ بادشاہ خود اپنے اعتبار میں نہیں تھے، اور جو کار پرداز با اختیار تھے اُن میں عموماً وہ تھے[1] جن کو یہ اصلاحات پسند نہیں تھیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ مثلاً

غنڈہ گردی

حضرت شاہ صاحب کا خود اپنا بیان ہے:

"جب مَیں پُرانے شہر میں تھا تو خود اپنوں کے ہاتھوں مجھے بہت تکلیف پہنچائی جاتی۔ آبرو باختہ آوارہ گردوں کو اُکسایا جاتا تھا۔ وہ میرے مکان کے قریب چھت پر تعزیہ رکھ دیتے تھے اور تبرا وغیرہ کی ایذا رساں حرکتوں سے ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ رمضان شریف میں مسجد میں تراویح ہو رہی تھی۔ ایک بازاری عورت کو شراب پِلا کر وہاں پہنچا دیا گیا ــــ وُہ

---

[1] یہ انگریزوں کا حامی گروپ تھا جو بدقسمتی سے مذہباً شیعہ تھے۔ نجف خاں اس کے قائد اور لیڈر تھے جن کو شجاع الدولہ اور انگریزوں کے اطراپر "امیر الامراء" بنایا گیا تھا۔ مرہٹی راجہ اس منصب پر کسی روہیلہ سردار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اوّل وہ نجیب الدولہ کے حامی رہے اور اس کی وفات کے بعد نجیب الدولہ کے فرزند ضابطہ خاں کو مرہٹوں کی حمایت حاصل رہی کسی قدر تفصیل آگے آئے گی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نجیب الدولہ کے مدّاح تھے۔ ایک مرتبہ نجیب الدولہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ نجیب الدولہ کی سرکار میں تو سنّو عالم تھے۔ اُن کی تنخواہیں پانچ روپے سے لے کر پانچ سو تک تھیں۔ حنفی، شافعی اور مالکی مسلک کے تین علماء قاضی (عدالت عالیہ کے جج) مقرر کیے تھے (ص۸۱ ملفوظات)۔

Marfat.com

حافظ شیرازی کا ایک شعر[1] پڑھ رہی تھی اور غنڈوں کا ہجوم ڈھول بجا رہا تھا، اور طرح طرح کے آوازے کس رہا تھا۔[2]

ان غنڈوں کا اگر جواب دیا جاتا تو بلوہ کی نوبت آتی، جو مقاصدِ تحریک کے لئے خطرناک تھا۔

ضبطی جائداد غنڈہ گردی سے کامیابی نہ ہوئی تو حضرت شاہ صاحب کا مکان ضبط کر لیا گیا اور اُن کو دہلی سے نکال دیا گیا۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے اس وقت خاص طور پر امداد فرمائی اور آپ کے قیام کا انتظام کیا اور پھر اپنے تعلّقات کو کام میں لاکر بادشاہ کے ذریعہ حویلی واپس دلوائی۔[3]

شہر بدر یہ قصہ رفع دفع ہوا، تو کوئی نیا قضیہ کھڑا کیا گیا، اور آپ کو مع اہل و عیال شہر بدر کر دیا گیا۔ اس مرتبہ حضرت شاہ فخر الدّین صاحب کے تعلّقات بھی کام نہ آسکے۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب اور آپ کے بھائیوں کو شاہدرہ تک مع متعلّقین پیدل جانا پڑا۔ شاہدرہ سے حضرت شاہ فخر الدّین صاحب نے متعلّقین کے لئے سواری کا انتظام کرا دیا۔[4] بسا اوقات وزراء اور اُمراء کی بدسلوکی کی داد رسی ریزیڈنٹ کر دیا کرتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ریزیڈنٹ خود شاہ صاحب

---

[1] شعر یہ ہے۔ (ملفوظات صـ۵۴)

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند　　　در تو نمے پسندی تغییر کن قضارا

[2] ملفوظات صـ۵۴۔ [3] فرزندان شاہ ولی اللہ مغفور را، در آنچہ متصدیانِ سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ و حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آں حضرت (شاہ فخر الدین صاحب) بحویلی مبارک جا دادند، و غمخواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان بالشان رہانیدند و با اعزاز و اکرام در آنجا رسانیدند۔ (مناقب فخریہ صـ۳۱ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت)۔ [4] امیر الروایات، ارواح ثلاثہ صـ۲۴۔

Marfat.com

کے مخالف[1] تھا۔

قتل کرنے کی سازش صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ دو مرتبہ آپ کو زہر بھی دیا گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے زہر ناکام رہا۔ مگر جسمانی صحت پر اُس کا بُرا اثر پڑا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے بدن پر چھپکلی کا اُبٹن مل دیا گیا تھا جس سے برص ہوگیا تھا[2]۔

بہرحال ان تمام سزاؤں کے نتیجہ میں :

(۱) بینائی جاتی رہی۔ (۲) برص ہوگیا۔
(۳) خون میں حدت ہوگئی۔ (۴) مختلف امراض پیدا ہوگئے۔

---

[1] مناقب فریدی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت۔ [2] ارواح ثلاثہ ص ۲۴

Marfat.com

سیاسی بحران اور متحارب طاقتیں

انگریزوں کے خلاف مغل بادشاہ کی دفاعی جدّوجہد اور ناکامی

○

یہ شاہ صاحب کی عالمانہ اور درویشانہ زندگی کی ایک جھلک تھی
اب آیئے، اس دَور کے سیاسی بحران پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے،
تاکہ اُن صبر آزما حالات کا اندازہ ہوسکے، جن کے طوفانوں میں
گھِر کر شاہ صاحب نے سیاسی اور قومی خدمات انجام دیں۔

○

پلاسی کے میدانِ جنگ (رمضان ۱۱۷۰ھ، مئی ۱۷۵۷ء) کے بعد سراج الدولہ کے خون سے حکومتِ بنگال کا پٹہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ایسے وقت لکھا گیا کہ مغل شہنشاہیت کا تخت جاٹوں[1]، مرہٹوں[2]، سکھوں[3] اور احمد شاہ ابدالی[4] کے بھنور

---

[1] دہلی کے جنوب میں سوا سو، ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ڈیگ، کامہ، بیانہ قصبات آج بھی مشہور ہیں بھرت پور ان کا مرکزی مقام تھا جو ریاست کی راجدھانی رہا۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب ریاستیں ختم ہوئیں تو یہ ضلع کا صدر مقام ہوگیا ہے۔ اس علاقہ کی سرحدیں آگرہ اور متھرا سے ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ بھرت پور آگرہ سے تقریباً چونتیس میل ہے۔ چونکہ سری کرشن جی کی پیدائش اسی علاقہ میں ہوئی۔ اُن کا خاندان اسی علاقہ میں تھا۔ بھرت پور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کرشن جی کے چچا کے نام پر آباد کیا گیا تھا اور کامہ میں سری کرشن جی کے نانا رہا کرتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کے لحاظ سے یہ علاقہ تاریخی عظمت کے علاوہ مذہبی تقدّس بھی رکھتا ہے مغل بادشاہوں کے دَورِ عروج میں یہ علاقہ شاہی خاندان کے افراد کی جاگیر ہوا کرتا تھا نورجہاں جو دورِ عروج کی نامور ملکہ ہے یہی علاقہ اُس کی جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ اس علاقہ میں جاٹوں کی (بقیہ صفحہ آئندہ)

Marfat.com

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آبادی اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہے مگر قوت میں ہمیشہ حاوی اور غالب رہی ہے۔ ان کے بہت سے خاندان مسلمان ہو کر میواتی کہلانے لگے۔ وہ مذہباً الگ ہو گئے مگر بود و باش، معاشرت، سیاسی تعلقات حتیٰ کہ جنگ و صلح میں بھی ایک دوسرے کے شریک اور معاون رہے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کی مرکزی طاقت میں جب اضمحلال شروع ہوا، اور ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو یہاں کے جاٹوں میں بھی اپنی خود مختار حکومت کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ اُن کا سردار بدن سنگھ تھا۔ ۱۷۲۳ء میں ڈیگ مقام پر اس کو راج تلک دیا گیا۔ اب وہ ایک خود مختار راجہ کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ بھرت پور کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے ۲۲ لڑکوں میں "سورج مل" سب سے زیادہ مستعد اور ہوشیار اور سیاسی داؤ پیچ میں چاق و چوبند تھا۔ بدن سنگھ نے اس کو ولی عہد بنا کر کاروبارِ حکومت اُس کے سپرد کر دیا۔ اور جب بدن سنگھ تینتیس برس دو ماہ دس دن حکومت کر کے ۱۷۵۶ء، ۱۱۷۰ھ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا تو سورج مل ولی عہد نے مستقل فرمانروا کی حیثیت سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ۱۷۵۷ء کے اس دور میں جاٹوں کا راجہ بھی تھا اور اُس کے بلند حوصلوں نے اس کو بساطِ سیاست میں ایسا مہرہ بنا دیا تھا کہ کوئی بھی سیاسی طاقت اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں مرہٹوں نے اس کو اپنانا چاہا تو اُس نے نہایت ہوشمندی سے اپنا پہلو بچا کر نہ صرف اعلیٰ تدبر کا ثبوت دیا بلکہ اپنی ریاست کو بھی محفوظ کر لیا۔ اس وقت سورج مل نے مرہٹوں کو مشورہ دیا تھا کہ بھاری ساز و سامان، شاہانہ خیمے اور حرم سرائیں اُن کیلئے کارآمد نہیں۔ یہ شاہانہ انداز اس موقع پر وبالِ جان ثابت ہوگا۔ وہ ہمیشہ سے گوریلا جنگ کے عادی ہیں۔ اسی جنگ سے وہ ابدالی کو شکست دے سکیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ تمام ساز و سامان ریاست بھرت پور کے قلعوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ اور جریدہ گھوڑے سوار ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ مرہٹوں کے سرداروں نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر سدا شیو راؤ عرف بھاؤ جو کمانڈر انچیف اور جنگ کا انچارج تھا اس رائے سے متفق نہیں ہوا، اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سورج مل جو ایک زمیندار کی حیثیت رکھتا ہے لڑنا کیا جانے "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ بہرحال سورج مل کو موقع مل گیا اور وہ شریک جنگ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں ہوا۔ سورج مل نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ معمولی سی بات پر اپنے پرانے دوست نجیب الدولہ کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اور جب کہ نجیب الدولہ بیمار تھا، اُس نے کوچ کر کے دہلی پر حملہ کر دیا مگر نتیجہ برخلاف رہا۔ غنیم کے گولوں سے سورج مل زخمی ہو کر گرا۔ اور دشمنوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب سورج مل زخمی پڑا ہوا تھا تو اُس کے مخلص رفقاء جو اُس کی حفاظت کر رہے تھے، اُن میں ایک مسلمان پیرزادہ شیخ احمد بھی تھے۔ اُن کا وطن فتح پور تھا۔ مگر یہ سورج مل کے معتمد تھے۔ یہ بھی اُسی مدافعت میں کام آئے اور آخر کار سورج مل بھی یہیں قتل کر دیا گیا۔ ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۴ء میں یہ حادثہ پیش آیا۔ صرف ۸ سال دو ماہ پندرہ دن حکومت کرنے کا موقع ملا۔ (تاریخ راجستھان از کرنل ٹاڈ۔ و وقائع راجستھان از حکیم نجم الغنی صاحب)

۲ نظام الملک جو دکن میں اپنی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے مرہٹوں کو دہلی کا راستہ بتایا ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء میں مرہٹے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے اور چند روز قیام کر کے ایک معاہدہ کے بعد واپس ہو گئے۔ مرہٹوں کو اس یلغار میں صرف اتنا ہی فائدہ ہوا کہ چوتھ کا مطالبہ جو عالمگیر کے زمانہ سے اب تک ناکام تھا۔ اس معاہدہ میں تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ نظام الملک کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُس کی نونہال ریاست مرہٹوں کی دست بُرد سے محفوظ ہو گئی اور اُس کے حریف وزراء کو نیچا دیکھنا پڑا، کیونکہ بقول طباطبائی اگرچہ بادشاہ کو یقین تھا کہ مرہٹوں کی یہ مصیبت نظام الملک کی لائی ہوئی ہے مگر اس کے دفعیہ کی شکل بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ نظام الملک کی دل جوئی کی جائے۔ چنانچہ مرہٹوں کی روانگی کے بعد بادشاہ نے ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں نظام الملک کو شفقت آمیز فرامین لکھ کر دہلی طلب کیا۔ اسی دل جوئی کیلئے "وکالتِ مطلق" کا سب سے بڑا عہدہ، آصف جاہ کا خطاب اور ہشت ہزاری منصب عطا کیا۔ (سیر المتاخرین وغیرہ) بہر حال اس حملہ کے بعد مرہٹوں کا نیا تعلق دہلی سے قائم ہو گیا۔ اودھر نظام الملک کی اس حرکت کے جواب میں شیعہ وزراء نے نادر شاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا مشہور حملہ ہوا۔ نادر شاہ تختِ دہلی تو محمد شاہ کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

میں پھنسا ہؤا تھا۔ ان طوفانی حملوں کے علاوہ خود ارکانِ دولت[۱]، وزراء اور اُمراء کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے حوالہ کر گیا لیکن صوبہ کابل، صوبہ سندھ اور پنجاب کے کچھ محالات (اضلاع) سلطنتِ ایران میں داخل کر لئے۔ اس تقسیم سے ایک نئے فتنہ کا دروازہ کُھل گیا کیونکہ بادشاہ ایران اس علاقہ میں اپنا نظام قائم کرنا چاہتا تھا اور ہندوستان سے اُبھرنے والی طاقتیں اس علاقہ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ابدالی کے حملوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مرہٹوں نے اس علاقہ میں تاخت کی تھی جس کو ایران اپنا علاقہ سمجھنے لگا تھا۔

۳؎ کپورتھلہ کے سکھ سردار "جسا سنگھ" نے ۱۷۴۳ء میں لاہور پر حملہ کر کے لاہور کے صوبہ دار زکریا خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد تصادم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۶ء میں جسا سنگھ نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ابدالی کو جیسے ہی خبر ہوئی، اُس نے دہلی کا قصد کیا۔ "جسا سنگھ" ابدالی کی آمد کی خبر سُن کر دہلی سے واپس ہؤا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد دہلی پر حملہ تو نہیں کیا مگر پنجاب میں اُس کی تاخت و تاراج کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۳ء میں اُس کا انتقال ہو گیا (تاریخ کپورتھلہ از لیپل گرفن، انڈر سکریٹری گورنمنٹ پنجاب ۱۸۷۰ء)۔

۴؎ احمد شاہ درانی یا ابدالی، ایک افغانی سپاہی تھا۔ نادر شاہ کی فوج میں ملازم تھا۔ ترقی کر کے فوج کا افسر ہو گیا اور نادر شاہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ سنہ ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اپنے ملازموں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس فوجی حکومت کی باگ ڈور احمد شاہ درانی کے ہاتھ میں آئی اور چونکہ صوبہ پنجاب میں خلفشار تھا، اس لئے حکومت سنبھالتے ہی احمد شاہ کو ہندوستان کا رُخ کرنا پڑا۔ اور اس طرح ابدالی کے حملوں کا آغاز ہو گیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۱۷۰ھ میں رگھناتھ راؤ اور شمشیر بہادر، برادران بالاجی راؤ اور ہولکر وغیرہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور کو فتح کر لیا اور ابدالی کے لڑکے تیمور شاہ کو فرار ہو کر کابل جانا پڑا (سیر المتاخرین) اس کے جواب میں احمد شاہ کو چھٹی مرتبہ ہندوستان آنا پڑا اور پانی پت کا وہ معرکہ کرنا پڑا جو تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک ساداتِ بارہ کا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ حسن علی خاں اور عبداللہ خاں کو بادشاہ گر کہا جانے لگا (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مغلیہ تاج وتخت اُن کے پنجۂ اقتدار میں تھا جس کو چاہتے معزول کر کے کسی دوسرے کو اُس کا جانشین بنا دیتے۔ بالآخر بادشاہ اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کی باہمی سازش سے اُن کا اقتدار ختم ہوا، تو ایک طرف میر محمد امین برہان الملک نواب سعادت علی خاں نے اودھ میں اپنی گدی سنبھال کر بادشاہ کو زیرنگیں رکھنا چاہا۔ دوسری طرف نظام الملک اپنے اس حق سے (جو اس بنا پر کہ اُس نے بادشاہ کو حسن علی خاں اور عبداللہ خاں کے پنجۂ اقتدار سے نجات دلائی تھی) کسی طرح دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ برہان الملک کا اقتدار بڑھنے لگا تو نظام الملک نے مرہٹوں کو شہ دے کر دہلی کو تاراج کرا دیا۔ اس کے بعد اگرچہ وزارت برہان الملک کے حصّہ ہی میں رہی مگر وزارت سے بھی بلند مرتبہ "وکالتِ مطلقہ" نظام الملک کو عطا ہوا اس جوابی کارروائی کے لئے برہان الملک کے پاس کوئی ہندوستانی مُہرہ نہیں تھا تو اُس نے ایران کے خونخوار مُہرہ "نادر شاہ" کو دعوت دی۔ نادر شاہ کے حملہ اور کامیابی کے بعد بھی نظام الملک کی چال کامیاب ہوگئی تھی یعنی صرف دو کروڑ روپیہ پر نادر شاہ سے گفتگو کر کے اُس کو واپس چلے جانے پر آمادہ کر لیا تھا اور اس حسنِ کارکردگی کے صلہ میں مغل دربار سے امیرالامرائی کا منصب حاصل کر لیا تھا۔ مگر برہان الملک خاموشی سے اپنی اس آخری ناکامی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ نادر شاہ کو خاص دہلی پر حملہ کرنے اور دہلی کو لُوٹنے پر آمادہ کیا۔ جس کا نتیجہ وہ قتلِ عام ہوا۔ جس کے چرچے آج تک بچوّں اور بڑوں کی زبان پر ہیں۔ مگر برہان الملک کو خبر نہ تھی کہ فرشتۂ موت اس کی تاک میں ہے ابھی وہ نادر شاہ سے اپنی اس خدمت کا صلہ بھی نہیں پا سکا تھا کہ سرطان کا حملہ شدید ہوا، اور دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس عرصہ میں ایک تیسری طاقت دہلی کے شمال مشرقی پڑوس میں جنم لے رہی تھی۔ یہ روہیلہ پٹھانوں کی طاقت تھی جو علی محمد خاں اور ان کے نوجوان رفیق اور بعد کے جانشین حافظ رحمت خاں کی قیادت میں روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے دنوں میں ایک باحیثیت حکومت بن گئی۔ جس کو ختم کرنے کے لئے وارن ہسٹنگس کو بھرپور غدّاری اور مکّاری سے کام لینا پڑا۔ اسی روہیلہ طاقت کا ایک جز بنگش خاندان تھا جس کے سربراہ اس زمانہ میں نواب محمد خاں بنگش تھے۔ اسی طاقت کا ایک رُکن نجیب خاں تھا (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

باہمی رقابت کا سرطان سلطنت مغلیہ کی ریڑھ کی ہڈی کو پگھلا رہا تھا۔ یہی سرطان تھا جو محرم ۱۱۷۲ھ مطابق ستمبر ۱۷۵۹ء میں بادشاہ عالمگیر دوم کے قتل کی صورت میں نمودار[1] ہوا۔ جس نے ابدالی کو ایک فیصلہ کن حملے پر مجبور کیا، اور مرہٹوں کی عظیم الشان طاقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جو شاہی دربار میں رسائی حاصل کر کے اس بساط کا کامیاب مہرہ بنا۔ اور نجیب الدولہ خطاب مع اس کے لوازمات کے حاصل کیا۔ روہیلوں کی یہ طاقتور حکومت اپنے محل وقوع کے لحاظ سے قدرتی طور پر برہان الملک کے جانشینوں صفدر جنگ اور شجاع الدولہ (نوابانِ اودھ) کے لئے خطرہ تھی۔ چنانچہ ایک نئی کش مکش پیدا ہوئی، جو نادرشاہ کے بعد ابدالی کی آمد کا سبب بنی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] پہلے گذر چکا ہے کہ ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں نظام الملک آصف جاہ اوّل کو "وکالتِ مطلقہ" کا منصبِ عالی ملا تھا۔ نظام الملک یہ عہدہ حاصل کر لینے کے بعد کچھ عرصہ دہلی رہے پھر حیدرآباد چلے گئے اور اپنے بڑے لڑکے غازی الدین خاں کو اپنا نائب مقرر کر گئے۔ نظام الملک اور غازی الدین خاں کی یہ طاقت مرہٹوں کے سہارے تھی۔ بادشاہ پر غازی الدین خان کا قبضہ ہو گیا تو اُس نے مرہٹوں کو برہان الملک کے جانشینوں (نوابانِ اودھ) کے پیچھے لگا دیا، اور نجیب الدولہ کو زیر کرنے کے لئے بھی اسی طاقت سے کام لیا۔ لیکن بادشاہ کا رجحان نجیب الدولہ کی طرف تھا اور اتفاق ایسا ہوا کہ مرہٹوں کو نواب اودھ (شجاع الدولہ) سے شکست اُٹھانی پڑی۔ پھر جب مرہٹوں نے روہیلوں پر حملہ کیا تو حافظ رحمت خاں، نجیب الدولہ اور احمد خاں بنگش نے متفق ہو کر اور شجاع الدولہ سے مدد حاصل کر کے مرہٹوں کو شکست دے دی۔ غازی الدین خاں کی جب یہ چال کارگر نہ ہوئی اور خطرہ ہوا کہ نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ یعنی اودھ اور روہیل کھنڈ کی طاقتیں جس طرح مرہٹوں کے مقابلہ میں متحد ہو گئی تھیں اسی اتحاد سے وہ دہلی پر قبضہ کر کے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیں گی، اور غازی الدین خاں کو آٹے کے بال کی طرح الگ نکال کر پھینک دیں گی تو غازی الدین خاں کے لئے سہل صورت یہ تھی کہ نخل آرزو ہی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ چنانچہ اُس نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی اور اس میں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کو اس کی بھینٹ چڑھنا پڑا۔

ان تمام حوادث اور طوفانوں کے باوجود مغل بادشاہ اُس فرض سے غافل نہیں رہا جو جنگِ پلاسی کے بعد تاج دارِ ہند کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوا تھا۔ مگر بد قسمتی یہ بھی کہ یہی سرطان جو جسمِ سلطنت کے ایک ایک عضو کو معطل کر رہا تھا، اوّل اُس فرض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہا۔ پھر یہی مرض دفاعی جدّ و جہد کی ناکامی کا سبب بنا۔

تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ مرہٹوں کے سیلاب کو دہلی تک[1] پہنچانے والا نظام الملک آصف جاہ[2] اوّل تھا جب کہ بنگال و بہار میں ہندوستانیوں کی حکومت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کامیاب ہوگیا۔ اس تعدّی اور دست درازی سے متاثر ہو کر نجیب الدولہ وغیرہ نے ابدالی سے امداد کی درخواست کی۔ سیر المتاخرین کے الفاظ یہ ہیں :

"نجیب الدولہ و جمیع افاغنہ (روہیلہ) و راجہ ہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک (غازی الدین خاں)، بجاں آمدہ عرائض بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ استدعا ورود او در ہندوستان کردند الخ"

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ احمد شاہ ابدالی کو بُلانے والے صرف مسلمان ہی نہیں تھے راجہ ہائے ہند بھی تھے۔ اسی طرح ابدالی کے مقابلہ پر صرف مرہٹہ ہی نہیں بلکہ غازی الدین خاں نائب نظام الملک آصف جاہ والی حیدر آباد بھی تھا۔ اسی بنا پر اس کو نہ ہندو مسلم جنگ کہنا صحیح ہے، نہ شیعہ سُنّی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے دو گروہوں کا تصادم تھا۔ محمّد میاں

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] پہلے صفحات کے حاشیہ میں گذر چکا ہے کہ برہان الملک وغیرہ کو زک دینے اور بادشاہ پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے نظام الملک آصف جاہ اوّل نے مرہٹوں کو دہلی کی طرف بڑھایا اور پھر اس دباؤ میں بادشاہ سے وکالتِ مطلقہ کا منصب حاصل کیا۔

[2] اصل نام قمر الدین خاں۔ عرصہ تک چین قلیج خان بہادر کے خطاب سے مخاطب رہے۔ پھر فتح جنگ، نظام الملک آصف جاہ کے شاہی خطابات سے سرفراز ہوئے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ختم ہو کر انگریزی اقتدار بڑھ رہا تھا۔ جس ذاتِ گرامی نے یہ کھیل کھیلا کہ مرہٹوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اُن کے دادا عابد خاں تھے۔ سمرقند (تاتار) سے تین کوس کے فاصلہ پر موضع علی آباد میں پیدا ہوئے۔ پھر تحصیلِ علم کے بعد وہ درجہ پایا کہ شیخ الاسلام کہے جانے لگے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے زمانہ میں دہلی آئے منصب و جاگیر حاصل کیا۔ پھر عالمگیر کا تقرب و اعتماد حاصل کر کے ماہولی کے قلعدار بنے۔ قلعہ گولکنڈہ پر جب عالمگیر حملہ کر رہا تھا تو عابد خاں توپ کے گولے سے زخمی ہوئے اور ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۶ء کو وفات پا گئے۔ ان کے ضبط و تحمل اور استقلال کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد جملۃ الملک اسد خاں مزاج پرسی کو پہنچے تو اس وقت جراح شانے میں سے ہڈی کی کرچیں نکال رہا تھا، اور وہ چار زانو بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے اور خندہ پیشانی سے کہہ رہے تھے کہ جراح اچھا کاریگر ہے مگر اس زخم سے شفایاب نہ ہو سکے۔ نظام الملک آصف جاہ کے والد میر شہاب الدین خاں تھے۔ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ معروف بخان فیروز جنگ آبائی وطن تاتار میں پیدا ہوئے اور جب عابد خان ہندوستان پہنچ کر شاہی منصب پر فائز ہو گئے تو انہوں نے اس فرزند دلبند کو بھی بلا لیا ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہندوستان پہنچ کر شاہی ملازمت سے باریاب ہو کر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوئے ۱۱۰۰ھ میں طاعون کی وبا پھیلی تو ان پر طاعون کا یہ اثر ہوا کہ نابینا ہو گئے۔ پھر بینائی آخر عمر تک واپس نہ آسکی لیکن شاہی منصب کے فرائض حتیٰ کہ فوجوں کی کمان آخر عمر تک کرتے رہے۔ استسقا کے مرض میں مبتلا ہو کر احمد آباد میں ۷ ارشوال ۱۱۲۲ھ کو اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اپنی زندگی میں دہلی میں اجمیری دروازہ سے باہر مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اُسی کے احاطہ میں مقبرہ بنوایا تھا۔ وفات ہوئی تو جنازہ احمد آباد سے دہلی لایا گیا اور اسی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اسی کے قرب میں کہیں شاہ وجیہ الدین صاحب کا مزار بھی تھا جو اب ناپید ہے۔ یہی مدرسہ اب دہلی کالج کے نام سے موسوم ہے۔ میر شہاب الدین کا نکاح شاہ جہاں بادشاہ کے مشہور وزیر علامی سعد اللہ خاں کی لڑکی سے ہوا تھا۔ نظام الملک آصف جاہ اسی کے بطن سے تھے۔ ۷۹ سال کی زندگی گذار کر ۴ جمادی الاخری ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ مرنے کے بعد مغفرت مآب خطاب ہوا، اور خلدِ منزلت تاریخ رحلت ہے۔

۱۱۶۱ھ

Marfat.com

نوابانِ اودھ[1] اور فرمانروایانِ روہیل کھنڈ[2] پر حملہ آور کرکے اور پھر پنجاب[3] کا راستہ بتا کر

---

[1] نوابانِ اودھ جو بعد میں شاہانِ اودھ کہلائے۔ اُن کے مورث، برہان الملک نواب سعادت خاں کا اصل نام محمد امین تھا۔ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ عالمگیر کے لڑکے شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے زمانۂ حکومت میں دہلی پہنچ کر شاہی خدمت پر فائز ہوئے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں ساداتِ بارہ کے سرغنہ "نواب حسین علی خاں" کے قتل کی سازش میں بادشاہ کے مددگار رہے۔ پھر حسین علی خاں مقتول کے بھائی قطب الملک عبداللہ خاں سے مقابلہ اور جنگ میں مستعدی سے کام لے کر فتح حاصل کی۔ اسی صلہ میں پہلے صوبہ اکبر آباد کی حکومت پر فائز ہوئے۔ پھر صوبہ اودھ کی حکومت آپ کے سپرد ہوئی اور مرکزی حکومت کی کمزوریوں کے باعث استقلال کا موقع ملا۔ نادر شاہ کی آمد آپ کی دعوت پر اور دہلی کی لوٹ مار آپ کے مشورہ سے ہوئی اور اسی دوران میں ۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ روایت ہے کہ جب برہان الملک اودھ کی صوبہ داری سنبھالنے کے لئے جا رہے تھے اور فرخ آباد سے کشتی کے ذریعہ دریائے گنگا کو عبور کر رہے تھے تو سیلاب گنگا کی موجوں میں سے ایک مچھلی جست کر کے نواب کے دامن میں آ پڑی۔ نواب نے اس کو نیک فال سمجھا۔ اس مچھلی کو محفوظ رکھا۔ اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں واجد علی شاہ کے دور تک عجائب خانہ میں محفوظ تھیں غالباً یہی تصوّر ہے جس کا اثر نہ صرف قیصر باغ وغیرہ کی تصویروں میں اب تک نمایاں ہے بلکہ حکومت اودھ کے سکّوں اور سرکاری کاغذات میں بھی مچھلی کی تصویر نے نمایاں جگہ حاصل کی۔ برہان الملک کے بعد اس کی چار لڑکیاں وارث بنیں۔ سب سے بڑی لڑکی برہان الملک کے بھانجے مرزا محمد مقیم سے منسوب تھی۔ برہان الملک کے بعد مرزا محمد مقیم اُن کے جانشین ہوئے صفدر جنگ خطاب اور عہدہ وزارت دربار دہلی سے حاصل کیا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء کو وفات ہوئی۔ ان کے بعد اُن کا لڑکا شجاع الدولہ جانشین ہوا۔

[2] یعنی نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں، احمد خاں بنگش اور دوندے خاں وغیرہ۔

[3] یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابدالی کے اس حملہ کا محرک اور اصل سبب (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ابدالی کے مقابلہ میں کھڑا کیا۔ وہ انہیں نظام الملک آصف جاہ کے سب سے بڑے فرزند عماد الملک غازی الدّین[1] خاں تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ تھا کہ مرہٹوں نے ابدالی کے گورنر کو مع اس کی سکھ فوج کے شکست دے کر مئی ۱۷۵۸ء میں دریائے اٹک تک تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابدالی کا گورنر اس کا لڑکا تیمور شاہ تھا جس کی امداد کے لئے ابدالی نے ایک پٹھان تجربہ کار سردار جہان خاں کو مقرر کیا تھا۔ باقی یہ بات کہ مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیوں کیا تھا۔ غازی الدین خاں کی تحریک کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آدینہ بیگ جس کو جہان خاں نے دوآبہ کی حکومت سے معزول کر دیا تھا، اُس نے بھی جہان خاں کے مقابلہ کے لئے مرہٹوں سے مدد مانگی تھی۔ چنانچہ بقول طباطبائی:

رگھوناتھ راؤ و شمشیر بہادر، برادران بالاجی راؤ مع ہولکر وغیرہ مرہٹہ کہ در جوار شاہجہان آباد (دہلی) رسیدہ انتظار سانحہ مے کشیدند۔ آدینہ بیگ نوشتہ ہار متواتر فرستادہ آنہارا بطرف لاہور بمدد خود طلبید۔ (سیر المتاخرین)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اصل نام میر محمد پناہ، فیروز جنگ اور غازی الدّین خاں خطاب تھے یعنی دادا کے خطابات پوتے کو بھی مل گئے تھے۔ یہ میر محمد پناہ، غازی الدّین خاں ۱۱۲۱ھ مطابق ۱۷۰۹ء میں یعنی جب نظام الملک آصف جاہ اوّل کی وفات ہوئی، دہلی میں امیر الامراء تھے۔ نظام الملک کے دوسرے فرزند میر احمد خاں ناصر جنگ باپ کی جگہ دکن میں مسند نشیں ہوئے۔ ۱۶ محرم ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۰ء کو ناصر جنگ میدانِ جنگ میں مارے گئے تو نظام الملک کی وصیّت کے بموجب نظام الملک کا نواسہ سعد اللہ خاں مظفر جنگ مسند نشین ہوا۔ جو فرانسیسیوں کا دوست تھا مگر دو ماہ بعد ۱۷ ربیع الاوّل ۱۱۶۴ھ (جنوری ۱۷۵۱ء) کو یہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ تب نظام الملک آصفجاہ کے تیسرے لڑکے میر محمد خاں مسند نشین ہوئے۔ آصف الدولہ صلابت جنگ وغیرہ خطابات ہوئے۔ تیسرے بھائی کی مسند نشینی کے بعد غازی الدّین خاں کو بھی جوش آیا اور ابدالی کے معرکہ اور مرہٹوں کی شکست کے بعد دہلی میں کچھ امیر الامرائی کا مزہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا بادشاہ سے صوبہ داری دکن کی سند لے کر انہی مرہٹوں کی عصائے پیری کے سہارے باپ کی ریاست پر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اور موقع شناسی کی داد دیجئے کہ قیامت خیز معرکۂ پانی پت[1] کے وقت سیاسی دین کے یہ مفاد پرست غازی، بقول شمس العلماء[2] ذکاء اللہ خاں مرحوم:

"خود اپنی جان بچاکر اپنے دوست مہاراجہ بھرت پور (سورج مل جاٹ) کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے"۔

بہرحال واقعات کی ترتیب یہ ہے کہ جنگِ پلاسی سے تقریباً چھ ماہ پہلے جمادی الاوّل ۱۱۷۰ھ (دسمبر ۱۷۵۶ء، جنوری ۱۷۵۷ء) میں جب احمد شاہ ابدالی پانچویں حملہ سے کامیاب واپس ہو رہا تھا، اُس نے نجیب خاں روہیلہ کو امیر الامراء کا منصب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قبضہ کرنے کے لئے دکن کا رُخ کیا۔ قلعہ آسیر، برہان پور اور اورنگ آباد فتح بھی کرلیا۔ مگر ابھی فیصلہ کن جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ موت کا نقارہ بج گیا۔ ۷ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ (اکتوبر ۱۷۵۲ء) کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور یکایک دامنِ زندگی چاک ہوگیا۔ مگر نیرنگیٔ قسمت دیکھئے۔ سید محمد خاں آصف الدولہ صلابت جنگ کو بھی دستِ قضا نے مہلت نہیں دی۔ بڑے بھائی کے حملہ سے نجات ملی تھی تو چھوٹے بھائی میر نظام علی خاں نے سازش کرکے معزول کردیا اور قلعہ بیدر میں نظر بند کردیا۔ جہاں زندگی کے باقی دن (ایک سال تین ماہ چھ روز) گذار کر ۲۰ ربیع الاوّل ۱۱۷۷ھ، ستمبر ۱۷۶۳ء میں قیدِ زندگی سے نجات پائی۔ اب میر نظام علی کو یہ حکومت ایسی راس آئی کہ ۴۲ برس تک فرمانروائی کرتے رہے۔ سلطان ٹیپو، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے معرکے بہت کچھ پیش آئے۔ سیاسی چالیں بھی رنگ برنگ اختیار کرنی پڑیں مگر تختِ حکومت سے علیحدگی مرنے کے بعد ہی ہوئی۔ ۴۲ برس ریاست کرکے ساڑھے ستّر سال کی عمر میں ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ، ۷ اگست ۱۸۰۳ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے انتقال پر نظام الملک آصف جاہ اوّل کے لڑکوں کا سلسلہ ختم ہوا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ۶ جمادی الاخریٰ ۱۱۷۴ھ (تاریخ ہندوستان ج ۹) (۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء) روز شنبہ۔ [2] طباطبائی کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے "عماد الملک (غازی الدین خاں) بر جانِ خود ترسیدہ نزدیک سورج مل جاٹ، بنا بر ادراک انفصال قضیہ تنازعتِ مرہٹہ و ابدالی و انتظار مشاہدہ پایانِ این مشاجرہ۔ کہ تا بکجا انجامد۔ رفتہ نشست و پناہ بقلاع مستحکمہ او برد (سیر المتاخرین)

Marfat.com

اور نجیب الدولہ کا خطاب عطا کر کے حکومت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔ یعنی مغل سلطنت کو روہیلہ پٹھانوں کی نگرانی میں دے دیا۔

ابدالی کا یہ اقدام بہت مناسب تھا کہ اُس نے سلطنتِ ہند کی نگرانی ایک ترقی پذیر طاقت کے حوالہ کی۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ یہ ترقی پذیر طاقت سیاسی گٹھ جوڑ میں تنہا تھی نہ مرہٹوں اور جاٹوں سے اُس کا رابطہ تھا، نہ انگریزوں سے دید شنید تھی اور اس تنہائی کے باوجود اندرونی رقابتوں[1] میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک سال ہی گذرا تھا کہ غازی الدین خاں نے اپنے سیاسی گٹھ جوڑ سے نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال باہر کیا۔ اُس نے بنگش خاندان کو جو روہیلوں کی طاقت کا ایک مضبوط رُکن تھا اپنے ساتھ ملایا اور نجیب الدولہ کو شکست دے دی۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے :

"دہلی سے جس وقت احمد شاہ ابدالی روانہ ہُوا تو غازی الدین خاں فرخ آباد میں تھا۔ اُس نے نجیب الدولہ کی مخالفت کے سبب سے احمد خاں بنگش (والئ فرخ آباد) کو امیر الامراء مقرر کیا اور شاہجہان آباد (دہلی) کی طرف چلا۔ مگر وہ یہ جانتا تھا کہ نجیب الدولہ کو معطل بٹھانا کچھ اکیلے کا کام نہیں ہے۔ آج کل مرہٹوں کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اس لئے اُس نے رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ کو دکن سے بلایا اور شاہجہان آباد کا محاصرہ کیا۔ عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ محصور ہو گئے ستائیس روز تک لڑائی توپ گولہ سے ہوتی رہی۔ آخر "ہلکر" کو بادشاہ

---

[1] ان رقابتوں کے سبب سے روہیلوں کی طاقت تین حصوں میں منقسم تھی۔ ۱: حافظ رحمت خاں اور ان کے ساتھی دوندے خاں وغیرہ۔ دار الحکومت آنولہ، جو اب ضلع بریلی کا ایک قصبہ ہے اور مرکزی مقامات بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، شاہجہان پور وغیرہ۔ ۲: نجیب الدولہ۔ دار الحکومت نجیب آباد۔ سہارن پور وغیرہ مرکزی مقامات۔ ۳: احمد خاں بنگش۔ دار الحکومت فرخ آباد۔ ایٹہ کاس گنج وغیرہ مرکزی مقامات

Marfat.com

نے بہت سی رشوت دی۔ جب محاصرہ سے نجات ہوئی۔

عماد الملک (غازی الدّین خاں) نے نہایت آسانی سے نجیب الدولہ کو شہر سے نکال دیا۔ وہ اپنی جاگیر میں (سہارنپور، چاندپور، مدینہ، موجودہ بجنور) چلا گیا۔ اور اُس نے باقی افسروں کو بھی جو بادشاہ کے طرف دار تھے، نظر بند رکھا۔[1]

مختصر یہ ہے کہ جنگ پلاسی کے وقت مئی ۱۷۵۷ء (رمضان و شوال ۱۱۷۰ھ) میں سلطنتِ مغلیہ کی اعلیٰ ذمّہ داری نجیب الدولہ کے سپرد تھی۔ نجیب الدولہ صرف اقتدار ہی کا شوقین نہیں تھا بلکہ اُس کو غیرتِ ملّی اور ملکی حمیّت کا جوہر بھی عطا ہُوا تھا۔ اُس نے بادشاہ کے مشورہ سے ولی عہد یعنی شاہزادہ "عالی گوہر" کو جو بعد میں شاہ عالم کے خطاب سے مشہور ہُوا، جھجر دہانسی وغیرہ کی جاگیر عطا کر کے دہلی سے روانہ کر دیا۔ اور اُس کو شاہی پروانہ دلوا دیا کہ:

شما وارثِ ملکید، تا جائیکہ	تم ملک کے وارث ہو جہاں تک
توانید عملِ خود نمائید[2]	کر سکو اپنی عمل داری قائم کرو۔

اس غیر اطمینانی حالت میں کہ غازی الدّین خاں کا خطرہ لگا ہُوا تھا، جو چند ماہ بعد پیش آگیا، نجیب الدولہ اور بادشاہ کا یہ اقدام حبِّ وطن، ملکی غیرت اور حمیّت کا نمایاں ثبوت ہے۔

بہر حال نجیب الدولہ کے دَورِ حکومت کی یہ چاندنی چند روزہ تھی۔ پھر دہی

---

[1] تاریخ ہندوستان ص۲۹۸ ج ۹۔ [2] طباطبائی صاحب فرماتے ہیں: "چوں عالمگیر ثانی ونجیب الدولہ از عماد الملک (غازی الدّین خاں) مطمئن نبودند شاہزادہ عالی گہر را کہ خلفِ اکبر بادشاہ مذکور و ولی عہد بود، بعد رفتن شاہ ابدالی بقندھار و قبل از ورود عماد الملک بہ شاہجہاں آباد محالات ہانسی وغیرہ در جاگیر دادہ مرخص کردند و گفتند کہ شما وارثِ ملک ہستید تا جائیکہ توانید عمل خود نمائید (سیر المتاخرین)۔

Marfat.com

غازی الدّین خاں کی اندھیری رات شروع ہوئی۔ تو وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ وارثِ تاج و تخت یعنی مغل بادشاہ کا ولی عہد اس کے پنجۂ اقتدار سے آزاد رہے۔ اُس نے بادشاہ پر زور ڈالا اور شاہزادہ کے نام دہلی واپس پہنچنے کے احکام صادر کرا دیئے۔ چارو ناچار شاہزادہ دہلی واپس ہوا۔ علی مردان خاں کے قلعہ نما محل میں فروکش ہوا۔

غازی الدّین خاں اس فکر میں تھا کہ شاہزادہ کو گرفتار کرکے جیل خانہ میں[1] ڈال دے تاکہ اُس کو پوری طرح اطمینان ہو۔ چنانچہ اُس نے فوج بھیج کر محل کا محاصرہ کرا لیا۔ مگر شاہزادہ نے بڑی ہمّت سے کام لیا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں[2] کی مدد سے رات کی اندھیری میں محل کے روشندان سے کودا، دیواروں کو پھاندا اور گھوڑوں کو دریا میں ڈال کر جمنا پار کی۔ مجنوں کے ٹیلہ تک پہنچا۔ جہاں ایک مرہٹہ راجہ کا لشکر پڑا ہوا تھا۔ اُس نے شاہزادہ کی بہت آؤ بھگت کی اور بڑے اعزاز و احترام سے فرخ نگر تک پہنچا دیا۔ یہاں موسیٰ خاں بلوچ پسر کامگار خاں نے کئی ہزار روپیہ پیش کش کی۔ یہ مرہٹہ سردار تو علیحدہ ہو گیا، اور شاہزادہ سہارنپور نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔ آٹھ مہینہ تک وہ یہاں رہا۔ اس زمانہ میں بنگالہ میں انقلابِ عظیم برپا تھا اور میر جعفر انگریزوں کی حمایت سے بنگالہ پر قابض ہو گیا تھا۔ اس لئے نجیب الدولہ نے شاہزادہ کو سمجھایا کہ وہ بنگالہ جائے[3]۔

---

[1] جیل خانہ میں ڈلوانے کے بعد وہ مروا بھی دیتا کیونکہ دو شاہزادے یعنی عالی گوہر کے چھوٹے بھائی اس کے پاس پہلے سے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو ولی عہد بنا کر بادشاہ گری کا شعبدہ دکھا سکتا تھا۔ [2] جن میں ایک راجہ رام ناتھ، دوسرے جعفر اور تیسرے سید علی اعظم خاں جو شاہزادہ کی آڑ بن کر اس موقع پر شہید ہو گئے۔ [3] تاریخ ہندوستان از شمس العلماء ذکاء اللہ خاں سیر المتاخرین کی فارسی عبارت ملاحظہ فرمائیے "چوں در آں ایام انقلابِ عظیم (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بادشاہ کا قتل شاہزادہ نکل گیا اور جیسا کہ آگے آئے گا۔ وہ مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، الہ آباد ہوتا ہوا پٹنہ پہنچا اور انگریزوں سے جنگ شروع کر دی۔ مگر بادشاہ کی یہ جرأت جان لیوا ثابت ہوئی۔

غازی الدّین خاں جو صرف وزارتِ عظمیٰ نہیں بلکہ بادشاہ گری کے شعبدے[1] بھی دکھا رہا تھا وہ اس بے زبان و مجبور بادشاہ کے قتل کے درپے ہوا، اور ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (نومبر ۱۷۵۹ء) میں اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو گیا[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) در بنگالہ روئیداد میر محمد جعفر خاں باعانت جماعت انگلشیہ تسلط یافتہ بود۔ شاہزادہ را دلالت بتسخیر بنگالہ نمود و زاد راہے گذرانیدہ مرخص نمود۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] صحیح بات یہ ہے کہ سادات بارہ کے زوال کے بعد یہ شعبدہ بازی نظام الملک آصف جاہ اور اُن کے نائب و فرزند غازی الدّین خاں نے کی۔ چنانچہ چند سال پہلے (۱۰ر شعبان ۱۱۶۷ھ، جولائی ۱۷۵۴ء میں) احمد شاہ بادشاہ کو معزول کر کے اعز الدّین پسر معز الدین جہاندار شاہ کو تخت نشین کر کے عالمگیر ثانی کا خطاب دے چکا تھا۔ ایک مہینہ کے بعد معزول بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھیں نکلوا کر اندھا بھی کر دیا تھا کہ چشم عبرت زمانہ کی نیرنگیوں کا تماشا بھی نہ کر سکے۔

[2] سید الطاف علی بی اے علیگ مصنف حیات حافظ رحمت خاں کے الفاظ میں اس دردناک واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے۔ غازی الدّین خاں کو خطرہ تھا کہ احمد شاہ درانی کے آنے پر بادشاہ عالمگیر ثانی میری تمام بدکرداریوں کی اُن سے شکایت کریں گے اور نجیب الدولہ کو دوبارہ عروج نصیب ہوگا۔ اس لئے انتظام الدولہ خانخاناں اور بادشاہ کو قتل کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ اس زمانہ میں بے چارہ، بیکس بادشاہ عالمگیر ثانی سلطنت کے کاموں سے ہاتھ اُٹھا کر خلوت نشینی میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ فقراء پر اعتقاد تھا۔ ایک روز غازی الدّین خاں کے شریکِ سازش مہدی علی خاں نے بادشاہ سے کہا کہ ایک قابلِ زیارت درویش کامل فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کے کشف و کرامات کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ بھولا بھالا بادشاہ مہدی علی خاں کی افتراپردازی سے بے خبر تھا۔ تنہا فقیر باکرامت کی زیارت کو روانہ ہو گیا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ملک کا احساس غازی الدین خاں نے بادشاہ کو قتل کرانے کے بعد اُسی روز اُس کی جگہ بادشاہ اورنگ زیب کے ایک پوتے (محی السنہ بن کام بخش بن عالمگیر) کو تخت پر بٹھا کر شاہجہاں ثانی کا خطاب دیا۔ مگر اس بادشاہ کو کسی نے بادشاہ نہیں مانا۔ شاہزادہ عالی گوہر ہی کو بادشاہ تسلیم کیا گیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ) اس تفصیل کے بعد سلطنتِ مغلیہ اور ہندوستان کے عوام کی طرف سے یہ کہنے کا موقع ہے کہ ؏

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خُوب کیا

اس کے بعد تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس کے کچھ اشارات آگے آئیں گے مگر اس موقع پر اس طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ احمد شاہ ابدالی کا وُہ مشہور حملہ جس میں مرہٹے تباہ ہوئے، صرف مرہٹوں کے خلاف نہیں تھا بلکہ وہ غازی الدین کے خلاف تھا جس کی چیرہ دستیاں اس حد تک بڑھ چکی تھیں، کہ امراء اور وزراء تو درکنار، خود بادشاہ محفوظ نہیں رہے تھے۔ چنانچہ اُس مرتبہ صرف نجیب الدولہ یا پٹھانوں نے نہیں بلکہ "میر غلام حسین خاں طباطبائی" کی شہادت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے راجہ بھی ابدالی کو بُلانے میں شریک تھے۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جب پہلے دروازہ پر پہنچا تو مہدی علی خاں نے تلوار ہاتھ سے لے لی۔ پردہ اُٹھا کر اندر لے گیا، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مرزا بابر بادشاہ کا داماد ساتھ تھا۔ اُس نے تلوار کھینچ کر ایک آدمی کو زخمی کیا مگر اس کو چند آدمیوں نے مغلوب کر کے اور بادشاہ کے محافہ میں بٹھا کر قلعہ سلیم روانہ کر دیا۔ بادشاہ اندر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ موت کے فرشتوں سے مقابلہ ہے۔ چار ازبک ننگی تلواریں لے کر بادشاہ پر پل پڑے۔ سر کو تن سے جُدا کر دیا اور تنِ بے سر کو جمنا کے ریت پر پھینک دیا۔ بدمعاشوں نے ظلم کیا کہ لاش کے کپڑے اُتار کر لے گئے۔ کئی روز بعد بادشاہ کی لاش ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی۔

Marfat.com

"نجیب الدولہ و جمیع افاغنہ و راجہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک (غازی الدین خاں) بجاں آمدہ عرائض بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ استدعا ورود اور در حدود ہندوستان کردند"۔ (سیر المتاخرین)

اسی بنا پر ہم ابدالی کے اس معرکہ کو نہ ہندو مسلم جنگ قرار دیتے ہیں نہ شیعہ سُنّی مناقشہ۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے دو گروہوں کا تصادم جو عہدِ قدیم سے چلا آرہا تھا۔ اس وقت اس صورت میں ظہور پذیر ہوا۔[1]

ہم نے تاریخ کے اس باب کو جس پر غلط بیانیوں کی تہ بتہ گرد چڑھی ہوئی تھی جھاڑ پونچھ کر کسی قدر صفائی سے بیان کیا۔ اب آئندہ نہ ہمارے پاس طوالتِ تحریر کے لئے فرصت ہے، نہ ناظرینِ کتاب کو اتنی مہلت ہوگی۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ شاہ عالم کے کچھ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

عالی گوہر دہلی سے روانگی کے بعد پہلے گذر چکا ہے کہ شاہزادہ عالی گوہر دہلی سے نکل کر نجیب الدولہ کے پاس سہارن پور پہنچا۔ جہاں تقریباً آٹھ ماہ قیام کیا نجیب الدولہ نے اس عرصہ میں شاہزادہ کے شایان شان سامانِ سفر تیار کیا اور بصد احترام اس کو بنگالہ کی طرف رخصت کیا۔ شاہزادہ سہارنپور سے چل کر نجیب آباد مراد آباد، بریلی ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ شجاع الدولہ نے شاہزادہ کا پورا احترام و اکرام کیا۔ مگر شاہزادہ کی جدّ و جہد میں صرف اتنی ہی شرکت کی کہ ڈھائی تین لاکھ روپے نقد اور تحائف کی شکل میں پیش کر دیئے۔

شاہزادہ لکھنؤ سے الہ آباد پہنچا۔ جہاں محمد قلی خاں[2] گورنر تھا۔ وہ شاہزادہ

---

[1] غازی الدین خاں اگرچہ مسلمان تھا مگر رئیسِ دکن کا نائب و نمائندہ ہونے کے سبب سے مرہٹوں کا شریک تھا۔ [2] محمد قلی خاں شجاع الدولہ کا بھائی تھا۔ شجاع الدولہ کے والد مرزا مقیم جو بعد میں صفدر جنگ ہوئے اور محمد قلی خاں کے والد مرزا محمد محسن (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کی امداد کے لئے کمربستہ[1] ہوگیا۔ اُس نے شاہزادہ سے بہار و بنگال کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کیا اور بہت بڑی فوج لے کر شاہزادہ کے ساتھ بہار روانہ ہوگیا۔ اور عظیم آباد پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا[2]۔ اسی سفر میں جب وہ بنگال جاتے ہوئے ربیع الثانی، ۱۱۷۳ھ، نومبر ۱۷۵۹ء میں کرم باسا سے پار اُترا۔ اُس کے والد عالمگیر ثانی کے قتل کا حادثہ پیش آیا۔ جس کی خبر اس کو ایک ماہ بعد بہار کے ایک گاؤں کاتونی[3] میں ملی۔ شاہزادہ نے اُسی وقت تختِ سلطنت[4] پر جلوس کیا اور شاہ عالم خطاب اختیار کیا[5]۔

اب شجاع الدولہ کو جو دربارِ دہلی میں وزارت کا مرتبہ رکھتا تھا اور اسی بنا پر نواب وزیر شجاع الدولہ کہا جاتا تھا۔ خطرہ ہوا کہ محمد قلی خاں شاہزادہ سے جو اب شہنشاہ شاہ عالم ہوگیا تھا، قلمدانِ وزارت حاصل کرے گا تو اُس نے محمد قلی خاں کے علاقہ میں اقدام کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، اور محمد قلی خاں کے اہل و عیال کو نظر بند

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صفدر جنگ کے بڑے بھائی برہان الملک میر محمد امین ان دونوں کے ماموں تھے۔ چونکہ ان دونوں کی والدہ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا تو ماموں ہی نے انکی پرورش کی تھی۔ پھر برہان الملک نے اپنی لڑکی کا نکاح مرزا محمد مقیم سے کر دیا تھا۔ تو مرزا محمد مقیم صفدر جنگ داماد بھی ہوگئے تھے۔ (قیصر التواریخ جلد اوّل)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شجاع الدولہ نے اس کو آمادہ کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محمد قلی خاں الہ آباد میں رہے۔ وجہ یہ تھی کہ صفدر جنگ کی وفات کے بعد ایک جماعت کی کوشش یہ تھی کہ شجاع الدولہ مسند نشین نہ ہو بلکہ محمد قلی خاں کو یہ منصب سپرد ہو۔ اسی بنا پر شجاع الدولہ، محمد قلی خاں کو اپنا حریف سمجھتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے۔ [2] بظاہر صحیح یہ ہے کہ فتح نہیں کیا تھا لیکن مورچے اس طرح قائم کئے تھے کہ فتح یقینی تھی کہ دفعتہً اس کو اپنے ملک کے خلفشار کا علم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں کی تازہ دم فوج شہر کی حفاظت کے لئے آرہی ہے تو وہ بدحواس ہو کر واپس روانہ ہوگیا۔ (تاریخ اودھ ج ۲)۔ [3] تاریخ ہندوستان اور سیر المتاخرین۔ [4] یہ تخت سلطنت (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کر دیا اور اپنے خاص دوست راجہ بینی بہادر اور راجہ بلونت سنگھ کو مامور کر دیا، کہ جیسے ہی محمد قلی خاں واپس آئے، اُس کو گرفتار کر لیا جائے۔

محمد قلی خاں اس تباہی کی خبر پاتے ہی واپس ہوا "موشیر لاس" فرانسیسی جرنیل جو اس وقت اُن کے ساتھ تھا، اُس نے بہت منع کیا مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور اپنے علاقہ کی طرف چلا۔ لیکن جیسے ہی اپنے قلمرو کے حدود میں داخل ہوا گرفتار کر لیا گیا[1]۔ اور جب شجاع الدولہ، احمد شاہ ابدالی کی مدد کے لئے پانی پت جانے لگا، تو اُس کے قتل کا حکم دے گیا۔ بہر حال محمد قلی خاں کے قتل کے بعد بھی شاہزادہ نے ہمّت نہیں ہاری۔ اب اس کے ساتھ موشیر لاس[2] اور کامگار خاں و دلیر خاں وغیرہ افغان سردار تھے۔ جن کی مدد سے عظیم آباد پر حملہ کیا۔ مگر حالات نے مساعدت نہیں کی۔ ناچار شکست کھا کر واپس ہوا۔ یہی وہ دور ہے کہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی مشہور معرکہ سر کر رہا تھا۔

بہر حال احمد شاہ درانی تو آخری نوازش کر کے شاہ عالم کو بادشاہِ ہند، شجاع الدولہ کو وزیر اور نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا گیا اور جب تک شاہ عالم دہلی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کیا تھا؟ کھانے کی دو میزیں تھیں جن کو ملا کر اُن کے اُوپر قالین بچھا دیا گیا تھا

۵ اور حکم دیا کہ تاریخِ انتقال سے میری تاریخ جلوس شمار ہو (تاریخ ہندوستان ج ۹)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُس نے خود یہ رائے دی کہ مجھے شجاع الدولہ کے پاس لکھنؤ جانے دو۔ اس کو یہ اعتماد تھا کہ جیسے ہی شجاع الدولہ سے منہ در منہ گفتگو ہوگی ساری کدورت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی فوج کو الہ آباد چھوڑا، اور چند ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچا۔ شجاع الدولہ نے بڑے تپاک سے معانقہ کیا۔ مگر محمد قلی خاں معانقہ کے بعد پلٹا تو وہ گرفتار تھا۔ اور جب شجاع الدولہ پانی پت جانے لگا، تو اس کے قتل کا حکم دے گیا۔ راجہ بینی بہادر نے اس کا تمام سامان و اسباب جو الہ آباد میں تھا لوٹ لیا۔ فوج کو بھی تباہ کر دیا۔ (تاریخ اودھ ج ۲) [2] فرانسیسی جرنیل۔

واپس پہنچے، اُس کے بیٹے "جواں بخت" کو نائب السلطنت مقرر کر گیا۔ مگر

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل

بادشاہ شاہ عالم کی حالت یہ تھی کہ پے در پے شکستوں کے بعد وہ شجاع الدولہ کے سہارے کا محتاج تھا۔ اسی زمانہ میں میر قاسم (داماد میر جعفر) جو بہار کا خود مختار حاکم تھا۔ اور چونکہ انگریزوں نے بدعہدی کر کے وہ وعدے جو سراج الدولہ کو ختم کر دینے کی سازش کے وقت کئے گئے تھے، پورے نہیں کئے تھے، تو میر قاسم انگریزوں سے لڑ بیٹھا اور پھر جب ان سفید فام دوستوں نے شکست دے کر فرار پر مجبور کر دیا —— تو شجاع الدولہ کے دامن میں پناہ لینے اودھ پہنچ گیا۔

شجاع الدولہ محمد قلی خاں کو قتل کرانے کے بعد بہار پر قبضہ کرنے کا وہی خواب دیکھ رہا تھا، جو محمد قلی خاں نے دیکھے تھے۔ اُس نے میر قاسم کی امداد کے نام پر بادشاہ کو ساتھ لیا اور بہار کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ عالم اور شجاع الدولہ ٹڈی دل فوج اور شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ بہار کی طرف کوچ کر رہے تھے اور عقل و دانش ان کے منصوبوں کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ کیونکہ نہ فوج میں نظم و ضبط تھا، نہ سربراہوں میں اخلاص۔ فوج ایک بے تحاشا بھیڑ تھی۔ جدھر سے گذرتی، آس پاس کے دیہات بھی تباہ کر ڈالتی۔ گاؤں والے لشکر کی دست درازیوں سے تنگ آکر انگریزوں کے واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے۔[1]

خود فوج کے اندر ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتا۔ ایک دوسرے کو لوٹ لیتا اور کوئی نہیں تھا جو شنوائی کرتا۔[2]

قائدینِ فوج اور رہنماؤں کا دماغی توازن مفقود تھا۔ میر قاسم احساس کہتری میں مبتلا، شجاع الدولہ بادشاہ کو بارِ گراں سمجھتا تھا، اور بادشاہ کو یہ تصور کہ وہ شجاع الدولہ کی حراست میں ہے۔ سازشوں کا یہ عالم کہ شجاع الدولہ کی فوج میں بینی بہادر اور

---

[1] عماد السعادت، قیصر التواریخ و تاریخ اودھ وغیرہ [2] قیصر التواریخ و عماد السعادت وغیرہ

Marfat.com

راجہ بلونت انگریزوں سے ملے ہوئے[1]۔

بادشاہ کا مقرب خصوصی "نجف خاں" جو محمد قلی خاں[2] مقتول کا سالہ تھا، انگریزوں کا آلہ کار۔ نتیجہ وہی ہوا جو قانونِ فطرت کے مطابق ایسے فریب خوردہ اقدام کا ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی ٹڈی دل فوج شکست کھا کر منتشر ہوئی۔ میر قاسم خاطر برداشتہ ہو کر شجاع الدولہ سے علیحدہ ہوا اور ابھی جنگ کا آخری فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ شاہ عالم نے شجاع الدولہ کی حراست سے تنگ آ کر شاہی اقتدار کو انگریزوں کی پناہ میں دے دیا۔

انگریزوں نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور شجاع الدولہ سے کہیں زیادہ نیازمندی اور وفا شعاری کی نمائش کر کے ۴ رجب ۱۱۷۸ھ، ۲۹ دسمبر ۱۷۶۴ء کو بادشاہ سے بہار اور بنگال کی دیوانی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اب وہ برصغیر ہندوستان کے مسلمہ[3] اور مشہور قانون

---

[1] فرح بخش بحوالہ تاریخ اودھ صفحہ ۱۲ وقیصر التواریخ۔ [2] نجف خاں ایران کے ایک شیعہ خاندان کا فرد۔ ابھی جوان ہی ہوا تھا کہ اپنی بہن کے ساتھ ہندوستان آیا۔ طبع رسا اور سازشی فطرت نے اس کا تعارف بہت جلد محمد قلی خاں سے کرا دیا۔ یہ تعارف بہت جلد قرابت بن گیا کیونکہ نجف خان کی بہن محمد قلی خاں کی بیگم بن گئی۔ محمد قلی خاں قتل ہو گیا تو نجف خاں نے شاہ عالم کا رُخ کیا اور بہت جلد بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ [3] شخصی حکومتوں میں فاتح ہی کو مالک مُلک سمجھا جاتا تھا مگر مغل بادشاہوں کے دو سو سالہ اقتدار نے (جس کے سایہ میں دس بارہ نسلیں گذر چکی تھیں) ایک طرف بادشاہ کے متعلق اوتار کا عقیدہ قائم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت بادشاہ سلامت قلعہ آگرہ کے جھروکے میں بیٹھ کر جمنا میں اشنان کرنے والوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ اور اشنان کرنے والے بھی اس درشن کو پوجا کی ایک ضروری رسم سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ذہنوں میں رچ چکا تھا کہ ہندوستان کا مالک و وارث مغل بادشاہ ہے۔ جس طرح ایک عرصہ دراز تک عباسی خلیفہ کو تمام مسلمانوں کا صحیح اور جائز حکمران سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ محمود غزنوی جیسے فاتح نے بھی اپنی حکومت کی تصدیق و تصویب کے لئے خلیفہ عباسی کی سند ضروری سمجھی تھی اور جب اس کو دربارِ خلافت سے سیف اللہ کا خطاب اور خلعت مل گیا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کے مطابق بہار اور بنگال کے جائز حکمران ہو گئے۔

شجاع الدولہ، روہیلوں اور مرہٹوں سے مدد لے کر کچھ دنوں انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا۔ پھر اس کو اپنا فائدہ صلح ہی میں نظر آیا۔

اس آٹھ سالہ تماشا کا آخری پردہ، کوڑہ جہان آباد کی کانفرنس تھی، جو تقریباً نو ماہ بعد ۲۴ صفر ۱۱۷۹ھ، ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو منعقد ہوئی۔ جس میں شجاع الدولہ کا ملک تقسیم کر کے صرف اودھ شجاع الدولہ کو دیا گیا، اور الہ آباد اور غازی پور کا علاقہ بادشاہ کی جاگیر قرار پایا۔ بہار، بنگالہ اور اڑیسہ جس پر انگریز کی دیوانی تسلیم کی گئی تھی اس کی مال گذاری کے چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ طے کئے گئے اور یہ شرط قرار پائی کہ اس میں سے دو لاکھ روپیہ سالانہ نجف خاں کو دیئے جائیں گے۔ انگریزوں نے سالانہ مالگذاری (چھبیس لاکھ روپے) کی ادائیگی کے لئے مختصر راستہ تجویز کر دیا۔ یعنی نقد رقم ادا کرنے کے بجائے شجاع الدولہ کی مملکت میں سے تقسیم شدہ حصہ الہ آباد غازی پور بادشاہ کو بطور جاگیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو وہ مسلمانوں کا صحیح بادشاہ سمجھا جانے لگا۔ ایسے ہی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہر ایک باشندۂ ملک صرف اسی کو جائز حکمران سمجھتا تھا جس کے پاس مغل بادشاہ کی سند ہوتی تھی۔ چنانچہ مغل بادشاہوں کی قوت و شوکت ختم ہونے کے بعد ایک عرصہ تک ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ صرف وہ نذرانہ ہوتا تھا جو کوئی شمشیر زن رئیس اپنے مقبوضہ علاقہ پر اپنی حکومت تسلیم کرانے کے مقصد سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا تاکہ سند حاصل کرے شجاع الدولہ نے سند وزارت حاصل کرنی چاہی تو دو کروڑ روپیہ بادشاہ کو نذر پیش کیا۔ انتہا یہ کہ مرہٹوں کی جنگ کا اصل مقصد محقق تاریخ کے نزدیک یہ تھا کہ اپنے علاقہ کی سند حاصل کرلیں جس کی بنا پر ان کی حکومت تسلیم کرلی جائے اور ان کو ویش مکھی یا خراج حاصل کرنے کا (جو ۲۵ فیصد لینا چاہتے تھے اور جس کو چوتھ کہا جاتا تھا) حق ہو جائے۔ انہیں تاریخی روایات اور عوام کے اسی تسلیم کردہ قانون کے مطابق انگریزوں نے بھی سند حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ ورنہ جس بادشاہ کو بار بار شکست دے کر اپنا وظیفہ خوار بنا چکے تھے اس سے سند حاصل کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

Marfat.com

دے دیا گیا۔ جس سے وہ اپنی مال گذاری کا چھبیس لاکھ سالانہ خود وصول کرتا رہے، اور ان اضلاع کا نظم و نسق نجف خاں کے سپرد کر دیا گیا۔ اور یہ بھی طے کیا گیا کہ نظم و نسق کے عوض میں اسی چھبیس لاکھ کی رقم میں سے دو لاکھ نجف خاں کے ہوں گے۔

مختصر یہ کہ شاہ عالم دہلی سے چلا تھا بنگال اور بہار پر قبضہ کرنے کیلئے قبضہ تو کیا کرتا، خود اُن کا وظیفہ خوار بن گیا۔ اور ایسا وظیفہ خوار جس کے لئے انگریزوں کو کبھی پھوٹی کوڑی بھی اپنے پاس سے خرچ نہیں کرنی پڑی۔ البتہ اس معاہدہ سے جس کو فائدہ پہنچا اور جس کی شخصیت قائم ہوگئی، وہ نجف خاں تھا جو بیک وقت انگریزوں کا جاسوس تھا، شجاع الدولہ کا ہوا خواہ، اور شاہ عالم بادشاہ کا ایسا معتمد کہ جب شاہ عالم دہلی پہنچا تو یہی اُس کا وزیر اعظم بنا۔[1]

یہاں یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ یہی نجف خاں ہے جس کے دورِ وزارت (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۲ء) میں شاہ عبدالعزیز صاحب کو بار بار جلا وطن کیا گیا طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں، اور واجب الاحترام بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کو شہید کرایا گیا۔ رحمہم اللہ۔

---

[1] نجف خاں متوفی ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء، ۳۰ ربیع/جمادی الاول ۱۱۹۷ھ

انگریزوں سے معاہدہ کے بعد سیاسی گروپ بندی

معاہدہ کوڑہ جہاں آباد کا دُور رس نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی طاقتوں کی گروپ بندی کا رُخ قطعاً بدل گیا۔ اب تک گروپ بندی ان بنیادوں پر تھی جن کا تعلق گلدستۂ ہندوستان کی اندرونی رنگینیوں سے تھا۔ مثلاً مرہٹہ، مغل، پٹھان، راجپوت یا شیعہ سُنّی وغیرہ۔ اب گروپ بندی کی بنیاد انگریزوں کی حمایت یا مخالفت ہوگئی۔ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ایسی بڑی طاقت بن گئی کہ اب پورے ہندوستان کی سیاست انگریزوں کی حمایت یا مخالفت میں منقسم ہوگئی۔

الف : شجاع الدولہ اور شاہ عالم انگریزوں کے حامی تھے۔ کچھ دنوں بعد حیدر آبادی نوابوں کی حمایت بھی انگریزوں کو حاصل ہوگئی، جو ہر نازک موقع پر بہت ہی زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔

ب : مندرجہ ذیل طاقتیں وہ تھیں جو انگریزوں کو برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔

(۱) روہیلہ۔ جن کا حلقۂ اقتدار پیلی بھیت، شاہجہان پور سے لے کر سہارنپور تک تھا۔ جس کے سربراہ کار حافظ رحمت خاں تھے۔ نجیب خاں (جو نجیب الدولہ کے خطاب سے ممتاز ہوکر مغل بادشاہ کے امیر الامراء رہے)، نواب فیض محمد خاں، محمد خاں بنگش، احمد خاں بنگش اور نواب مظفر جنگ، نوابانِ فرخ آباد، اسی جماعت کے ممتاز افراد تھے۔

(۲) مرہٹہ۔ جن کا حلقۂ اقتدار جنوبی مغربی ہند، مالوہ اور وسطِ ہند کا بیشتر علاقہ تھا۔

(۳) ایک اور طاقت جنوبی ہند میں نشو و نما پا رہی تھی جس کا سلسلہ شاہ ابو سعید[1]

---

[1] مولانا ابو الحسن علی ندوی مصنف سیرت سید احمد شہید، جو اس خاندان کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

صاحب اور شاہ ابو اللیث[1] صاحب کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے منسلک ہوتا تھا۔ یہ "حیدر علی" کی حکومت تھی جو میسور میں روز افزوں ترقی کر رہی تھی یہی حیدر علی ہیں جن کا بہادر فرزند، سلطان ٹیپو کے نام سے مشہور ہوا، جن کے نام سے یورپین بچوں کو عرصہ تک ڈرایا جاتا رہا اور ہندوستان کا بچہ بچہ[2] ان کو جنگِ حریت کے شہسوار کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) باعثِ فخر وارث ہیں حضرت مولانا سید ابو سعیدؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں" مدراس اور چینا پیٹن میں آپ کا بڑا اثر اور مقبولیت تھی ص۶۵ ۔ حضرت شاہ ابو السعید صاحب کے جود و سخا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ آیا۔ گھر کے باہر رکھ دیا اور وہیں ضرورت مندان کو تقسیم کر دیا ص۶۵ ۔ ممکن ہے یہ نواب حیدر علی (متوفی ۱۱۹۶ھ ۱۷۸۲ء) کا عطیہ ہو، جیسا کہ مولانا ابو الحسن علی نے احقر سے زبانی فرمایا تھا کہ خاندانی روایت یہی ہے کہ نواب حیدر علی کے یہاں سے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ آیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سیّد ابو اللیث صاحبؒ اپنے والد ماجد سیّد ابو سعید صاحب کے خلیفہ تھے۔ آپ حج کے بعد دکن میں رہے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ کوڑیال بندر بن سمندر کے کنارے مدفون ہیں۔ از جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب بحوالہ کتاب سیّد محمد منان صاحب عم حضرت سیّد صاحب شہیدؒ۔ [2] ہندوستان کی جدید صوبائی تنظیم کے بموجب یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو جب "عظیم تر میسور" کا افتتاح ہو رہا تھا تو ہندوستان کی خبر رساں ایجنسی یو۔ پی۔ آئی کی رپورٹ ہے کہ ریاست میسور کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ہنومنتیا جنہوں نے اس کے قیام کے لئے زبردست جد و جہد کی تھی، حسب ذیل پیغام جاری کیا "تاریخی دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے — کہ ٹیپو سلطان نپولین کے دوست تھے۔ ٹیپو سلطان کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کو انگریز کے غلبہ سے آزاد کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ حکومت کو عوامی بنایا جائے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان بعض دستاویزات پر" شہری ٹیپو" کے نام سے دستخط کیا کرتے تھے۔ ان کے ڈیڑھ سو سال بعد جو کچھ انڈین نیشنل کانگریس نے حاصل کیا اس کا خواب ٹیپو نے دیکھا تھا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

یہ عجیب بات ہے کہ انگریزوں کی حمایت میں جو پیش پیش رہے، مثلاً میر جعفر (بنگال)، میر صادق (میسور)، شجاع الدولہ (لکھنؤ)، نجف خاں (دہلی) یہ سب شیعہ تھے۔

انگریز دشمن طاقتوں کا حسرتناک انجام

حافظ رحمت خاں شجاع الدولہ نے تسخیر روہیل کھنڈ کے شوق میں جنرل ہیسٹنگس کی مدد اور اس کی ترغیب[1] سے ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ کی طرف کوچ کیا۔ پہلے فرخ آباد کے نواب مظفر جنگ کو باجگذار بنایا۔ پھر ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ کو کٹرہ میراں پور کی وہ مشہور لڑائی ہوئی جس میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ روہیلوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ اُن کی جائدادیں ضبط اور مال و اسباب تاراج کیا گیا۔ نواب فیض اللہ خاں نے لال ڈانگ کے دشوار گذار پہاڑی جنگل میں پناہ لے کر جان بچائی۔ بچے کھچے روہیلے بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اس کی خاطر انہوں نے اپنی جان بھی قربان کی تھی۔ انہوں نے اپنے ہی جرنیلوں اور وزیروں کی غداری کی وجہ سے شہادت پائی۔ آج بھی لوگ ان غداروں پر لعنت بھیجتے ہیں سن ۱۹۷۰ء میں ٹیپو سلطان کا جو علاقہ تھا آج عظیم تر میسور کا علاقہ بھی اتنا ہی ہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ٹیپو نے منگلور کے قریب ایک بندرگاہ تعمیر کرنے کا کام شروع کیا تھا اور آج پنجسالہ پلان کے تحت اسی جگہ کو ایک عظیم بندرگاہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی ریاست میسور کا مستقبل اور اس کے امکانات بڑے شاندار ہیں اور وہ غالباً ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال بن سکتی ہے بشرطیکہ ہم اخلاص و محنت سے کام کریں۔ ہمیں غداریوں اور بے وفائیوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ میری دعا ہے کہ ہندو اور مسلمان اور دیگر مذاہب کے پیرو ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہیں اور خوشی و خوش حالی کے حصول کے لئے متحد ہو کر جدّ و جہد کریں۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) ملاحظہ تاریخ ہندوستان از شمس العلماء ذکاء اللہ خاں و حیات حافظ رحمت خاں۔

وہیں پہنچ گئے۔ تقریباً چھ ماہ تک اس علاقہ میں محصور رہنے کے بعد انگریزوں کی مدد سے شجاع الدولہ سے صلح ہوئی اور رام پور کا علاقہ اُن کی جاگیر قرار دیا گیا۔ روہیلوں کی حکومت کے باقی علاقے انگریزوں، شجاع الدولہ اور نجف خاں نے آپس میں تقسیم کر لئے۔

نجیبُ الدولہ امیر الاُمرا نجیب الدولہ ۱۷۷۰ء میں وفات پا چکے تھے۔ اُن کی جگہ اُن کا بیٹا ضابطہ خان امیر الامرا ہوا۔ یہ انگریزوں کا مخالف تھا۔ شاہ عالم نے انگریزوں کو دیوانی عطا کر کے ۱۷۷۱ء میں دہلی کی طرف کوچ کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوئے۔ بادشاہ کا یہ سفر انگریزی فوج کے سایہ میں ہوا تھا۔ ضابطہ خاں اس سایہ سے بچ کر اپنی جاگیر میں نجیب آباد چلا گیا۔ نجف خاں امیر الامرا قرار پائے۔ مرہٹوں کو اس سے اشتعال پیدا ہوا۔ انہوں نے بادشاہی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ صلح میں یہ طے پایا کہ ضابطہ خاں کو امیر الامرا بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۷۷۲ء میں ضابطہ خاں دوبارہ امیر الامرا بنائے گئے۔ مگر انگریزوں اور شجاع الدولہ کی پُرزور سفارش پہنچی، کہ یہ عہدہ نجف خاں کو سپرد ہو۔ بادشاہ کے لئے سرتابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ۱۷۷۳ء میں نجف خاں امیر الامرا مقرّر ہوئے۔ اس طرح انگریزی اقتدار، لال قلعہ میں داخل ہو کر فرماں روائی کرنے لگا۔ مگر باہر کے پاسبان اب بھی مرہٹے تھے۔ اب نجف خاں اور مرہٹوں کی جنگ درپردہ انگریزوں اور مرہٹوں کی جنگ تھی۔

انگریزی اقتدار اب شمالی ہند میں میمن سنگھ اور چاٹگام سے لے کر دہلی تک انگریزی اقتدار کا سکّہ رائج ہو چکا تھا۔ جنوبی ہند میں حیدر آباد کی طرف دوستانہ نگاہیں اُٹھ رہی تھیں۔ ٹیپو سلطان اور مرہٹے مخالف تھے، مگر بدقسمتی سے یہ دونوں آپس میں دست و گریباں تھے۔ انگریزوں نے پہلے میسور کا رُخ کیا۔ مرہٹوں کو کچھ تھپک کر خاموش کیا۔ نظام کی فوجیں ساتھ لیں۔ میر صادق وغیرہ سلطان کے غدّار ساتھیوں نے خفیہ ساز باز کر لی۔ اب ایک معرکہ کی ضرورت تھی، جس میں اس شیر بیشۂ حرّیت کو سب طرف سے گھیر کر شہید کر دیا جائے۔

Marfat.com

۴ مئی ۱۷۹۹ء اس منصوبہ کی کامیابی کی آخری تاریخ تھی - دن کا ایک بجا تھا، کہ جنگِ آزادی کے اس شیر دل کمانڈر نے اپنے مخصوص جاں نثاروں کے ساتھ جن میں فدائے وطن خواتین[1] بھی تھیں انگریز بمدآوروں کی مدافعت شروع کی - سب طرف سے گھر جانے کے باوجود ماہ مئی کی دہکتی ہوئی گرمی میں بھوکے پیاسے سات گھنٹے کی جنگ کے بعد غروب آفتاب کے وقت اس بہادر سلطان نے پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں کو جامِ شہادت سے تر کیا[2] -

اور تاریخ جبر و قہر کی پیشانی پر خونِ شہادت سے یہ فقرہ لکھ دیا:

"شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔

مگر جب "لارڈ ہارس" نے سلطان کی خون آلود لاش دیکھی، تو اُس کا نعرہ یہ تھا:

"آج ہندوستان ہمارا ہے[3]"۔

---

[1] کانسٹینس پارس اپنی کتاب "سرنگاپٹم" کے ص۸۶ پر لکھتا ہے - ٹیپو سلطان کی لاش کے نزدیک بے شمار عورتوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں جن کے لباس اور وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ غالباً حرم سلطانی ہیں - انیسن جان کنگ کی شہادت ہے - عورتوں کی ان لاشوں میں ایک خوب صورت برہمن لڑکی کی لاش بھی تھی - (تاریخ سلطنتِ خداداد ص۳۰۵)

[2] یہ ایک نہایت المناک داستان کی طرف اشارہ ہے - واقعہ یہ ہے کہ سلطان کے ساتھی حتیٰ کہ خادم بھی جس کے پاس پانی کا چھاگل تھا، انگریزوں کے ہاتھ بک چکے تھے - دربار کے ذمہ داروں نے نشان دہی کر کے انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل کیا اور جب باڈی گارڈ کے چند ساتھیوں کو لے کر یہ بہادر جرنیل اپنے ملک کی عزت و عظمت پر قربان ہونے کے لئے فوج کے سامنے سینہ سپر ہو گیا تو باڈی گارڈ کے یہ ساتھی بھی پست ہمت یا غدار ثابت ہوئے - سلطان سپاہیانہ جوہر دکھا کر دشمنوں کو کھیت کر رہا تھا - مگر جب گرمی کی شدت اور تشنہ لبی سے پریشان ہو کر اپنے خادم سے پانی طلب کرتا تھا، تو افسوس! نہ ساقی کے ہاتھ ملتے تھے نہ چھاگل انڈیلتا تھا - مختصر یہ کہ بہادر سلطان شدید زخمی ہوا - پانی مانگتا ہوا گھوڑے سے گرا - اس وقت بھی اس پر رحم نہیں کیا گیا - یہ غریب مسافر تشنہ لب ہی اس دنیا سے رخصت ہوا - رحمہ اللہ - [3] سلطنتِ خداداد میسور ص۳۰۳ و ص۳۴۹ -

Marfat.com

اٹھارہویں صدی عیسوی کا خاتمہ

اٹھارہویں صدی کی شام کو ہندوستانی عظمت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا - غلامی کی شبِ تاریک تیزی سے پورے ملک پر چھا رہی تھی - انگریزی اقتدار کی صبحِ صادق نمودار ہو رہی تھی -

اب آزادیٔ وطن کی سونی بزم میں صرف مرہٹی اقتدار کی ایک ٹمٹماتی شمع باقی تھی - لال قلعہ میں جو کچھ اُجالا تھا وہ اسی کا عکس تھا - ایک چراغ شمالی مغربی علاقہ میں بھبک رہا تھا - یہ راجہ رنجیت سنگھ کا عروج تھا - مسلمانوں کی تمام قابلِ ذکر طاقتیں ختم ہو چکی تھیں - جو ختم نہیں ہوئی تھی، مفلوج ہو کر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں ۱۸۰۳ء کے آخر میں لارڈ لیک، انگریزی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا - سیندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں، وہ سینہ سپر ہوئیں - مگر انگریز کی فوجی طاقت مرہٹوں کی قوتِ ایثار سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی - مجبوراً شکست خوردہ دہلی نے انگریزوں کا استقبال کیا - لارڈ لیک نے دہلی پر تسلط کر کے شاہ عالم سے ایک نیا معاہدہ کیا -

سیندھیا پیچھے ہٹا تو ہلکر اور امیر علی خاں آگے بڑھے - مگر دہلی کے محاذ پر اُن کو بھی شکست ہوئی تو سکھوں کی بہادری کا صدقہ لینے کے لئے پنجاب پہنچے - یہاں اُن کو کچھ مالی امداد تو مل سکی مگر فوجی امداد کے لئے کوئی سکھ سردار تیار نہیں ہوا - بڑی اُمید مہاراجہ رنجیت سنگھ سے تھی، اُس نے بھی صاف انکار کر دیا۔[1]

اب مجبوراً اُن کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، اور ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے ایک معاہدہ کر کے اپنے ملک واپس ہوئے - مگر انگریزوں کے خلاف

---

[1] تاریخ پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد ص۲۳ و مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر سیتا رام کوہلی ص۹۵-۹۹ و نواب امیر علی خاں از مولانا شاہ اکبر خاں -

Marfat.com

غم وغصہ کی جو آگ اُن کے سینوں میں بھڑک رہی تھی وہ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ پورے ہندوستان میں کوئی نہیں تھا جو اُن کی ہمنوائی کرتا۔ صرف ایک راجہ اور ایک فقیر اُن کا ہمنوا تھا۔ راجہ، مادھوجی سیندھیا، اور فقیر شاہ عبدالعزیز۔ ہلکر اور سیندھیا کی باہمی رقابت وعداوت تاریخ کا مشہور افسانہ ہے اس رقابت نے اُن کو آج تک الگ الگ رکھا تھا۔ لیکن انگریزوں کی مخالفت ایک مشترک مقصد تھا جس نے ان تینوں کو متحد کر دیا یعنی امیر علی خاں[۱]، ہلکر[۲] اور سیندھیا[۳]۔

انگریزی اقتدار کی نوعیت اور آزادیٔ وطن کے متعلق ایک پیچیدہ سوال

۱۷۶۵ء میں جبکہ پٹنہ اور بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ (اودھ) اور شاہ عالم کو شکست ہو چکی تھی تو فوراً ہی دہلی پر قبضہ کر لینا بھی مشکل نہیں تھا کیونکہ انگریزوں کی فوجی طاقت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ وہ آسانی سے یہ پروگرام کامیاب کر سکتے تھے مگر انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرنے والوں کو اپنی موت مرنے دیا جائے، اُس کو گولی کا نشانہ بنا کر بلاضرورت کارتوس خراب نہ کیا جائے۔ چنانچہ انگریز مدبّرین وہ زہریلے نسخے تو استعمال کرتے رہے جو مرض کو مُہلک بنا کر موت کو یقینی کر دیں۔ مگر اس کے روادار نہیں ہوئے کہ فوجی قوت کے ذریعہ ایک سال بعد مرنے والے کو آج ہی ختم کر دیں۔ اُن کے تجارتی مقاصد کا تقاضا بھی یہی تھا کہ زراندوزی اور ملک گیری کے وہ راستے نہ اختیار کریں جن سے عوام میں بددلی پیدا ہو۔ جب ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا تو یہاں بھی اسی سوچی سمجھی اور طے شدہ پالیسی سے کام لیا گیا۔ یعنی بادشاہ کو معزول کرنے اور شاہی تخت وتاج چھیننے کے بجائے بادشاہت کا وہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی، جو انگلستان کی آزاد پارلیمنٹ خود اپنے بادشاہ کے لئے طے کر چکی تھی، اور جس پر خود

انگریزوں کے وطن میں سالہا سال سے عمل ہو رہا تھا۔ یعنی بادشاہ کو تاج و تخت کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے صرف اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے تسلیم کرائے گئے اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"

غور فرمایئے کس قدر نازک پوزیشن ہے۔ خدا کی خدائی اور اس کی قدرت کاملہ تسلیم کر کے مذہب کا دامن بھی دونوں ہاتھوں سے تھام لیا گیا ہے۔ مغل بادشاہ کی بادشاہت اور آلِ تیمور کی عظمت بھی محفوظ کر دی گئی ہے۔ صرف کاروبارِ حکومت جو ہندو یا مسلمان امراء اور وزراء کے حوالہ ہوا کرتا تھا، اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ اُن کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی معاملات قاضیوں کے سپرد کر کے ان کو کلچرل اٹانمی (تہذیبی خود مختاری) بھی دے دی گئی ہے۔ عوام تو عوام اس زمانہ کے خواص بھی اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے تھے جو سابق امراء اور وزراء کے اختیارات، یا انگلستان کی پارلیمنٹ اور کابینہ اور ہندوستان کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے درمیان تھا۔ اُن کی نظر مذہب پر، تہذیب پر اور بادشاہ پر تھی۔ یہ سب محفوظ تھے لہذا ایک نہایت ہی نازک سوال تھا کہ موجودہ حالت کو آزادی کہا جائے یا غلامی اسلامی قوانین کی رو سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اب ہندوستان کو دارالاسلام مانا جائے جیسا کہ پہلے تھا یا دارالحرب کہا جائے۔ جہاں برسرِ اقتدار طاقت سے جنگ کرنا، ورنہ اس ملک سے نکل جانا مذہباً فرض ہے، یا اس کو دارالامن مانا جائے جہاں اگرچہ حکومت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے اور مذہبی آزادی اُن کو حاصل ہے اور اس بنا پر حکومت سے جنگ کرنا درست نہیں ہے۔

بہر حال ایک نہایت ہی پیچیدہ سوال تھا جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی سیاسی مفکرین اور علماء کرام کے سامنے آیا۔ اس سوال کے جواب میں اختلاف رائے ہو سکتا تھا اور انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لئے نہایت

Marfat.com

آسان تھا کہ اس اختلاف سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کو گمراہ کرے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئی۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) کی سیاسی درس گاہ کے تربیت یافتہ پختہ کار ایسے شعبدوں سے مسحور ہونے والے نہیں تھے، چنانچہ اس پارٹی کے رہنما سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے فتویٰ صادر فرمایا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے جو فتویٰ فارسی[1] زبان میں صادر فرمایا۔ اُس کا ترجمہ یہ ہے:

"یہاں رؤسا نصاریٰ (عیسائی افسران) کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور اُن کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے، کہ ملک داری، انتظاماتِ رعیت، خراج، باج، عشر و مالگذاری، اموال

---

[1] اصل عبارت یہ ہے۔ دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم روسا نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست و مراد از اجرار احکام کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبستِ رعایا و اخذ خراج و باج وعشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فیصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نکنند نکردہ باشند لیکن اصل اصول ایں چیزہا نزد ایشان ہبا، و ہدرست۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مے نمائند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمانِ ایشان دریں شہر و در نواح نمے تواند آمد، و برائے منفعتِ خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمے نمایند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکمِ ایشان دریں بلاد داخل نمے توانند شد و از یں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتدست۔ آرے درچپ و راست مثل حیدرآباد، لکھنؤ و رام پور احکامِ خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت و اطاعتِ مالکانِ آں الخ (ص۱۷ ج ا فتاوی عزیزیہ مطبوعہ مطبع مجتبائی)۔

تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوجداری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطورِ خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ ہندوستانیوں کو اُن کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بیشک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے۔ انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو اُن کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اُس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انہیں کی عملداری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے، براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔" (مگر اس سے پورے مُلک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا)

(فتاویٰ عزیزی فارسی جلد اوّل ص۱۷ مطبوعہ مطبع مجتبائی)

ایک دوسرے فتویٰ میں بھی مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کا دارالحرب ہونا ثابت کیا ہے (جلد اوّل ص۱۰۵ فتاویٰ عزیزی

Marfat.com

فارسی مطبوعہ مطبع مجتبائی)۔

فتوی کی زبان مذہبی ہے کہ "دار الحرب" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر رُوح سیاسی ہے۔ اور مطلب[1] یہ ہے کہ چونکہ:

(۱) قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

(۲) مذہب کا احترام ختم ہے

(۳) اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے۔ اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لئے حرام جانے۔

---

[1] دورِ حاضر کے مشہور رہنما عالم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند اس فتویٰ کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں، شہر دہلی اور اس کے نواح میں امن کا پروانہ لئے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔

(۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے وہ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور اُن کے شعائرِ مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور اُن کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کیلئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ (نقشِ حیات جلد دوم ص۱۱)

Marfat.com

اس موقع پر یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ نجف علی خاں کی وفات[1] (۱۷۸۲ء) کے بعد سے یعنی تقریباً بیس سال سے اقتدار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرہٹوں کا پیشوا (مادھو نرائن پھر باجی راؤ) امیر الامراء تھا اور مادھوجی سیندھیا نائب امیر الامراء اور جس طرح آج یہ اعلان ہو رہا تھا کہ "حکم کمپنی بہادر کا"۔ بیس سال پہلے سے دنیا دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ حکم تھا وہ پیشوا یا سیندھیا کا تھا۔ یعنی پایۂ تخت اور اس کے گرد و نواح میں ایک غیر مسلم طاقت یعنی مرہٹوں کا تسلّط تھا۔

شاہ عبد العزیز صاحب اور اُن کی پوری پارٹی، دہلی میں موجود تھی۔ اُن کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اُن کے منہ میں زبان تھی اور ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ جن باتوں میں وہ مرہٹوں کے نظامِ حکومت سے ناراض تھے اُن پر سخت سے سخت تنقید کی تھی۔ آج بھی وہ عربی اور فارسی کے اشعار موجود ہیں جن میں مرہٹوں پر گہری تنقید ہے لیکن بایں ہمہ ان بیس سالوں میں نہ وطنِ عزیز کو دار الحرب قرار دیا اور نہ ہندوستانیوں کے لئے "آزادی ورنہ ترکِ وطن" کا فتویٰ صادر کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا جنگ جُو

[1] ۲۶ر اپریل ۱۷۸۲ء کو مرزا نجف خاں نے انتقال کیا (تاریخ ہندوستان ص ۳۲۸ ج ۹) اس کے مرنے کے بعد دو شخص اس کے منصب کی وراثت کے لئے کھڑے ہوئے۔ ۱: افراسیاب جس کو مرزا نجف علی خاں اور اس کی بہن نے پالا تھا۔ ۲: مرزا شفیع جو نجف علی خاں کا رشتہ دار تھا۔ کافی ہنگامہ بازی کے بعد مرزا محمد شفیع نے امیر الامرائی کا عہدہ سنبھالا۔ چند روز بعد اس کو محمد بیگ نامی ایک سردار نے جو اس ہنگامہ بازی کا ایک ہیرو تھا، قتل کر دیا۔ اب افراسیاب خاں امیر الامراء ہوا۔ چند روز بعد مرزا محمد شفیع کے بھائی زین العابدین نے افراسیاب کو بھی قتل کر دیا۔ اس کمینہ خانہ جنگی سے بادشاہ اس قدر تنگ ہو چکا تھا کہ اُس نے آس پاس کے تمام امراء کو نظر انداز کر کے مرہٹوں کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ جس کو مرہٹوں نے خوش آمدید کہا۔ اب پیشوا کو عہدۂ امیر الامرائی سپرد ہوا۔ اور مادھوجی سیندھیا نائب امیر الامراء قرار پایا۔ پینسٹھ ہزار روپیہ ماہانہ بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہوا۔ (تاریخ ہندوستان از ص ۳۲۸ تا ص ۳۳۱ ج ۹)۔

Marfat.com

طبقہ جو شاہ عبد العزیز صاحب سے گہری عقیدت رکھتا تھا یعنی روہیلہ پٹھان، اُن کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو اذیتیں پہنچانے کی جو روایتیں نقل کی جاتی ہیں اُن میں جس کا نام لیا جاتا ہے، وہ نجف علی خاں ہے، جو انگریزوں کا پُرانا وظیفہ خوار اور اُن کا لایا ہُوا وزیر تھا۔

فتوے کا اثر عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں اُن کا طرزِ عمل کیا ہو۔ اُن کے لئے ایک راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہُوا کہ باہمت جنگ جُو طبقہ جا بجا اُس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اُس وقت انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی، یہ طاقت اُس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اُس دَور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پُرانی جنگ ختم ہو گئی، اور صرف اتنا ہی نہیں ہُوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ خود حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے۔

Marfat.com

انیسویں صدی کے پہلے پچیس سال

سیاسی تبدیلیاں اور ولی اللہ پارٹی کا اقدام

لارڈ ولزلی کا سات سالہ دورِ حکومت (جو ۱۷۹۸ء سے شروع ہو کر ۱۸۰۵ء پر ختم ہوا) ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کا دور تھا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کو ختم کیا گیا۔ اُس سے ڈھائی سال بعد پیشوا کو دبا کر ۱۸۰۲ء میں "بسین" کا مشہور عہد نامہ کیا گیا جس میں طے کیا گیا کہ انگریزوں کی ایک فوج پیشوا کے علاقہ میں رہا کرے گی۔ پھر سیندھیا کی فوجوں کو شکست دے کر ۱۸۰۳ء میں دہلی فتح کی گئی۔ مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور ان کے منہ بولے بھائی امیر علی خاں کی طاقت کو کمزور کیا گیا۔ اس وقت یہ طاقتیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر انگریزی حکومت کے خلاف ان کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ چند سال بعد یہ کوششیں ہیبت ناک حقیقت بن کر سامنے آ گئیں۔ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خاں کی شکست خوردہ طاقت نے پھر سنبھالا لیا پیشوا نے بھی اپنی فوجیں آراستہ کیں۔ دولت راؤ سیندھیا نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوجیں اور توپ خانہ انگریزی فوجوں کے پیمانہ پر تیار کیا بلکہ مہاراجہ نیپال سے بھی خفیہ سازباز کر لی۔ وسطِ ہند میں ایک خانہ بدوش گروہ (پنڈاریوں[1]) نے

---

[1] یہ جنگجو بہادروں کا گروہ تھا۔ بے قاعدہ لشکر کی طرح لوٹ مار بھی کرتا رہا اور اس زمانہ کی طاقتوں سے ٹکراتا بھی رہا۔ اگر مہلت ملتی تو یہ گروہ روہیلوں، ازبکوں، مرہٹوں یا خالصہ کی طرح باضابطہ حکومت بھی قائم کر لیتا۔ ۱۷۹۴ء میں پنڈاروں کے دو بڑے سرداروں کو مادھو جی سیندھیا نے وادیٔ نربدا میں جاگیریں دے دیں۔ یہ سردار فوت ہو گئے تو اُن کے بیٹوں، دوست محمد اور واصل محمد نے عنانِ قیادت سنبھال لی۔ پھر ایک سردار کریم خاں نامی نے بہت قوت جمع کر لی۔ وہ ہلکر کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ اور ۱۸۰۶ء میں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

قیامت برپا کر دی۔ انگریزی علاقوں اور انگریزوں کی حلیف ریاستوں پر شب خوں مارنے شروع کئے۔ یعنی ہندوستان کی تمام طاقتیں ایک دفعہ پھر انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں آ گئیں[1]۔

یہی زمانہ تھا کہ یورپ میں نپولین بونا پارٹ کی فتوحات کا سیلاب جاری تھا اور اُس نے ایک سفارت ایران بھیج کر یہ کوشش کی تھی کہ ایران سے ایسے تعلقات ہو جائیں کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کرنے میں سہولت ہو[2]۔ اسی کی پیش بندی کے لئے انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ۱۸۰۸ء میں معاہدہ کیا۔ پٹیالہ، نابھہ، کپور تھلہ وغیرہ یعنی دریائے ستلج سے اُس پار کی ریاستیں خود ہی انگریزی اقتدار کی پناہ لے کر انگریزوں کا دست و بازو بن گئیں[3]۔ بہر حال یہ دور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) گیارہ پرگنوں کا مالک بن گیا جن کی آمدنی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ سیندھیا نے اسے نواب کا خطاب دیا۔ وہ عام طور پر سیندھیا شاہی کے لقب سے معروف تھا۔ اُس نے بھوپال کے بھی کچھ علاقے چھین لئے تھے۔ دولت راؤ سیندھیا نے کسی بات پر بگڑ کر اُسے قید کر دیا۔ چنانچہ وہ پانچ برس گوالیار میں قید رہا۔ اس زمانہ میں چیتو نے بہت رسوخ پیدا کر لیا۔ دوست محمد اور واصل محمد کی پارٹیاں بھی چیتو کے ساتھ مل گئیں۔ کریم خاں نے چھ لاکھ روپیہ دیکر قید سے مخلصی حاصل کی۔ انگریزوں نے راجستھان کے راجاؤں سے معاہدے کر لینے کے بعد پنڈاروں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ایک ایک کر کے سب سردار سپر ڈالتے رہے۔ نامدار خاں نے ۱۸۱۳ء میں ہتھیار ڈالے۔ کریم خاں اور واصل محمد خاں کو گورکھپور اور غازی پور میں کچھ جاگیریں دے دی گئیں۔ چیتو آخر تک مقابلہ پر جما رہا۔ اس کے پاس پندرہ ہزار سوار تھے۔ مردانگی سے لڑا اور شکست کھا کر جنگل میں جا چھپا۔ ۱۸۱۷ء میں اُسے شیر نے پھاڑ ڈالا۔ چیتو اصلاً میواتی تھا اور بڑا غیور مسلمان تھا۔ (تاریخِ وسطِ ہند از میجر جنرل سر جان میلکم ج اوّل و تاریخ بھوپال و سید احمد شہید از جناب غلام رسول صاحب مہر۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ملاحظہ ہو، سیاسی تاریخِ ہند از میجر جنرل سر میلکم۔ [2] ایضاً لارڈ منٹو کا دورِ حکومت۔ [3] ملاحظہ ہو تاریخ راجگانِ پنجاب از سر لیپل گرفن۔

Marfat.com

جو ۱۸۰۸ء سے شروع ہوا، ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزوں کی قوت آزمائی کا آخری اور نازک ترین دور تھا۔ اس نازک موقع پر شاہ ولی اللہ پارٹی کا لیڈر (مولانا شاہ عبدالعزیز) بھی خاموش نہیں رہا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اپنے خاص مرید اور معتقد سیّد احمد کے ساتھ جسونت راؤ ہلکر کے دوست نواب امیر علی خاں کی فوج میں بھرتی کرا دیا اور اس طرح اپنے فتوے کی عملی شکل مسلمانوں کے سامنے پیش کر دی۔

سیّد احمد صاحب رائے بریلی کے رہنے والے اُس خاندان کے چشم وچراغ تھے جو اپنے تقدّس اور بزرگی کے لحاظ سے پُورے اودھ میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ "شاہ علم اللہ" کی خانقاہ "تکیہ شاہ علم اللہ" کے نام سے مشہور تھی۔ جس کے فیوض کم وبیش سو سال سے اودھ کے تشنہ لبوں کو سیراب کر رہے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اسی خانقاہ کو اپنے نظریات کی تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا تھا اور شاہ ابوسعید صاحب جن کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مرکز کا انچارج بنایا تھا، وہ سیّد احمد صاحب کے نانا تھے۔ اُن کے رُوحانی فیوض جنوبی ہند میں میسور اور سرنگاپٹم تک پہنچے۔ اور اُنھوں نے حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے دل و دماغ کو متاثر کیا۔

سیّد احمد صاحب جوان عمری میں اپنے گھر سے چلے۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اوّل تلاشِ روزگار میں لکھنؤ پہنچے۔ مگر وہاں شاہ اودھ کے پردہ میں انگریزوں کا اقتدار ناچ رہا تھا۔ سیّد صاحب چند ہی روز میں لکھنؤ کی فضا سے بد دل ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تن تنہا دہلی پہنچے۔ جہاں اُن کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے بھائیوں کی شفقت نے ایسا گرویدہ کیا کہ سیّد صاحب ساری عمر کے لئے اسی در کی خاک بن گئے۔

سیّد صاحب باقاعدہ مولوی تو نہیں بن سکے لیکن آپ نے روحانی کمالات پُوری طرح حاصل کئے۔ اور جب حالات کا تقاضا ہوا کہ ہر باشندۂ ملک انگریزوں کے

Marfat.com

خلاف جنگ جُو سپاہی بن جائے۔ تو آپ کی سپاہیانہ طبیعت کی مناسبت سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو نواب امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا۔

یہ امیر علی خاں جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھی تھے۔ یہ بھی کوئی خاندانی نواب یا بادشاہ نہیں تھے۔ بلکہ ایک غریب پٹھان کے ہونہار فرزند تھے۔ محمد حیات خاں اُن کے والد کا نام تھا۔ یہ اوّل نواب دوندے خاں روہیلہ کے یہاں فوج میں ملازم رہے۔ اور جب انگریزوں کی مدد سے شجاع الدولہ نے روہیلہ حکومت کو ختم کر دیا تو محمد حیات خاں تارک الدنیا بن کر سنبھل میں اقامت گزیں ہو گئے اور کھیتی کے پیشہ سے بسر اوقات کرنے لگے۔ امیر علی خاں کی پُر جوش طبیعت اور بلند فطرت نے آگے قدم بڑھایا اور بیس سال کی عمر تھی کہ وطن سے نکل کر مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے ایک پارٹی تیار کی پھر رفتہ رفتہ جسونت راؤ ہلکر کے رفیق اور دوست بن کر اُس کی فوجی مہموں میں دستِ راست بلکہ سیاہ سپید کے مالک بن گئے۔

بہرحال آخری جدّ و جہد کا جو دور ۱۸۰۸ء سے شروع ہوا تھا وہ ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں (مارکوئس ہیسٹنگز کے دورِ حکومت میں) ہندوستانیوں کی بدقسمتی پر آخری مہر لگا کر ختم ہوا۔ مرہٹوں کے سب سے بڑے سردار باجی راؤ پیشوا کو معزول کر کے کانپور کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے بٹھور میں بھیج دیا گیا۔ سیّد زین عرب کی کمان میں عربوں کی فوج اور روہیلہ پٹھانوں کی فوج کا ایک دستہ جو آخر تک باجی راؤ کے ساتھ رہا تھا منتشر کر دیا گیا[1]۔ اپا صاحب والیِ ناگپور بھی اسی سال معزول کر کے گرفتار کر لئے گئے عربوں کا ایک دستہ راجہ کی معزولی کے بعد بھی کئی روز تک محل کی حفاظت کرتا رہا۔ مگر آخر کار اس کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا[2]۔ پنڈاریوں کا سردارِ چیتو جو کبھی مہاراجہ

---

[1] سیاسی تاریخ ہند ضمیمہ ۵۔ بیان کارگزاری بریگیڈیر جنرل میلکم۔ [2] سیاسی تاریخ ہند، جلد اوّل۔ مسٹر جنکس کی کارگزاری کا تذکرہ۔ دَورِ مارکوئس ہیسٹنگز۔

Marfat.com

دولت راؤ سیندھیا سے اور کبھی راجہ مان سنگھ والی جودھ پور سے درخواست کرتا رہا کہ میرے بال بچوں کی پناہ کیلئے جگہ مل جائے تو میں انگریزوں کا سارا علاقہ کلکتہ سمیت لُوٹ کھسوٹ کر کے تباہ و برباد کر دوں[۱] جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہوا۔ اس کے ساتھی قادر بخش اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا جسے گورکھ پور بھیج دیا گیا۔

مہاراجہ ہلکر جو پے در پے ناکامیوں کے بعد اپنا دماغی توازن[۲] کھو بیٹھا تھا، اندور کے چھوٹے سے علاقہ پر قانع بنا دیا گیا۔ امیر خاں کو ٹونک اور اس کے ساتھی غفور خاں کو سرونج کا علاقہ دے کر خاموش کر دیا گیا۔

اب صرف سیندھیا ایسا حکمران رہ گیا جس کے مسائل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بقول سر جان میلکم اُس نے اپنے افعال سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب اُس کے تمام حوصلے پست ہو چکے ہیں[۳]

امیر علی خاں سے سیّد صاحب کی علیحدگی سیّد صاحب کی رائے نہیں[۴] تھی کہ امیر علی خاں ہتھیار ڈال کر نوابی اختیار کر لیں، اور جب اُن کی رائے نہیں مانی گئی اور صلح کی طرف امیر علی خاں کا رجحان بڑھتا رہا تو سیّد صاحب نے امیر خاں کو وداع کیا اور صلح سے پہلے ہی ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے آئے[۵]

نواب امیر خاں جو سیّد صاحب کا وہی احترام کرتا تھا جو ایک شیخ اور پیر کا کیا جاتا ہے۔ اس جُدائی سے بہت متاثر ہوا۔ مگر نظریوں کے فرق کے بعد سیّد صاحب کے لئے لشکر میں قیام ناممکن تھا۔ تاہم امیر خاں نے اظہارِ عقیدت کے لئے اپنے لڑکے وزیر الدولہ کو حکم کیا کہ وہ دہلی تک سیّد صاحب کی رفاقت میں ہم رکاب جائیں[۶]

---

[۱] مراسلہ منجانب میجر جنرل سر جان میلکم بنام مارکوئس ہیسٹنگز مؤرخہ ۱۷ جولائی ۱۸۱۷ء۔ [۲] تاریخ اندور از فانی خاں۔ [۳] سیاسی تاریخ ہند جلد اوّل باب فقرہ ۵۹۲۔ [۴] سیرت سیّد احمد شہید جدید ایڈیشن ج ا صفحہ ۸۷۔ [۵] سوانح احمدی ص ۱۹۔ [۶] سوانح احمدی ص ۱۹۔

Marfat.com

بہر حال ۱۸۱۶ء ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں انگریز کے سامنے سرِ نیاز خم کر چکی تھیں ۔ انگریزی اقتدار کا جھنڈا درہ خیبر سے راس کماری تک اور بمبئی سے لے کر آسام اور برما کے سواحل تک لہرانے لگا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا کہ انگریزی اقتدار کے سامنے گردن ٹیڑھی کرسکے۔ البتہ ایک طاقت تھی جو کسی طرح انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں تھی۔ یہ وہی طاقت تھی جس کی تربیت شاہ ولی اللہ کے اُصول پر ہوئی تھی۔ جس کا نصب العین "فکِ کل نظام" یعنی "ہمہ گیر مکمل انقلاب" ایک عرصہ پیشتر قرار پا چکا تھا، مایوسی کے اس تاریک دَور میں اس طاقت کے بوڑھے امیر حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے بڑھاپے، بیماریوں اور نابینائی کے باوجود ہچکچانے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے قدم آگے بڑھایا۔ انقلاب کا ایک مکمّل پروگرام بنایا اور اپنے شاگردوں اور مریدوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر ذمّہ داریاں تقسیم کردیں۔

انقلابی پروگرام کی ذمّہ داریاں اور تقسیم کار

(۱) حضرت سیّد احمد صاحب کے زیرِ قیادت ایک گروپ بنایا گیا۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سیّد صاحب کے مشیرِ خاص قرار دیئے گئے، ان تینوں حضرات کی سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا کہ:

ا : مُلک میں دورہ کرکے روحِ انقلاب پیدا کریں۔

ب : رضاکار بھرتی کریں۔ اُن کو فوجی ٹریننگ دیں۔

ج : مالیہ فراہم کریں۔

د : دیگر ممالک سے تعلّقات پیدا کریں۔

ہ : فوجی کارروائی یعنی باضابطہ جنگ۔

(۲) دوسرا گروپ جس کی زمامِ قیادت خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب

Marfat.com

نے اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے سن رسیدہ مریدوں اور شاگردوں کو اس کا رُکن بنایا۔

ا : مرکز کو سنبھالنا اس کا فرض تھا۔

ب : تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جو شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ سے جاری تھا، اور ہمہ گیر انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جس کا باقی رکھنا ضروری تھا اِسی گروپ کے ذمّہ تھا۔

ج : اور جب پہلا گروپ محاذ پہ پہنچ جائے تو ملک کی فضا کو ہم نوا بنانا۔ نئے رضا کاروں کی بھرتی اور فراہمیٔ مالیہ وغیرہ کے تمام فرائض اِسی گروپ کے سپرد تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے علاوہ اس گروپ کے خاص خاص رُکن یہ تھے :

مولانا شاہ محمدؒ اسحاق صاحب	دہلوی
مولانا شاہ محمدؒ یعقوب صاحب	دہلوی
مفتی رشید الدّین صاحب	دہلوی
مفتی صدر الدین صاحب	دہلوی
مولانا حسن علی صاحب	لکھنؤ
مولانا حسین احمد صاحب	ملیح آباد
مولانا شاہ عبد الغنی صاحب	دہلوی

سیّد صاحب کی قیادت کی وجہ | علم و فضل[1]، تحریر و تقریر، مقبولیت اور

[1] علم و فضل کی شہادت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ خود استاذ العلما حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک نہایت اہم معاملہ میں اُن کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ "ایشاں در علم تفسیر و حدیث وفقہ و اصول و منطق وغیرہ از فقیر کمتر نیستند۔ مہر و دستخطِ ایشاں گویا دستخطِ فقیر ست۔"

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا یہ مکتوب جس میں یہ فقرہ ہے منشی خیر الدّین صاحب لکھنوی کے نام تھا۔ یہ فرضیتِ حج کے سلسلہ میں تھا (اس کی کسی قدر تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی) آپ نے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

خاندانی شہرت میں مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید، سید صاحب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ عمر میں بھی یہ دونوں بزرگ سید صاحب سے بڑے تھے۔ کیونکہ جب سید صاحب کو اس گروپ کا لیڈر بنایا تھا تو سید صاحب کی عمر تقریباً چالیس سال تھی، اور مولانا عبدالحی صاحب کی عمر تقریباً پچاس سال اور مولانا اسمٰعیل صاحب کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ خاندانی لحاظ سے مولانا عبدالحی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد تھے اور مولانا اسمٰعیل صاحب حقیقی بھتیجے۔ مگر سید صاحب کو زعیم اور قائد اس لئے بنایا گیا کہ محاذِ جنگ کا جو عملی تجربہ سید صاحب کر چکے تھے، ان دونوں بزرگوں کو اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ وہ رُوحانی کمالات تھے جن میں سید صاحب کا درجہ پوری جماعت میں سب سے فائق اور بڑھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سید صاحب کے پیر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے تمام شاگردوں اور تمام اقارب و اعزہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ سید صاحب سے باقاعدہ بیعت ہو کر اخلاقی اور رُوحانی کمالات کا استفاضہ کریں۔

ہمہ گیر انقلاب جس کا منشا صرف سیاسی نہ ہو بلکہ سماجی اصلاح بھی اس کا اہم مقصد ہو، اُسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اُس کا لیڈر صرف مدبر و مفکر یا جرنیل ہی نہ ہو، بلکہ رُوحانی لحاظ سے بھی یہ درجہ رکھتا ہو کہ اُس کو شیخ وقت کہا جا سکے سید صاحب کے یہی رُوحانی اور اخلاقی کمالات تھے جنہوں نے بڑے بڑے اہلِ علم کو یہاں تک گرویدہ بنا دیا کہ بقول ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر:

اُن کے مرید اُن کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس مکتوب گرامی میں ان دونوں بزرگوں کے لئے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود ان بزرگوں کی اعلیٰ قابلیت کے لئے بہترین سند ہیں۔ آپ نے مولانا عبدالحی صاحب کو شیخ الاسلام اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو حجۃ الاسلام اور دونوں کو تاج المفسرین، فخر المحدثین، سرآمد علماء محققین جیسے القاب سے ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید ج ۱ ص 89 بحوالہ مخزن احمدی۔

Marfat.com

ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے اور صاحبِ جاہ علماء (مولانا عبدالحی صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا عنایت علی و مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ) عام خدمت گاروں کی طرح اُنکی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔[1]

حرکتِ عمل ○ انقلاب انگیز دورے

ایک طرف عوام کے وہ جذبات تھے جن کو احساسِ شکست برانگیختہ کر رہا تھا مگر بے رحم اجنبی اقتدار کی فوجی قوت ان کو دبائے ہوئے تھی۔ اور دوسری جانب خاندانِ ولی اللہ کی تربیت گاہ کے وہ اثرات تھے جنھوں نے منتشر طور پر ہمہ گیر انقلاب کے بیج بہت سے دماغوں میں بو دیئے تھے۔ ان جذبات و احساسات کے ساتھ جب لوگوں کو اس پارٹی کی تشکیل کا علم ہوا تو جگہ جگہ سے دعوت نامے پہنچنے لگے۔ چنانچہ دوروں کا پروگرام بنایا گیا اور آئندہ سات سال میں اس گروپ نے مُلک اور بیرونِ مُلک کے تین دورے کئے۔[2]

خدا سے تعلّق، قربانی اور ایثار، ہمدردیٔ خلق اللہ، باہمی تعاون، ضبط و تحمّل، حق پسندی اور فداکاری اس جماعت کا سرمایہ تھا، اور صرف اسی سرمایہ کے بھروسہ پر کوچ شروع کیا گیا۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صـ۲۲ ۔ [2] حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعتِ طریقت کیلئے اور دوسری دفعہ بیعتِ جہاد لینے کے لئے دورے پر بھیجا۔ اس کے بعد سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا۔ تاکہ ان کی تنظیمی قوّت کا تجربہ ہو جائے۔ جب قافلہ ۱۲۳۹ھ میں واپس آیا تو امام عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صـ۱۵۳)۔

Marfat.com

سیّد صاحب کے قافلہ کا پہلا دورہ

از دہلی تا رائے بریلی و از رائے بریلی تا بنارس و لکھنؤ

مارکوئس ہیسٹنگز کی سخت گیر پالیسی حکومتوں کے تختے اُلٹ رہی تھی۔ باجی راؤ پیشوا، اپّا صاحب والئ ناگپور اور پنڈاریوں پر پے درپے فوج کشی ہو رہی تھی۔ ہلکر اور نواب امیر خاں اور سیندھیا کی طاقتوں کے گرد فوجی حصار قائم کیا جا رہا تھا[1] کہ آزادی کے پروانوں اور خلقِ خدا کے خادموں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس کی تعداد صرف پچاس تھی ۱۸۱۸ء، ۱۲۳۱ھ میں دہلی سے روانہ ہو گیا[2]

ہمہ گیر سماجی اور معاشی انقلاب اس کا نصب العین تھا۔ اُس نے اپنے دورہ کا ظاہری مقصد صرف سماجی اصلاح قرار دیا۔ مارکوئس ہیسٹنگز کے دور میں سیاسی فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا تقاضا بھی یہی تھا۔ سیّد صاحب، مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے علاوہ اس قافلہ کے نمایاں افراد یہ تھے۔

مولانا محمد یوسف صاحب خلف حضرت شاہ اہل اللہ صاحب (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بھتیجے) مولوی وجیہ الدّین سہارن پوری، مولانا وحید الدین صاحب، اُن کے بھائی حافظ قطب الدّین صاحب (پھلت) حکیم مغیث الدین صاحب (سہارن پور)، شاہ ابو سعید صاحب دہلوی خلف حضرت شاہ غلام علی صاحب۔

آپ نے دہلی کے شمالی جانب کوچ شروع کیا۔ غازی الدّین نگر (موجودہ غازی آباد)

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، سیاسی تاریخ ہند باب ہفتم، از سر جان میلکم۔

[2] روانگی کے وقت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) نے ایک دستارِ سیاہ اور ایک پیراہن سفید جو شاہ صاحب کا پہنا ہوا تھا، اپنے دستِ مبارک سے پہنا کر سفر کی رخصت مرحمت فرمائی۔ (سوانح احمدی ص۲۵)

Marfat.com

مراد نگر، میرٹھ، سردھنہ، بڑھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند، سہارن پور ہوتے ہوئے گڈھ مکتیسر پہنچے۔ وہاں سے رام پور، بریلی، شاہجہان پور تشریف لے گئے۔ تقریباً چار ماہ اس دورہ پر صرف ہوئے۔ ابھی اس دورہ کا پروگرام جاری تھا کہ رائے بریلی میں آپ کے برادرِ حقیقی سیّد اسحاق صاحب کی وفات ہوگئی۔ اب مجبوراً آپ کو وطن جانا پڑا۔ پورا قافلہ آپ کے ساتھ تھا جس کی تعداد پچاس سے بڑھ کر اسّی ہوگئی تھی۔

خانگی ضرورتوں سے زیادہ مقاصدِ تحریک کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ عرصہ قیام کرکے نئے ساتھیوں کی تربیت کریں۔ چنانچہ رائے بریلی کی خاندانی خانقاہ (تکیہ شاہ علم اللہ) میں چند ماہ قیام کرکے ساتھیوں میں نئی روحِ عمل پیدا کی گئی۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بھی آپہنچے جو اپنی اپنی جگہ قافلہ سے متاثر ہوچکے تھے، مگر اس وقت قافلہ کے ساتھ روانہ نہیں ہوسکے تھے۔ ان نو واردوں نے قافلہ کی تعداد اسی قیام کے زمانہ میں ایک سو ستّر تک پہنچادی۔ اس طویل قیام کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ آپ کے عجیب و غریب قافلہ کا چرچا پورے اودھ اور اضلاع کانپور و الہ آباد وغیرہ میں پھیل گیا۔ جگہ جگہ سے بلاوے آنے لگے۔ اب آپ نے رائے بریلی سے الہ آباد کا رُخ کیا۔ دیہات، و قصبات میں تھوڑا تھوڑا قیام کرتے ہوئے پورے ایک مہینہ بعد الہ آباد پہنچ سکے۔ الہ آباد سے کانپور پھر بنارس، سلطان پور وغیرہ قیام کرتے ہوئے آپ وطن تشریف لائے، اور تقریباً دو ہفتہ رائے بریلی قیام کرکے صوبہ اودھ کے دارالسلطنت یعنی لکھنؤ تشریف لے گئے۔

سماجی اصلاحات اور جہادِ فی سبیل اللہ کے لئے تربیت

اس دورہ میں زیادہ تر سماجی اصلاحات کی گئیں۔ مثلاً سہارن پور میں معلوم ہوا کہ وہاں پسماندہ برادریوں کی حالت یہ ہے کہ پسماندہ برادری کا کوئی فرد:

۱: وہ کھانا نہیں پکا سکتا جو امراء کے یہاں خاص طور سے پکائے جاتے ہیں۔

۲: وہ کسی بڑے آدمی کی دعوت نہیں کرسکتا۔

Marfat.com

۳: نہ اپنے بچہ کا وہ نام رکھ سکتا ہے جو کسی بڑے آدمی کا ہو۔

سید صاحب کے قافلے نے سب سے پہلے اس مرض کی اصلاح کی۔ اِس کوشش میں بیس روز تو صرف ہوگئے۔ مگر کامیابی ایسی ہوئی کہ آج اس کا تذکرہ بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

دیوبند میں شیخ حفیظ اللہ صاحب کے معزز خاندان میں "السلام علیکم" کے بجائے آداب اور بندگی کا رواج تھا۔ آداب عرض یا بندگی کے لفظ سے مخاطب کی تعظیم تو ہو جاتی ہے مگر مساوات، اور بھائی چارہ کی تلقین جو "السلام علیکم" کی رُوح ہے۔ فنا ہو جاتی ہے۔ مغرور گھرانوں کو یہ بات ناگوار ہونے لگی تھی کہ چھوٹا آدمی اُن کو "السلام علیکم" کہے۔ یہ لفظ صرف برابر کے درجہ والوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور چھوٹے آدمیوں کا فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ آداب عرض، آداب یا بندگی جیسے الفاظ استعمال کریں۔ رفتہ رفتہ ہر چھوٹے آدمی نے بڑے کو "آداب عرض" کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بیٹا باپ کو، چھوٹا بھائی بڑے بھائی کو السلام علیکم نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ آداب عرض کہتا تھا۔ چونکہ تکلفاً ہر شخص اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کیا کرتا ہے لہٰذا بڑے لوگ بھی آداب عرض ہی کہنے لگے، اور چھوٹے لوگوں کے لئے بندگی کا لفظ مخصوص ہوگیا۔

سید صاحب کی انقلابی جماعت جس کا بنیادی مقصد تھا، کہ انسانی بھائی چارہ قائم کیا جائے اور اُونچ نیچ کے جراثیم دماغوں سے نکالے جائیں، اُس نے سب سے پہلے اپنے خاندان سے اس رواج کو ختم کیا۔ پھر جہاں جہاں یہ مرض موجود تھا، اس کی اصلاح ضروری سمجھی۔ چنانچہ دیوبند میں شیخ صاحب کے خاندان سے بھی یہ رواج[۱] موقوف کرایا اور آج نہ صرف کوئی ایک خاندان بلکہ دیوبند کا ہر ایک خاندان

[۱] پہلی دفعہ جب شیخ حفیظ اللہ صاحب نے اپنے والد صاحب کو جا کر "السلام علیکم" کہا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا مجھے معلوم ہے کس نے تمہیں سکھایا ہے میں اُسے سمجھوں گا۔ مگر رفتہ رفتہ والد صاحب خود متاثر ہوئے اور یہاں تک بدلے کہ صاحبزادے کے ہاتھ پر جن کو سید صاحب سے خلافت ملی تھی بیعت کر کے داخلِ سلسلہ ہوگئے (سیرت سید احمد شہید ص۱۰)

Marfat.com

السّلام علیکم کے علاوہ کسی اور لفظ سے آشنا نہیں ہے۔ البتہ ہندو دوستوں کو آداب عرض کہا جاتا ہے۔

ہندو مسلم بھائی چارہ | مسلمانوں کی طرح ہندو بھی سیّد صاحب کے قافلہ کا اعزاز و احترام کرتے تھے۔ چنانچہ غازی الدّین نگر میں جن لوگوں نے ندرانہ پیش کرکے عقیدت و محبّت کا اظہار کیا، اُن میں ہری رام صاحب تحصیل دار کا نام بھی خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔[1]

سہارن پور میں قیام زیادہ رہا، تو وہاں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی آپ سے تعلق بڑھایا۔ آپ بھی اُن کے یہاں تشریف لے گئے اور کھانا کھایا۔ تحصیل دار دھوکل سنگھ کے یہاں دعوت کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کو سیرت سیّد احمد شہیدؒ کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ایک روز تحصیل دار دھوکل سنگھ آئے اور کھڑے کھڑے عرض کیا کہ کل اس غلام کے یہاں جناب کی دعوت ہے۔ آپ نے فرمایا تشریف رکھیئے انہوں نے کہا کہ جب تک میری دعوت قبول نہیں ہوگی، نہیں بیٹھوں گا آپ نے فرمایا۔ قبول ہے۔ تحصیل دار بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ کل کس وقت سواری لے کر حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ دو گھڑی دن نکلے کسی کو بھیج دیا جائے، ہم آجائیں گے۔ دوسرے روز وقت مقرّرہ پر اپنے عملہ کے دو سو آدمیوں کے ساتھ جن میں سے اکثر مسلمان شرفا تھے حاضر ہوئے۔ آپ سوار ہو کر اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اُن کے تمام مسلمان ہمراہی شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے۔ تحصیل دار نے بڑی پُر تکلف انواع و اقسام کے کھانوں سے ضیافت کی۔ کھانے کے بعد عطریات اور پان سے تواضع کی۔ شام کے وقت پھر حاضر ہو کر تمام قافلہ کو اپنے

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید صـ۹۲

Marfat.com

ساتھ لے گئے۔ اس وقت پلاؤ وغیرہ اور اکثر مٹھائیاں تھیں تحصیلدار صاحب نے اعزاز واکرام، تواضع اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔[1]

ورزش اور چاند ماری اصلاحی خدمات اور رُوحانی مشاغل کے ساتھ سپاہیانہ ورزشیں بھی جاری رہتیں۔ قصبہ پھلت چونکہ خاندان شاہ ولی اللہ کا اصل وطن تھا وہاں دو ہفتہ سے زیادہ قیام کا موقع ملا، تو باقاعدہ مٹی کا ایک تودہ تیار کرالیا گیا۔ جس پر نشانہ کی مشق کی جاتی تھی۔ پہلے تقریباً ایک گھنٹہ ورزش ہوتی۔ بدن پر مالش کی جاتی۔ پھر نشانہ کی مشق کی جاتی۔

لکھنؤ میں تقریباً تین ماہ قیام رہا۔ قیام گاہ سے کہیں تشریف لے جاتے تو بسا اوقات ایک فوجی سپاہی کی طرح پورے ہتھیار لگا کر تشریف لے جاتے۔ ایک روز آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ بھی پورے ہتھیار لگائے ہوئے تھے، اور آپ کے ساتھی بھی اسی طرح ہتھیار بند تھے۔ عبدالباقی خاں صاحب نے آپ کی یہ شان دیکھی تو عرض کرنے لگے۔ حضرت آپ کی تمام باتیں بہت اچھی ہیں مگر یہ تلوار بندوق وغیرہ اسباب جہالت آپ کے بدن پر زیب نہیں دیتے۔ آپ جس خاندان کے چشم وچراغ ہیں یہ اسلحہ بندی اُس کی روایات کے بھی خلاف ہے۔ آپ نے عبدالباقی خاں صاحب کے یہ الفاظ سُنے تو غصّہ سے چہرہ سُرخ ہوگیا۔ فرمانے لگے۔ جس چیز کو رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے استعمال کیا، آپ اس کو اسباب جہالت فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہتھیار باندھ کر میدانِ جنگ میں تشریف لے جائیں اور آپ اسلحہ بندی کو شانِ بزرگانہ کے لئے عار قرار دیں۔ تف ہے اس شانِ بزرگانہ پر۔[2]

جفاکشی اور ضبط وتحمل رائے بریلی میں چند ماہ قیام رہا۔ اس کے متعلق سوانح نگاروں کا متفقہ بیان یہ ہے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۰۹ و صفحہ ۱۱۱۔ [2] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۶۷

"یہ قیام عجیب ذوق و شوق، لذت و حلاوت اور جفاکشی کا تھا، اور مہاجرین کے قیام مدینہ منورہ سے بہت مشابہ تھا۔ سید صاحب اور رفقاء جن میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء، اور صاحب سلسلہ مشائخ بھی تھے، بڑے ذوق سے اپنے ہاتھوں سے مشقت کے کام کرتے، لکڑیاں چیرتے گھاس چھیلتے، اینٹیں تھاپتے، مسجدیں تعمیر کرتے۔ فاقہ اور ہر حال میں خوش رہتے۔ ان میں اچھے اچھے عالی خاندان، خوش حال امیر اور رئیس زادے بھی تھے۔ بہت سے نازک طبع اور ناز پروردہ نوجوان تھے۔ اُن کے گھر میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ بعضوں کے سینکڑوں ہزاروں معتقد و مرید تھے۔ مگر گھر بار، عیش و آرام مشیخت و مخدومیت چھوڑ کر اس در پر پڑے ہوئے تھے اور ہزار درجہ خوش تھے۔ انہیں میں شاہ عبدالرحیم صاحب بھی تھے جن کے ہندوستان میں ہزار ہا مرید تھے۔ لیکن وہ یہاں مخدوم سے خادم اور مراد سے مرید بنے ہوئے تھے۔ مولانا محمد یوسف پھلتی مخدومِ جہاں، اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ مولانا عبدالحیٔ صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب بھی تھے۔"[1]

خود امیر قافلہ یعنی سید صاحب کی حالت یہ تھی :

"عام لوگوں کے ساتھ مشقت کے کاموں میں شریک ہوتے۔ لکڑیاں چیرتے، بوجھ اُٹھاتے"۔ (سیرت ص ۱۱۹)

قافلہ کے لئے سوال کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایسا شخص پارٹی میں شریک نہیں رہ سکتا تھا جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ جب پارٹی کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو، تو یہ اصول فاقہ کشی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور فاقہ کی عادت وہ زینہ ہے کہ جو قدم یہاں مضبوطی سے جم جاتا ہے بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو ڈگمگا نہیں سکتی۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۱۹ و ص ۱۲۰

Marfat.com

یہ خدائی فوج بھوک پیاس برداشت کرنے کی یہاں تک عادی ہوگئی تھی کہ کئی کئی وقت کا فاقہ بھی اس کی بشاشت اور زندہ دلی میں فرق نہیں پیدا کر سکتا تھا۔

مولانا محمد علیؒ صاحب، حضرت سید صاحب کے بھانجے تھے۔ آپ مخزن احمدی کے مصنف بھی ہیں جس میں سید صاحب کے حالات آپ نے قلمبند کئے ہیں۔ آپ بھی قافلہ میں داخل ہوئے۔ ابھی چند روز گذرے تھے کہ قافلہ میں فاقہ کی نوبت آگئی۔ اتفاق سے اُسی روز بارش کی جھڑی لگ گئی۔ اب گویا فاقہ اور جھڑی میں مقابلہ تھا۔ نہ جھڑی ختم ہونے میں آتی تھی، نہ فاقہ ٹوٹنے کی کوئی صورت نکلتی تھی۔ مولانا صاحب نو گرفتار تھے۔ یہ بھوک سے بہت پریشان، مگر عجیب تماشا دیکھ رہے تھے کہ یہ تو بھوک اور فاقہ سے نڈھال اور سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے ہنسی مذاق اور زندہ دلی کی یہ عالت کہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کو فاقہ ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت فاقہ کی عادی ہو، اُس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں کہ تہائی چوتھائی پیٹ کھا کر وقت گذار دے۔ چنانچہ آپ کی سوانح میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ تھوڑا سا کھانا بہت سے آدمیوں کے لئے کافی ہوگیا۔

سوانح نگار اس کو سید صاحب کی کرامت قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قافلہ کے سب ہی ساتھیوں کی کرامت تھی کہ وہ لذتِ فاقہ سے آشنا اور بھوکے پیٹ کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے[2]۔

اس سے بہتر دوسری توجیہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص۱۱۳ و ۱۱۴۔ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے کہ مومن ایک آنت بھر کھاتا ہے اور غیر مومن سات آنت بھر۔ یعنی جو صاحبِ ایمان روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتا ہے پوری خوراک کا ساتواں حصہ بھی اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ غذا صرف اس لئے استعمال کرتا ہے کہ زندگی باقی رہ سکے اور جو شخص روحانیت سے بیگانہ اور لذتوں کا حریص ہوتا ہے اس کی حرص پوری خوراک کھا کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ پیٹ کے ہر ایک گوشہ کو پُر کرتا ہے پھر بھی نظر کھانے پر رہتی ہے۔ محمد میاں

Marfat.com

ان بزرگوں کی عادتِ ثانیہ بن گئے تھے کہ مومن کے لئے چند لقمے کافی ہیں جن سے کمر سیدھی رہ سکے۔ اگر اس پر قناعت نہ ہو تو صرف ایک تہائی پیٹ کھائے۔ باقی حصہ پانی اور سانس کے لئے چھوڑ دے۔[1]

سادگی اور ہر ایک حالت کی برداشت اس تربیت کا ایک اہم جزو تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال کے لئے اسی دورے کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

جب رائے بریلی سے الہ آباد کا سفر ہو رہا تھا تو راستہ میں ایک روز ایسے مقام پر ٹھہرنا ہوا، جو بے چراغ ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے کھچڑی پکانے کا سامان فراہم ہوا۔ رکابیاں یا سینیاں ساتھ نہ تھیں۔ ایک کوئیں کی پختہ مینڈ کو دھو کر صاف کیا۔ کھچڑی اُسی پر ڈال لی اور درویشانِ با خدا کا یہ قافلہ خوشی خوشی کھا کر ذکر و فکر میں مشغول ہو گیا۔[2]

الہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب کے بیش قیمت ہدایا میں ایک نہایت قیمتی قالین بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش ہوا۔ تمام ہدایا ضروریاتِ جہاد میں کام آئے۔ اس قالین پر سید صاحب ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خاطر سے بیٹھے۔ پھر ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ اُس کے پاس لحاف نہیں ہے۔ سید صاحب نے یہ قالین اُٹھا کر اُس کو دے دیا۔[3]

بنارس میں تیموری شاہزادے بیعت ہوئے تو اُنھوں نے بیش قیمت کپڑے نذر کئے۔ آپ نے اپنے خزانچی مولانا محمد یوسف صاحب کو حکم فرمایا کہ ان کو فروخت کر کے گاڑھے اور گزی کے تھان خرید لو اور تمام ساتھیوں میں تقسیم کر دو، تاکہ وہ ضرورت کے مطابق کپڑے بنوالیں۔[4]

جہادِ حریت کی ترغیب لکھنؤ میں ایک مرتبہ کچھ لوگ بیعت ہوئے اور آپ سے تبرک کی درخواست کی۔ آپ نے اُن کو کچھ روپے برکت کے لئے عطا فرمائے اور نصیحت فرمائی کہ اپنے اپنے گھر کی عورتوں کو ہمیشہ تاکید کرتے رہو کہ کسی طرح کا شرک نہ کریں،

---

[1] ترمذی شریف وغیرہ۔ [2] سید احمد شہید ص۱۵۶۔ [3] ایضاً ص۱۵۷۔ [4] ایضاً ص۱۵۸

Marfat.com

اور جو اللہ تعالیٰ تم کو روزی کی فراغت دیوے تو نیّت خالص جہاد فی سبیل اللہ کی رکھنا، خواہ جان سے خواہ مال سے۔ اور اگر نیّت خالص نہ ہوگی تو تمہارے حق میں نقصان ہوگا۔ اس بات کو خُوب سمجھ لو۔

اُنھوں نے عذر کیا کہ اگر ہم اپنی جان سے نیّت جہاد کی کریں اور جائیں تو یہاں ہمارے اہل و عیال کی کون خبر لے گا اور کون کھانا کپڑا دے گا۔ اور جو جہادِ مال کی نیّت کریں تو ہمارے پاس مال کہاں؟ فرمایا جب اللہ تعالےٰ تمہیں مال و دولت دے تب تم پر یہ حکم ہے، اس کے بغیر نہیں۔ سب نے اس کا عہد کیا کہ انشاء اللہ تعالےٰ ایسا ہی کریں گے۔[1]

امان اللہ خاں، سبحان خاں، مرزا ہمایوں بیگ، غلام رسول خاں، غلام حیدر خاں اور صدر خاں وغیرہ کا لکھنؤ میں ایک گینگ تھا جو چوری اور قزاقی میں کمال رکھتا تھا۔ قافلہ کی شہرت سُن کر ایک روز امان اللہ خاں اور سُبحان خاں قافلہ والوں کو دیکھنے آئے۔ سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیّد صاحب کے نصیحت آمیز ارشادات نے پہلی ہی مجلس میں اُن کی کایا پلٹ دی۔ یہ اپنی تمام حرکتوں سے تائب ہو کر قافلہ میں شریک ہو گئے۔

اُن کی اصلاح سے اُن کے دوسرے ساتھی بھی متاثر ہوئے۔ وہ بھی سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تمام حرکتوں سے تائب ہو گئے۔ جب سیّد صاحب لکھنؤ سے روانہ ہونے لگے تو اُن لوگوں نے بھی ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ سیّد صاحب نے فرمایا:

"ابھی تم اپنے مکان پر رہو۔ جب ہم ہجرت کریں گے تم کو ضرور ساتھ لیں گے۔"[2]

فقیر محمد خاں ایک رسالہ کے رسالدار تھے جو سیّد صاحب سے بیعت ہو چکے تھے۔ آپ نے غلام رسول خاں وغیرہ کو اُن کے رسالہ میں بھرتی کرا دیا۔[3] اس طرح جائز

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص۱۴۴۔ [2] ایضاً ص۱۵۰۔ [3] ایضاً ص۱۵۱

ذریعۂ معاش بھی بہم ہوگیا اور فوجی تربیت کا انتظام بھی ہوگیا۔

اسی طرح زنانوں میں اصلاح اور بیعت کا سلسلہ چلا۔ اُن کو بھی خاص خاص اصلاحی ہدایات دے کر فقیر محمد خاں صاحب رسالدار کے رسالہ میں بھرتی کرا دیا۔[1] قیام لکھنؤ کے زمانہ میں خود سید صاحب کی حالت یہ تھی :

"آپ اکثر اسلحہ لگاتے تاکہ دوسروں کو اس کی اہمیت معلوم ہو، اور شوق ہو۔ آپ نے ایک مرید کو تفنگچہ دیا اور کہا۔ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہتھیار لگاؤ۔ پیٹ بھر کر کھاؤ اور اسلحہ کے استعمال کی مشق کرو۔ اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں"۔

مصنف وقائع احمدی کا بیان ہے :

"آپ کو سب سے زیادہ خیال جہاد کا رہتا تھا۔ جس کو مضبوط و توانا دیکھتے، فرماتے۔ یہ ہمارے کام کا ہے۔ مورائین (ضلع اناؤ) کے شمشیر خاں اللہ بخش، شیخ رمضان اور مہربان خاں ملاقات کو آئے۔ چاروں بڑے ڈیل ڈول کے نوجوان تھے۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں۔ پیرزادے لوگ ہمارے کام کے نہیں ہیں اور بہت تعریف کی۔ یہ نوجوان آپ کے اخلاق سے بہت متأثر ہوئے اور آپ کے حلقہ میں داخل ہو گئے"۔[2]

رفتہ رفتہ آپ کا کیمپ فوجی تربیت گاہ بن گیا، اور جو وقت مشاغلِ صوفیاء یعنی ذکر و مراقبہ میں صرف ہوتا تھا، فنونِ حرب اور فوجی پریڈ میں صرف ہونے لگا۔ یہ تبدیلی کچھ لوگوں کو اوپری معلوم ہوئی۔ چنانچہ ایک وفد نے خاص طور پر حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا شک و شبہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سپاہیانہ کرتبوں کی مشق بظاہر مادی چیز ہے مگر اس کا مقصد نفع اندوزی یا ذاتی سربلندی نہیں۔ بلکہ

---

[1] سیرت سید احمد شہید صـ۱۵۲ - [2] وقائع احمدی بحوالہ سیرت سید احمد شہید صـ۱۶۷ -

Marfat.com

اس کا مقصد ہے خدمتِ خلق، مظلوموں کی ہمدردی، اعلیٰ اور بلند مقاصد کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دینا ـــ تصوّف، سُلوک اور فقیرانہ زندگی کی اصل رُوح یہی ہے۔ جو تصوّف اس رُوح سے محروم ہو وہ اکارت ہے۔ پس ان چیزوں میں مشغول رہنا، مادہ پرستی نہیں بلکہ حقیقی رُوحانیت اور اعلیٰ قسم کا تصوّف ہے۔ آپ نے مزید تشفی کیلئے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی کا حوالہ دیا جو اس زمانہ کے بہت بلند پایہ صوفی تھے اُن کے ہزاروں مرید تھے، اور سہارن پور سے قافلہ میں شریک ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا:

"سیّد صاحب کو دیکھ کر مَیں نے اپنے تمام مریدوں سے کہہ دیا تھا کہ اب رُوحانی کامیابی کا راستہ صرف وہی ہے جو سیّد صاحب اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہی راستہ اختیار کرو اور سیّد صاحب سے بیعت ہو جاؤ۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو، مَیں خانقاہ کی پُرسکون زندگی ترک کر کے قافلہ کے ساتھ لگا ہُوا ہوں۔ کہاں وہ آرام و سکون جو خانقاہ میں میسّر تھا اور کہاں یہ زحمت و تکلیف کہ اینٹیں پاتھتا ہوں، دیواریں تعمیر کرتا ہوں، گھاس چھیلتا ہوں لکڑی چیرتا ہوں مگر جو خیر و برکت اور رُوحانی اطمینان اس میں میسّر ہے خانقاہی زندگی میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔"[1]

مصنّف وقائع احمدی کا بیان ہے:

"چونکہ حاجی صاحب مانے ہوئے باکمال پیر تھے جو تصوّف کے تمام کمالات میں اُونچا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر سُن کر سب لوگ مطمئن ہو گئے اور پھر دل و جان سے جہاد کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دن رات یہی مشغلہ تھا۔ بھرماری، تیراندازی، چونگ لگاتے اور فنونِ سپہ گری کی پُوری مشق کرتے۔" (سیرت سیّد احمد شہید ص ۱۷۰)

[1] سیرت سیّد احمد شہید ص ۱۶۸ تا ص ۱۷۰ خلاصہ۔

Marfat.com

مقامی نقیب اور ذمّہ دار کارکن

سیّد صاحب جہاں جہاں پہنچتے تھے، ایسا انتظام[1] کرتے جاتے تھے کہ اِس عارضی دورہ کے اثرات ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیں، اور جو بیج بوئے گئے ہیں وہ درخت بن کر پھلیں اور پھُولیں۔ چنانچہ ہر جگہ اپنے خلیفہ مقرر کرتے جاتے تھے، جن کو ہم نقیب کے نام سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ذیل کے نقشہ میں سیّد صاحب کے خلفاء اور اُن حضرات کے نام درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے قافلہ کو اپنے یہاں دعوت دے کر بُلایا یا قافلہ کے پہنچنے پر قافلہ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔

مقام		نام
غازی الدین نگر	:	حافظ عبداللہ صاحب امام مسجد۔ شیخ عبدالرحمن صاحب۔ شیخ رمضان صاحب۔ عبدالشکور خان صاحب۔ امام خان صاحب جمعدار۔
مرادنگر	:	مولوی ابوالقاسم صاحب تھانہ دار۔ یہ اس جماعت کے مشہور اور بہت باعزّت و عظمت رکن مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے صاحبزادے تھے۔ سرکاری ملازم تھے مگر تحریک سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔
میرٹھ (دس روز قیام)	:	قاضی حیات بخش۔ مولوی احمداللہ صاحب خلف قاضی صاحب مذکور۔ داروغہ محمد راحم صاحب۔ منشی محمدی انصاری بڑوانی۔ مولوی محمد بخش

---

[1] انقلابی تحریک کا اگر کوئی دفتری نظام ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ راز کی حیثیت رکھے۔ عام لوگوں کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیئے اور عام انجمنوں کی طرح ممبرسازی اور جمہوری قسم کا انتخاب تو یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ کوئی انقلابی پارٹی اس کو اپنا سکے۔ سیّد صاحب کی اس تحریک میں بھی دفتری تنظیم کا پتہ نہیں چلتا، اور نہ اس کے باضابطہ صدر یا سیکرٹری معلوم ہوتے ہیں۔ صرف یہ نقیب اور خلفاء ہی اپنی اپنی جگہ تحریک کے ذمّہ دار تھے اور انہیں کے دم سے اس تحریک کی جڑیں تقریباً چالیس برس تک ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلتی رہیں۔

Marfat.com

صاحب (پندرہ متوسلین سمیت) - مولوی خدا بخش صاحب رئیس میرٹھ قدن خاں - صدر الدین صاحب اور اُن کے بھائی کریم بخش صاحب روٹی والے - محمد تقی صاحب قصاب (جو انگریزوں میں گوشت کے بڑے ٹھیکیدار تھے) - بدر الدین صاحب - خواجہ محمد خانساماں -

میرٹھ سے سردھنہ جاتے ہوئے سردھنہ (ضلع میرٹھ): موضع دانتل - موضع پائلی - موضع کھروی میں تھوڑی دیر قیام فرمایا جہاں نماز کا وقت ہوگیا، نماز پڑھی - شیخ بلند بخت دیوبندی - منشی خواجہ محمد حسن پوری - حافظ امان اللہ نشان بردار - ابو علی بخش - نصر اللہ - نتھے خاں - بہر خاں و داراب خاں پسران نتھے خاں - سلو خاں رسالدار - مراد خاں - مدے خاں - عظیم اللہ بیگ کمیدان -

ان میں سے بعض نے سید صاحب کی زیرِ قیادت جہاد میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں - سپاہیوں نے دعوتِ طعام پر اصرار کیا تو فرمایا - اس شرط پر منظور کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں، پکایا جائے - اُنہوں نے مان لیا - فرمایا، جَو کی روٹی اور ماش کی دال کھاؤں گا، ایسی دعوت میں امیر غریب سب شریک ہو سکتے ہیں -

بڑھانہ (ضلع میرٹھ - قیام بارہ روز): مولانا عبدالحی صاحب جو قافلہ کے معزز رکن اور سید صاحب کے دستِ راست تھے - بڑھانہ کے باشندے تھے - ان کے یہاں قافلہ کا قیام ہوا -

میاں نظام الدین صاحب چشتی - شیخ علاؤ الدین صاحب - شیخ محمد حسن صاحب - شیخ ابوبکر صاحب - بڑھانہ کے حضرات اس علاقہ میں حضرت سید صاحب کی تحریک کے خاص کارکن تھے -

بڑھانہ سے پھلت جاتے ہوئے: موضع ایڑنی - موضع چولی - موضع بھرسور میں تھوڑی دیر قیام رہا -

پھلت (ضلع مظفر نگر): شیخ ولی محمد، اُن کے والد محمد فضیل - شیخ غلام محمد صاحب - شیخ محمد عارف صاحب - حافظ غلام علی صاحب - حافظ معین الدین صاحب

Marfat.com

قیام سترہ روز: حافظ احمد الدین صاحب ۔ عبد العلی صاحب ۔ شیخ محمد عثمان صاحب میاں عصمت اللہ صاحب ۔ ان کے والد شیخ صبو اللہ میاں سعد الدین صاحب ۔ حافظ محمد حسین صاحب ۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے خالہ زاد بھائی میاں جمال صاحب ۔ حافظ محمد عثمان صاحب ۔ برادر مولانا محمد یوسف صاحب ۔ عبد الرزاق صاحب ۔ حافظ قطب الدین صاحب ۔ حکیم قمر الدین صاحب ۔ میاں صلاح الدین صاحب ۔ شیخ عبد الرؤف صاحب ۔ شیخ عبد الحکیم صاحب ۔ محسن خاں صاحب ۔

پھلت سے مظفر نگر جاتے ہوئے : موضع بیوپاڑی میں ناشتہ کیا ۔

مظفر نگر } قاضی نجم الدین صاحب (پندرہ آدمیوں سمیت)

دیو بند } سید مقبول صاحب ۔ مولوی شمس الدین صاحب ۔ شیخ حفیظ صاحب

قیام دس روز } دیو بندی ۔ شیخ رجب علی صاحب ۔ اُن کے فرزند منور علی صاحب ۔ مولوی فرید الدین صاحب ۔ مولوی بشیر اللہ صاحب ۔

املیا : جب دیو بند میں آپ کا قیام تھا تو چند گھنٹوں کے لئے آپ موضع املیا بھی تشریف لے گئے ۔ حافظ عبد اللہ صاحب اور اُن کے بھائی کریم الدین صاحب اور نظام الدین صاحب اور اُن کے والد امام بخش صاحب داعی اور میزبان تھے ۔ حافظ عبد اللہ صاحب حج اور جہاد میں شریک رہے ۔

مظفر نگر سے دیو بند تک مختلف مقامات میں جن فدایانِ حق کے نام لئے جاتے ہیں، اُن میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ یہ اسماء گرامی بھی ہیں ۔ کرامت حسین صاحب ۔ محمد ماہ صاحب ۔ شیخ چاند صاحب ۔ مولوی فرید الدین صاحب مولوی بشیر اللہ صاحب ۔ سید محمد حسین صاحب ۔

دیو بند سے سہارن پور جاتے ہوئے } قصبہ شیخو پورہ اور وہاں سے موضع سویری تشریف لے گئے ۔

Marfat.com

وہاں ماحضر تناول فرمایا۔ چند گھنٹے قیام کیا۔ رات کو موضع لکھنور میں قیام کیا۔ گنگوہ میں مکلّے کی سرائے میں قیام فرمایا تھا۔ نانوتہ میں جامع مسجد میں ٹھہرے تھے۔ ایک ارادت مند کا بیان ہے کہ میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر پھر رہا ہے کہ سید صاحب جامع مسجد کے بیچ کے در میں کھڑے ہیں اپنی دستار اُتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور باقی دستار کو دونوں جانب سے طالبانِ فیض تھامے ہوئے ہیں۔ دستار کی شکل کنکھجورے کی سی معلوم ہوتی ہے۔ انبیٹھہ میں میاں صابر بخش سجادہ نشین شاہ ابوالمعالیؒ کے یہاں دعوت ہوئی تھی[1]۔

سہارن پور: ولی محمد صاحب رئیس سہارن پور، مفتی شرف الدین صاحب، محمد یار خاں صاحب، الٰہی بخش صاحب، امام الدین صاحب، کریم الدین صاحب، محسن خاں، محمد حسین، مولوی شاہ رمضان صاحب رڑکی والے، جو بعد میں مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سرحد پہنچے تھے۔ یہیں بیعت ہوئے سید صاحب نے بیعت کے بعد آپ کو خلافت عطا فرمائی[2]۔ مسجد ابونبی میں قیام ہوا۔

قصابوں کی تعداد بھی زیادہ تھی، اور یہ برادری قافلہ کی خدمت میں بھی پیش پیش رہی۔ آپ نے اس برادری کے چار افراد کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

محمد یار۔ الٰہی بخش۔ امام الدین۔ کریم الدین۔

سہارن پور میں بہت بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی جو خود بہت بڑے بزرگ اور شیخ تھے، جن کے ہزاروں مرید تھے، وہ خود حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو کر سید صاحب کے قافلے میں شریک ہو گئے اور اپنے تمام مریدوں کو ہدایت کر دی کہ سید صاحب سے بیعت ہو جائیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمی جو حاجی عبدالرحیم صاحب کی سالہا سال کی کمائی تھے وہ سب حضرت سید صاحب کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

---

[1] سید احمد شہید ص۱۲۷۔ [2] ایضاً

Marfat.com

حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب کا مقولہ مشہور ہے :

"ہمیں نہ نماز آتی تھی نہ روزہ۔ سید صاحب کی برکت سے یہ دونوں آگئے"

سید صاحب کے اسی فیض کا اثر ہے کہ تقریباً سوا سو سال گذر جانے کے بعد بھی اس علاقہ میں مذہبی اور سیاسی لحاظ سے وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔[1]

دارالعلوم اور مظاہر العلوم جیسی مذہبی یونیورسٹیاں اسی علاقہ میں ہیں، اور مذہبی پختگی کے ساتھ تحریکاتِ آزادی میں یہاں کے مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے والد ماجد یعنی حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ :

"سید صاحب جن قصبات میں تشریف لے گئے، وہاں اب تک خیر و برکت ہے۔ گویا وہ ایک نورِ مستطیل تھے، جدھر گئے وہ پھیل گیا۔"

ایک اور بزرگ مولانا محمد حسین صاحب فرماتے تھے :

"جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے، وہاں وہاں خیر و برکت کے آثار پائے جاتے ہیں۔"[2]

سہارن پور سے دہلی اور دہلی سے رائے بریلی

سید صاحب سہارن پور سے دہلی پہنچے۔ جہاں آپ کے شیخ و مربی اور سیاسی رہنما حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ چند روز قیام

---

[1] انتہا یہ کہ رجعت پسندی کے اس انتہائی دور میں کہ برطانوی ڈپلومیسی نے عام طور پر مسلمانوں کو کانگریس کا مخالف اور مسلم لیگ کا گرویدہ بنا دیا تھا، یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کانگریس اور حریت پسند جماعتوں کے ساتھ رہی اور صرف یہی علاقہ تھا جہاں انتخابات میں مسلمانوں نے قوم پروروں (نیشنلسٹوں) کو کامیاب بنایا۔

[2] "ارمغان احباب" از مولانا عبدالحی صاحب بحوالہ سیرت سید احمد شہیدؒ۔

Marfat.com

فرماکر شعبان[1] ۱۲۳۴ھ (مئی یا آغاز جون ۱۸۱۹ء) میں رائے بریلی کے قصد سے رخصت ہوئے یہ حضرت شیخ یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب سے آخری ملاقات تھی۔

سید صاحب اپنے قافلہ سمیت دہلی سے روانہ ہوئے تو اگرچہ مئی کا مہینہ تھا مگر جیسے ہی جمنا پار کر کے آگے بڑھے، سخت آندھی اور اس کے بعد ایسی بارش ہوئی کہ ہنڈن[2] ندی میں سیلاب آگیا۔ رات کو ندی کے کنارے قیام کرنا پڑا۔ صبح کے وقت ندی عبور کر کے غازی آباد پہنچے۔ اپنے مرید عبداللہ صاحب امام مسجد کے یہاں قیام ہوا۔ وہیں رائے بریلی کا "پیک غم" بیگوان[3] پہنچا، جو سید صاحب کے برادرِ محترم مولانا سید محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کی خبر لایا تھا۔

ایک عالم[4] فاضل بھائی جو خانگی زندگی میں پشت پناہ ہو، جس کے بھروسے پر خانہ داری کے جھگڑوں سے وہ فراغت میسر ہو کہ سالہا سال تک باہر رہنے پر بھی امورِ خانہ داری میں کوئی فرق نہ آئے۔ اُن کی وفات فی الحقیقت زندگی کا بہت بڑا ناقابلِ تلافی المیہ تھا۔ جو بلند پروازیوں کو پابند اور ہمتِ عالی کو پست کر سکتا تھا فطری اضطراب واضطرار نے آنکھوں سے چند آنسو ٹپکائے۔ اندوہِ نہانی نے رات کے کھانے کا مزا بھی کڑوا کر دیا۔ مگر جب احباب کی گرسنگی کا خیال آیا تو اس غم کو بھی غلط کیا۔ آدھی رات کے قریب چند نوالے کھائے اور صبح سویرے سفر کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ لیکن ملک و ملت کا جو درد متاعِ جان بن چکا تھا، وہ اس غم سے فزوں تھا۔ جلد سے جلد مکان پہنچنے کی ضرورت تھی مگر پھر بھی راستہ کی منزلوں میں جہاں قیام ہوا، ارشاد و اصلاح کا پروگرام بدستور جاری رہا۔

منزلیں | غازی آباد سے روانہ ہوئے، تو پہلی منزل ہاپوڑ تھی۔ پھر گڈھ مکتیسر پہنچ کر مسجد

---

[1] تقویم ہجری وعیسوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۲۶ مئی کو شعبان کی پہلی ہوئی تھی [2] یہ ندی غازی آباد اور شاہدرہ کے بیچ میں ہے۔ [3] یہ اُس قاصد کا نام ہے جو نامۂ غم لے کر آیا تھا۔

[4] چونکہ دہلی میں تعلیم پائی تھی اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے وابستہ حضرات ان سے واقف تھے اور بہت سوں سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ (سید احمد شہید ج ۱ ص ۱۳۰)

Marfat.com

میں قیام فرمایا۔ امروہہ اور مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے۔ پھر رام پور رونق افروز ہوئے اور حاجی زین العابدین صاحب کے یہاں چند روز قیام فرمایا۔

رام پور میں جن بزرگوں نے بیعت کی، اُن میں نواب احمد علی صاحب والی رامپور کا نام خاص طور پر ممتاز ہے۔

بریلی (بانس بریلی) : رام پور سے بانس بریلی تک ایک جگہ قیام کیا۔ جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ بریلی میں نواب کو علم ہوا تو وہ آپ کو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور متعلقین سمیت بیعت کی۔ بریلی میں جن اصحاب نے بیعت کی، ان میں ایک صاحب "حسینی" بھی تھے۔ یہ مخنث تھے۔ سید صاحب نے ان کا نام ہدایت اللہ رکھا۔ یہ جہاد میں ساتھ رہے اور اکوڑی کی جنگ میں نمایاں کام کیا۔

بانس بریلی سے رائے بریلی تک باقی منزلوں کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جس شام کو آپ دس سال بعد وطنِ عزیز (رائے بریلی) میں داخل ہوئے، ہلالِ رمضان استقبال کے لئے نمودار تھا۔ یعنی ۲۹ شعبان ۱۲۳۴ھ۔ ۲۳ جون ۱۸۱۹ء)۔

رائے بریلی میں تقریباً چار ماہ قیام رہا۔ دہلی سے ساتھ ہونے والوں کے علاوہ اس عرصہ میں وہ بھی آپہنچے جو گذشتہ دورے میں متاثر ہوئے تھے اور اب یہ مجمع پچاس ساٹھ سے بڑھ کر پونے دو سو کے قریب ہو گیا۔

اس قیام میں روحانیت کے علاوہ فوجی تربیت کا مشغلہ بھی پوری طرح شروع ہو گیا۔ اس اثناء میں آپ کے اس عجیب و غریب قافلہ کا چرچا آس پاس کے اضلاع میں بہت کافی ہو چکا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ سے نہ صرف دعوت نامے آئے بلکہ بہت سے مقامات سے آپ کو اپنے یہاں لے چلنے کے لئے دعوتی وفود بھی پہنچے۔

بالآخر آپ نے رائے بریلی سے الٰہ آباد کا قصد کیا۔ مسافت صرف چار روز کی تھی مگر طے ایک ماہ میں ہوئی کیونکہ طلبِ فیض کی بے تابیوں کا یہ عالم تھا کہ جدھر سے گذر ہوتا آس پاس کے دیہات کے لوگ جوق در جوق راستے پر آبیٹھتے اور اپنے یہاں لے چلنے کا

Marfat.com

اصرار کرتے۔ عذر معذرت میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ پھر کہیں صرف دُعا پر اور کہیں صرف ایک وقت کی دعوت پر اُن کو راضی کر لیا جاتا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک دو شب قیام کے بغیر لوگوں کی شکستہ دلی دُور نہ ہو سکتی تھی تو "دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست" کی تعمیل بھی کی جاتی۔

بہرحال رائے بریلی سے الٰہ آباد تک بہت سی جگہ کسی نہ کسی صورت میں قیام کرنا پڑا۔ مگر جن مقامات کا علم آج ایک مؤرخ کو ہو سکتا ہے، وہ صرف یہ ہیں:

سلون[1]۔ پھر اہلاو گنج[2]۔ مانک پور[3]۔ کڑا[4]۔ اہلاو گنج میں مرزا کاظم بیگ وہاں کے حاکم تھے۔ وہ خود بھی بیعت ہوئے اور دوسروں کو بھی اس حلقۂ تقدیس و طہارت کا گرویدہ بنا کر بیعت کرا دیا۔

الٰہ آباد: یہاں جائے قیام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت شاہ اجمل[1] صاحبؒ کے دائرہ میں قیام فرمایا۔ یہی دائرہ ہے جس کے متعلق ناسخ نے کہا تھا ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں مَیں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیام دوسری جگہ ہوا تھا۔ لیکن شاہ اجمل صاحب سے ملاقات بھی کی تھی اور اُن کے یہاں دعوت بھی تناول فرمائی تھی۔ یہاں بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ مگر شیخ غلام علی صاحب کے بے نظیر اخلاص و ایثار نے شیخ صاحب کو

---

[1] ابو الفضل کنیت۔ ناصر الدین محمد اجمل نام۔ اپنے وقت کے اکابر اہلِ علم اور بزرگ اولیاء اللہ میں سے تھے ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں پیدا ہوئے ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں وفات پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبد الحئی صاحب ملاقات کے لئے گئے تو دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر ایک کو گُڑ کا اور دوسرے کو شکر کا شربت پلائیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اہلِ کشف میں سے ہیں۔ شاہ صاحب نے دونوں کو گلے لگایا۔ پھر ملازم سے کہا دو گلاس شربت لاؤ۔ ایک قند کا دوسرا شکر کا۔ کیا کہ دل ان کی خواہش یہی ہے (سید احمد شہید ج ۱ ص ۱۵۶)

Marfat.com

اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ واقعات نگاروں کی نگاہیں انہیں پر اٹک کر رہ گئیں کسی اور طرف دیکھ ہی نہ سکیں۔ حتیٰ کہ یہ تک یاد نہ رہا کہ قیام کہاں ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شیخ غلام علی صاحب نے کام بھی وہ کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

شیخ غلام علی صاحب، ممتاز امراء میں شمار ہوتے تھے۔ مہاراجہ بنارس اودت نرائن کی طرف سے عمل دار تھے۔ مہرنڈہ وطن اصلی تھا۔ اُن تمام اخلاقی امراض میں مبتلا تھے، جو اُس زمانہ میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ سید صاحب سے بیعت ہوئے تو ان تمام کاموں سے توبہ کی۔ جس قدر سامانِ تعیش تھا، توڑوا کر دریا میں بہا دیا۔ سید صاحب کی خدمت میں بیش بہا قیمت ہدیئے پیش کئے (ان کی خدمات کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ)

بنارس : الہ آباد سے روانہ ہو کر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے بنارس پہنچے۔ وہاں مولوی عبدالقادر صاحب امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ سید صاحب کے دوست تھے۔ اس بناء پر ساتھیوں کا خیال تھا کہ سید صاحب وہیں قیام فرمائیں گے لیکن آپ نے فرمایا۔ وہ ہمارے ہم مشرب نہیں ہیں، اُن کے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ لہٰذا جماعت نے سہبیسر کی مسجد میں قیام کیا، اور خود سید صاحب چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شاہی مسجد میں مقیم ہو گئے جو عرصہ سے غیر آباد تھی۔ یہاں تقریباً ایک ماہ قیام ہوا۔ تقریباً پندرہ ہزار مرد اور عورتیں بیعت ہوئیں۔ بُری رسومات میں ایک یہ بھی تھی کہ اُن کے پیر چھٹے مہینے آتے تھے اور ہر گھر سے معینہ نذرانہ لے کر نماز روزے وغیرہ سے معافی کے پروانے لکھ کر دیئے جاتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب کے مسلسل وعظوں سے خدا کے فضل سے یہ تمام بداعمالیاں ختم ہو گئیں اور لوگوں میں دین داری کا عام ذوق پیدا ہو گیا بیعت کرنے والے اکابر میں شاہ عبداللہ صاحب تشنگرنی اور مرزا کریم اللہ بیگ صاحب رئیس بھی تھے۔ یہ بھی واقعہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تیموری شاہزادے جو وہاں رہتے تھے، وہ بھی بیعت ہوئے۔ اور بیش قیمت خلعتیں پیش کیں۔ (مگر ان شاہزادوں کے نام نہیں معلوم ہو سکے)۔

Marfat.com

سلطان پور : بنارس سے روانہ ہو کر چند مقامات پر قیام فرماتے ہوئے سلطان پور قیام فرما ہوئے۔ وہاں غلام حسین، سرکارِ لکھنؤ کی طرف سے حاکم تھے۔ اُن کے لشکر کے بہت سے آدمی سید صاحب سے پہلے سے بیعت تھے۔ تقریباً دو ہفتہ سلطان پور میں قیام رہا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔

(سلطان پور سے آپ بریلی تشریف لائے، اور یہاں کچھ عرصہ قیام فرما کر لکھنؤ تشریف لے گئے)۔

بتایا گیا ہے کہ لکھنؤ کا یہ سفر آغا میر نائب السلطنت کی دعوت پر ہوا تھا۔ "مخزن احمدی" میں اس دعوت نامے کی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے کہ :

"آوازۂ وعظ و تذکیر آں روشن ضمیر عالمگیر گردیدہ اگر بقدومِ میمنت لزوم خود، اہالی لکھنؤ را عموماً و ایں مشتاق مستمند را خصوصاً بنوازند بعید از مروت و اخوت و فتوت نخواہد بود"

مگر اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ بیگم، جس سے آغا میر کی چپقلش جاری تھی یہاں تک کہ بادشاہ کو بیگم سے برگشتہ کر دیا تھا، اس کے مقابلہ میں سید صاحب کی مقبولیت کے طفیل سے عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔ مگر جب اس کوتاہ اندیش کو اندازہ ہوا کہ سید صاحب کا ھما، بلند پرواز، حبِ جاہ اور عشقِ اقتدار کے پست اور کمینہ حشرات الارض پر نظر ڈالنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے تو اشتیاق و عقیدت کی تمام ڈینگیں ختم ہو گئیں۔ (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

Marfat.com

دارالحکومت لکھنؤ

سیاسی اور سماجی حالات اور سید صاحب کا قیام

سید صاحب کا قافلہ غالباً ۱۲۳۶ھ ۱۸۱۹ء میں رائے بریلی سے لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ اودھ کا دارالخلافہ تھا اور اس وقت اینگلو انڈین سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

غازی الدین حیدر[1] فرماں روا تھے اور معتمد الدولہ آغا میر، نائب السلطنت اور وزیر اعظم تھے۔

وزیر سے بادشاہ آپ رفیع الدولہ، رفیع الملک، شہامت جنگ پہلے سے تھے۔ مگر خیالات کی رفعت پسندی نے ایک اور پرواز کی۔ دربارِ دہلی کا دیا ہوا وزیر الممالک کا آبائی منصب اور خاندان کا یہ شاہی خطاب جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا، پسند خاطر نہ رہا۔ آپ نے کمپنی بہادر کے ایماء[2] سے یا کمپنی بہادر کی اجازت سے

---

[1] غازی الدین حیدر۔ ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء میں مسند نشین ہوئے۔ چند سال بعد ۱۲۳۵ھ، ۱۸۱۹ء میں وزارت کے بجائے بادشاہت کا اعلان کیا (سوانح سلاطین اودھ) (قیصر التواریخ) وغیرہ۔ ۱۲۴۳ھ، ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔

[2] یہاں ایک تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی بھی ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دربارِ دہلی اگرچہ عرصہ سے کمپنی بہادر کا نمک خوار ہو گیا تھا۔ مگر اب تک آبائی شہنشاہیت کی بو دماغ سے نہیں گئی تھی۔ اُس نے پہلی بیباکانہ جرأت یہ کی کہ غازی الدین حیدر کے والد نواب سعادت علی خاں کو خلعتِ وزارت عطا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ انگریزوں کے آوردہ تھے۔ خاندانی قاعدہ کے مطابق، آصف الدولہ پسر شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد آصف الدولہ کے بڑے لڑکے وزیر علی خان کو مسند نشین ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ آصف الدولہ کی وفات کے بعد مرزا وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے مگر کمپنی بہادر کے اربابِ اقتدار نے چار ماہ بعد ان کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا اور ان کے چچا نواب سعادت علی خاں پسر شجاع الدولہ کو مسند نشین کر دیا۔ سعادت علی خاں کوشش کرتے رہے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بادشاہت کا شوق فرمایا اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۸ء ، ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ کو شاہانہ جلوس فرماکر "شاہِ زمن" کا خطاب اختیار فرمایا۔ اب آپ کا پورا نام اور خطاب یہ ہوگیا۔ رفیع الدولہ۔ رفیع الملک، شہامت جنگ، ابو المظفر، معز الدین، شاہ زمن، غازی الدین حیدر بادشاہ غازی۔

کفایت شعار اور سنجیدہ مزاج باپ "نواب سعادت علی خاں" (خلف شجاع الدولہ) کے جمع کردہ خزانہ میں سے دو کروڑ روپیہ شاہی تخت اور بادشاہانہ ساز و سامان پر صرف فرمایا۔

سکّہ حدودِ مملکت اور شاہی اختیارات پر اگرچہ انگریزی غلبہ اور اقتدار کا ٹھپہ لگ چکا تھا اور آپ کا کوئی حکم فوجی چھاؤنیوں کا رُخ آزادی سے نہیں کرسکتا مگر شاہی ٹکسال کو مکمّل آزادی عطا کر دی گئی تھی اور آپ کا تجویز کردہ[۲] سکّہ بازاروں میں چلاکر اندازِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ سندِ وزارت دربارِ دہلی سے اُن کو عطا کر دی جائے۔ مگر دربارِ دہلی نے اُن کو سند نہیں عطا کی۔ یہ کمپنی بہادر کے مقابلہ میں دربارِ دہلی کی پہلی جسارت تھی۔ دوسری جسارت اکبر ثانی (جلوس ۱۲۲۱ھ، ۱۸۰۶ء، وفات ۱۲۵۳ھ، ۱۸۳۷ء) کے زمانہ میں ہوئی کہ گورنر جنرل دہلی آنے کے ارادہ سے فرخ آباد تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے دہلی پہنچنے کی اجازت چاہی اور ساتھ ہی یہ کوشش کی کہ دربار میں اُن کو کرسی مل جائے۔ بادشاہ نے اس کی منظوری نہیں دی۔ گورنر جنرل (لارڈ ماٹرا) برافروختہ ہوکر فرخ آباد سے کلکتہ واپس چلے گئے اور اب کمپنی بہادر نے یہ طے کیا کہ ایک اور بادشاہ بنا کر شاہ دہلی کے اس غرور کا سر نیچا کیا جائے۔ (قیصر التواریخ)

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] یوم عید غدیر بر مذہب اثنا عشریہ (قیصر التواریخ ج ۱ صفحہ ۲۴۴)۔ [۲] اودھ کے سکہ میں مچھلیوں کا نشان، بانی ریاست برہان الملک کے زمانہ سے تھا۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ جب برہان الملک، بادشاہ کے یہاں سے اس صوبہ کی سند لے کر صوبہ پر قبضہ کرنے جا رہے تھے تو گنگا عبور کرتے وقت ایک مچھلی دریا سے تڑپ کر کشتی میں خاص برہان الملک کے دامن میں آپڑی۔ برہان الملک نے اس کو فال نیک سمجھا۔ اس مچھلی کی ہڈیاں واجد علی شاہ کے زمانہ تک خزانہ میں محفوظ رہیں (قیصر التواریخ ج ۱ صفحہ ۲۷ و عماد السعادت وغیرہ) سکہ میں دوسری جانب (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

شاہانہ کا مظاہرہ کرا دیا گیا تھا۔

انگریزی اقتدار انگریز ریزیڈنٹ جس کی بلا "معاہدہ کوڑہ جہاں آباد ۱۷۶۵ء" سے مسلط کر دی گئی تھی، وہ اپنے اختیارات دن بدن بڑھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اب سب کچھ وہی ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ مسند نشین کا عزل و نصب بھی اُسی کے اختیار میں پہنچ چکا تھا۔

سماجی حالت غازی الدین حیدر کی اوہام پرستی[1] مشہور ہے۔ اس بنا پر مینا و ساغر کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شاہِ دہلی کا نام اور سنہ جلوس وغیرہ ہوا کرتا تھا۔ غازی الدین حیدر نے مچھلیوں کا نشان بیچ میں اور اس کے گرد کمپنی بہادر کی خوشنودی کے لئے دو شیر اور دوسری جانب شاہ دہلی کے نام کے بجائے یہ شعر ۔ سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن : غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن ۔ یہ شعر حسن علی خاں نائب وزیر اعظم نے موزوں کیا تھا۔ اس کے انعام میں اس کو پانچ ہزار روپے عطا کئے گئے۔ (قیصر التواریخ ج ۱ ص ۲۴۵)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] آپ کی قوتِ واہمہ زندہ دوستوں کو مُردہ اور مُردوں کو زندہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں کرتی تھی۔ معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم تھے جن کی تمام قابلیت اسی میں صرف ہوتی تھی کہ بادشاہ کی اوہام پرستی اور بے خودی میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ غازی الدین حیدر ہی کی قوتِ واہمہ کا کمال تھا کہ اپنی طرح (معاذ اللہ) حضرات ائمہ کو بھی دوشیزگان عشوہ طراز کا شوقین تصور کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اچھوتیوں کی ایک خاص اصطلاح ایجاد کی۔ یعنی دوشیزہ لڑکی کا آپ کسی امام سے (جن کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ گذر چکے تھے) نکاح کر دیا کرتے تھے۔ یہ لڑکی اچھوتی کہلاتی تھی۔ یہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو ایک محل دیا جاتا تھا جہاں وہ ناز و انداز سے شاہانہ تکلفات کے ساتھ رہتی۔ اس کے لواحقین کے وظیفے مقرر کر دیئے جاتے تھے۔ شہر کے تقریباً تمام ہی محلے ان اچھوتیوں کی برکت سے متبرک ہوتے رہتے تھے۔ ملک کی آمدنی کا بہت کافی حصہ ان اچھوتیوں کے مہر اور اُن کے وظائف پر صرف ہوتا تھا۔ اسی طرح ابلہ فریبی اور اوہام پرستی کی یہ عجیب و غریب مثال تاریخ میں بہت ہی مشکل سے ملے گی کہ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر نے ایک شخص کو طلب کیا۔ معتمد الدولہ اس کی حاضری پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

گردش، رقص و سرود کی طرب آفرینی، عصمت فروشوں کی اداکاری، کچھ ایسے کیف آور مشغلے تھے جن سے کسی وقت بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

بادشاہ، وزرا اور اُمراء کے اس فیشن نے پورے شہر کو غرقِ ناؤ و نوش کر رکھا تھا۔ سب طرف عصمت فروشوں کا ہجوم تھا، اور نہایت رکیک جذبات سوسائٹی کے مزاج میں سرایت کر چکے تھے[1]

انقلابی صلاحیت ان تمام خرابیوں کے باوجود لکھنؤ میں ایک بات تھی جو اودھ کے کسی اور شہر میں نہیں تھی۔ لکھنؤ جیسا بھی تھا، اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ اس وجہ سے بہترین دل و دماغ کے مالک علماء اور فضلا بھی یہاں پہنچتے تھے اور اس مرکزی شہر کو اپنا مرکز بنا لیتے تھے۔ چنانچہ سنگ ریزوں کے اس انبار میں بہت سے قابلِ قدر جوہر بھی ڈھونڈے سے مل جاتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

علماء کرام فرنگی محل کے علماء شہر میں خاص اثر رکھتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ مولانا عبدالعلی صاحب[2] تھے، جن کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بادشاہ کو رپورٹ کر دی گئی کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابھی چند روز گذرے تھے کہ یہ بدنصیب بادشاہ کی سواری کے سامنے آ گیا۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کو حاضر کرو۔ یہ وقت معتمد الدولہ کے لئے بہت نازک تھا مگر اس کی حاضر جوابی کام آ گئی۔ اُس نے فوراً عرض کیا۔ غلام اس کو چشمِ بشری سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ پیر و مرشد کا کمال ہے کہ حضور عالمِ ارواح کو بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ حاضرین نے بھی وزیر کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ مختصر یہ کہ بادشاہ کی زبان پر تھا "وہ ہے، وہ ہے" اور سب حاضرین کی زبان پر تھا "کہاں ہے، کہاں ہے"۔ غرض بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت لباسی ہے (تاریخ اودھ ص ۱۳۵ و ص ۱۵۹ ج ۴)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ملاحظہ ہو، اس زمانہ کی ادبیات جن کا کچھ تذکرہ حکیم محمد نجم الغنی صاحب نے تاریخ اودھ میں کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ج ۴ ص ۱۰۲ تا ص ۱۰۴)۔ [2] اٹھارہویں صدی عیسوی کے بہت جلیل القدر عالم ہیں۔ اُن کی تصانیف آج تک علما محققین کی نظر میں خاص وقعت رکھتی ہیں۔ آپ سلسلہ علماء فرنگی محل کے مورث مولانا قطب الدین شہید کے پوتے اور ملا نظام الدین کے فرزند تھے۔ یہی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بحر العلوم کا خطاب[1] دیا تھا۔ یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ اصل نام سے زیادہ یہ خطاب مشہور ہے آپ اس وقت وفات پا چکے تھے لیکن آپ کے صاحبزادہ مولانا عبد الرب صاحب[2] کے فیوض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملا نظام الدین ہیں جن کا تجویز کیا ہوا درسِ نظامی آج تک پتھر کی لکیر بنا ہوا ہے۔ مولانا عبد العلی صاحب ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علوم میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا قیام لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ اوّل آپ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے یہاں رہے۔ اُن کی شہادت کے بعد رام پور میں نواب فیض اللہ خاں صاحب بانی ریاست رام پور کے یہاں عرصہ تک قیام کیا۔ پھر منشی صدر الدین صاحب بہاری آپ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ بہار لے گئے۔ وہاں حلقۂ درس نے بے انتہا شہرت پائی مگر کچھ عرصہ کے بعد منشی صدر الدین صاحب سے تعلقات خوش گوار نہ رہے۔ رئیس کرناٹک (نواب والا جاہ محمد علی خاں) آپ کے قدردان تھے۔ جیسے ہی نواب صاحب کو معلوم ہوا، مولانا عبد العلی صاحب کے نام خط لکھ کر اپنے یہاں مدعو کر لیا۔ مولانا بحر العلوم نے نواب والا جاہ کی دعوت منظور کی اور عازمِ مدراس ہو گئے۔ نواب نے خاندان کے معزز اراکین اور امراء ریاست کے ساتھ شاندار استقبال کیا۔ اپنے محل خاص میں آپ کے قیام کا انتظام کیا اور تدریس کے لئے عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرا دیا۔ ملک العلماء کا خطاب دیا۔ نواب والا جاہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادہ عمدۃ الامراء پھر والا جاہ کے پوتے نواب عظیم الدولہ بھی علامہ بحر العلوم کا یہی اعزاز کرتے رہے۔ ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ ۸۳ سال عمر ہوئی۔ مدراس کی مشہور جامع مسجد والا جاہی کے شمالی جانب میں آپ کا مزار ہے (تذکرہ علماء ہند صلہ ۱۲۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] احوال علماء فرنگی محل صلہ ۶۵۔ [2] مولانا عبد الرب صاحب۔ درسی کتابیں والد ماجد، (حضرت مولانا عبد العلیؒ) سے پڑھیں۔ والد ماجد کے ساتھ شاہجہاں پور، رام پور، بہار اور مدراس میں رہے پھر لکھنؤ آکر سلسلۂ درس جاری رکھا۔ دوبارہ مدراس تشریف لے گئے۔ نواب عظیم الدولہ نے سلطان العلماء کا خطاب دیا اور اُن کے والد کا مدرسہ لائق بیٹے کے سپرد کر دیا۔ مولانا عبد الرب صاحب یہ مدرسہ اپنے بھتیجے مولانا عبد الواجد صاحب (خلف مولانا عبد الاعلیٰ صاحب خلف مولانا عبد العلی صاحب) کے سپرد کر کے لکھنؤ واپس آ گئے۔ دہلی میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی ملاقات و ضیافت سے محظوظ ہوئے۔ ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی، (نزہتہ الخواطر بحوالہ سیرت سید احمد شہید و تذکرہ علماء ہند)۔ جس وقت سید صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے، اس وقت تک مدراس میں مولانا عبد العلی صاحب بحر العلوم حیات تھے۔

Marfat.com

جاری تھے۔ ایک دوسرے مشہور عالم اور بزرگ مرزا حسن علی صاحب[۱] محدّث تھے۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے۔ آپ کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ سینکڑوں طلبہ آپ سے مستفید ہوئے۔ مولانا محمد اشرف صاحب[۲]، مولانا ابوالحسن صاحب[۳] نصیر آبادی، مولانا مخدوم صاحب، شاہ یقین اللہ صاحب اور اُن کے صاحبزادے۔ مولانا عبدالوہاب صاحب بھی شہر کے مشہور علماء اور با اثر حضرات تھے۔

عمائدین علّامہ سبحان علی خاں[۴]، نائب وزیر اعظم بہت بڑے فاضل، شعر و سخن کے ماہر، نظم و نثر میں قادر الکلام، صاحبِ تصنیف و تالیف[۵] تھے۔ بادشاہ اور وزیر آپ کی اصابت رائے کے قائل تھے۔

۱؎ مرزا حسن علی صغیر محدّث لکھنوی ساکن محلہ یحییٰ گنج، میرک جمال الدین لقب، مرزا عرف۔ سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حاصل کی۔ سینکڑوں علماء نے آپ سے علمِ حدیث میں استفادہ کیا نصیرالدین حیدر کی سلطنت کے آخری دور (۱۲۶۶ھ) میں مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ آپ شافعی مسلک رکھتے تھے (تذکرہ علماء ہند) علماء فرنگی محل نے بھی آپ سے علمِ حدیث میں استفادہ کیا (تراجم علماء حدیث ہند)

۲؎ مولانا محمد اشرف صاحب لکھنؤ کے اساتذہ میں سے تھے۔ والد صاحب کا اسمِ گرامی نعمت اللہ تھا۔ صدیقی خاندان تھا اور آبائی وطن کشمیر۔ عرصہ سے یہ خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تھا۔ درسی کتابیں کچھ مولانا مخدوم حسینی لکھنوی سے پڑھیں اور زیادہ علّامہ نور الحق فرنگی محل سے۔ پھر مسندِ درس آباد کی۔ صاحبِ تصانیف ہیں۔ ۷ صفر ۱۲۴۲ھ کو وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ سیرت سید احمد شہید ص ۱۳۸) ۳؎ مولانا ابوالحسن صاحب نصیر آبادی خلیفہ مولانا نعم اللہ صاحب بہرائچی۔ علماء را از ظلماتِ شرک و بدعت نجات بخشید و باتباع سُنّتِ سنّیہ مے کوشید۔ دوم شعبان سنہ دوازدہ و صد و ہفتاد ہجری رحلت فرمودہ (تذکرہ علماء ہند ص ۳) ۴؎ سبحان علی خاں، لکھنو۔ اوّل سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے۔ اُن کی مہارت کی وجہ سے نواب سعادت علی خاں نے اُن کو اپنے یہاں بُلایا اور قدر افزائی کی۔ یہاں تک کہ اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے (سیرت سیّد احمد شہید)۔ ۵؎ الباقیات الصالحات اور شمس الضحیٰ وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں (سیرت سیّد احمد شہید)

Marfat.com

تاج الدین حسین خاں[1] اپنی اعلیٰ قابلیت کے سبب سے ہی شجاع الدولہ کے منظورِ نظر ہوئے تھے۔

فوجی حلقے سلطنتِ اودھ کی فوج اگرچہ بہت[2] گھٹا دی گئی تھی، جو باقی بچی تھی وہ بھی محض نمائشی تھی۔ تاہم اس میں ایک عنصر اچھی صلاحیتوں کا مالک تھا مثلاً قندھاریوں[3] کی چھاؤنی (جس میں زیادہ تر پٹھان سپاہی تھے) اپنی خاص تاریخ رکھتی تھی نائب جرنیل

---

[1] تاج الدین حسین خاں بھی سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے۔ نواب سعادت علی خاں کی جوہر شناسی نے اُن کو لکھنؤ بلایا۔ عقل و دانش میں آپ ارسطو زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا علاقہ "سلطان پور" آپ کی جاگیر تھا (سیرت سیّد احمد شہید)۔ [2] ۱۸۰۱ء میں جو معاہدہ نواب سعادت علی خاں (غازی الدین حیدر کے والد) سے ہوا تھا اس میں طے کر دیا گیا تھا کہ نواب سعادت علی خاں صرف چار پلٹنیں تلنگوں کی، ایک پلٹن نجیب پیادے اور میواتی اور دو ہزار سوار اور تین سو گولہ انداز رکھ کر باقی فوج برطرف کر دیں گے۔ ممالکِ محروسہ کی حفاظت انگریزی فوج کے ذمّہ ہوگی جو بقدر ضرورت رکھی جاسکے گی (قیصر التواریخ جلد اوّل ص۱۶۶)۔ [3] اس کے بانی یوسف خاں قندھاری تھے جو حافظ رحمت خاں کی فوج میں سالدار تھے۔ پھر حافظ صاحب کے یہاں سے نوکری چھوڑ کر شجاع الدولہ کی فوج میں پہنچ گئے اور اپنی حُسنِ خدمات کے باعث شجاع الدولہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ شجاع الدولہ نے ان کو رسالدار کر دیا جو اس زمانہ میں فوج کا با اختیار افسر ہوتا تھا۔ جس کو سپاہیوں کے بھرتی کرنے اور معزول کر دینے تک کا اختیار ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ نقارہ اور نشان وغیرہ بھی رہا کرتے تھے۔ یوسف خاں کے بعد اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن خاں رسالدار ہوئے۔ پہلے اُن کے رسالہ میں صرف پانچ سو سوار تھے اور جب انگریزی فوج کی کمک کے لئے ان کو مرہٹوں کے مقابلہ میں دکن بھیجا گیا، اور وہاں اُن کے رسالہ نے نمایاں خدمات انجام دیں تو اُن کا مرتبہ بڑھا دیا گیا اور اُن کو سترہ سو سپاہیوں کا رسالدار بنا دیا گیا۔ سیّد صاحب کے زمانہ میں عبدالرحمٰن خاں کے لڑکے عبدالہادی خاں اور عبدالرحمٰن خاں کے پوتے خلیل اللہ خاں پسر حبیب اللہ خاں تھے۔

Marfat.com

فقیر محمد خاں[1] بہادر ایسے افسر تھے جو شخصی طور پر بھی حضرت سید صاحب سے عقیدت رکھتے تھے۔ یہ حضرت سید صاحب کے ساتھ نواب امیر علی خاں کی فوج میں کام کر چکے تھے اُسی وقت سے حضرت سید صاحب کی عظمت کا سکّہ اُن کے دل پر جما ہُوا تھا۔ غرض فوج میں ایک جماعت موجود تھی جو سید صاحب کی تحریک سے وابستہ ہو سکتی تھی۔

یہ تھا لکھنؤ، جہاں حضرت سید صاحب پورے قافلہ کے ساتھ ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء میں تشریف لے گئے۔

قیام[2] | پہلے اکبری دروازہ کے قریب "میر مسکین" کی حویلی میں قیام فرمایا یہ حویلی اور

[1] فقیر محمد خاں، بخشی محمود خاں آفریدی مدار المہام نواب قائم خان بنگش والیٔ فرخ آباد کے خاندان سے تھے۔ پہلے نواب علی خاں کی فوج میں ملازم تھے جب وہ کارخانہ درہم برہم ہُوا تو لکھنؤ آ گئے۔ اور بہت جلد ترقی کر کے نائب جرنیل ہو گئے اور سید صاحب جب لکھنؤ سے واپس ہوئے تو فقیر محمد خاں کو وزیر اعظم کے یہاں سے خلعت ملا۔ دس ہزار روپے نقد اور ہاتھی، پالکی، شملہ، مندیل، سپر، تلوار اور اس کے علاوہ بہت سا سامان ملا۔ ہزار روپیہ مشاہرہ ہُوا، اور پندرہ سو سوار اور دو ہزار پیادہ رکھنے کا حکم ہُوا، اور محمدی کا علاقہ پرگنہ ہُوا۔ فقیر محمد خاں شجاع اور دلیر آدمی تھے شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے۔ گویا تخلص تھا۔ صاحبِ دیوان ہیں (حاشیہ سیرت سید احمد شہیدؒ ۱۲۵)۔ [2] اگرچہ سید صاحب آغا میر نائب السلطنت کی دعوت پر لکھنؤ جا رہے تھے مگر آپ کی طبعی سادگی نے گوارا نہ کیا کہ پہلے سے اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر استقبال اور جلوس کے تکلفات برداشت کریں سید صاحب کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن صاحب جو لکھنؤ میں کسی فوجی عہدے پر مامور اور قندھاریوں کی چھاؤنی میں اقامت گزیں تھے، وہ سید صاحب کے ہمراہ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ پہلی منزل "حسن گنج" میں ہوئی۔ دوسری منزل لکھنؤ سے قریب کسی مقام پر ہوئی، جس کے بعد صبح سویرے لکھنؤ پہنچنے کا پروگرام تھا۔ سید صاحب نے رات ہی کو عشاء کے وقت سید عبدالرحمٰن صاحب کو حکم دے دیا کہ:

"کچھ رات رہے تم آگے چل کر قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنا مکان صاف کر دا کر فرش بچھوا رکھو اور کچھ بھنے ہوئے چنے اور نمک مرچ اور کچھ گڑ" (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

شہر کا تنگ علاقہ ایک سو ستر کے قافلہ کے لئے تکلیف دہ تھا، تو دریائے گومتی کے کنارے ٹیلے والی مسجد[1] کے قریب شیخ امام بخش صاحب سوداگر کی حویلی جو حال ہی میں بن کر تیار ہوئی تھی، قیام کے لئے طے کی گئی۔ آپ وہاں منتقل ہو گئے اور جب تک قافلہ لکھنؤ رہا اسی حویلی میں قیام رہا۔

قافلہ کی مقبولیت اور اس کے اثرات وہی قابل اور صالح جوہر جن کی نشاندہی ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں، اس قافلہ کی طرف اس طرح لپکے، جیسے وہ پہلے سے چشم براہ اور بے چینی سے منتظر تھے۔

سب سے پہلے سلطان العلماء مولانا عبد الرب صاحب نے اپنے یہاں پورے قافلہ کی شاندار ضیافت کی۔

شہر کے جلیل القدر عالم اور مشہور استاذ حضرت مرزا حسن علی صاحب محدثؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بھی تیار رکھنا (وقائع احمدی ص۱۱۸)

چنانچہ سید صاحب خاموشی کے ساتھ صبح کے وقت قندھاریوں کی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر آپ نے اور تمام ساتھیوں نے چنے اور گڑ وغیرہ تناول کیا اور پانی پی کر آرام فرمانے لگے۔ نماز ظہر کے وقت لوگوں کو تشریف آوری کا علم ہوا تو آمد شروع ہوئی۔ بہت سے امراء بھی حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے پیش کئے اور پھر فوراً ہی آپ کے قیام کا سوال حل کیا گیا۔ نذرانے پیش کرنے والے اُمراء اور نذرانوں کی تفصیل یہ ہے:

محمد حسن خاں پانچ اشرفی۔ خلیل اللہ خاں چار اشرفی۔ مصطفےٰ خاں بن حسن خاں تین اشرفی، عبد الرحیم خاں تین اشرفی۔ عبد المعبود خاں دو اشرفی (سید احمد شہید ص۱۶۹)

اسد علی بیگ کمیدان اور مرزا اشرف بیگ رسالدار آپ کو شہر میں لے گئے اور پہلے میر مسکین کی حویلی میں قیام کرایا گیا۔ پھر شیخ امام بخش تاجر کی حویلی قیام کے لئے منتخب کی گئی۔

[1] ٹیلے والی عالمگیری مسجد جس کو شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد بھی کہتے ہیں (سیرت سید احمد شہید ص۱۲۵)

Marfat.com

نے ایک بڑے اجتماع میں جہاں شہر کے تقریباً پانچ سو عمائدین اور با اثر اشخاص موجود تھے، امیر قافلہ سید صاحب کی خدمت میں شاہانہ نذر[1] پیش کی۔

سوداگروں کے حلقہ میں شیخ امام بخش صاحب سوداگر نے اپنی نفیس حویلی جو حال ہی میں تیار کی تھی، قافلہ کے طویل قیام کے لئے پیش کر دی۔

عمائدینِ شہر میں سے مرزا حسن بیگ صاحب نے اپنے یہاں دعوت کر کے حضرت سید صاحب کا تعارف کرایا۔

مرزا اسد علی بیگ پہلے ہی دن سے قافلہ کے انتظام میں مصروف تھے۔ امام بخش صاحب سوداگر نے آپ ہی کی فرمائش پر وہی حویلی قیام کے لئے دے دی تھی[2]۔

تاج الدین حسین خاں، بادشاہ کے مقربِ خاص اور سر برآوردہ شیعہ رئیس تھے۔ وہ ملاقات کے لئے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کئی گھنٹہ تک تنہائی میں گفتگو کی۔

وزیر اعظم (معتمد الدولہ) کے نائب علامہ سبحان علی خاں بکمال ادب حاضر خدمت ہوئے اور کئی گھنٹہ تک شرفِ ہم کلامی حاصل کیا۔ ان ملاقاتوں اور دعوتوں کے ساتھ قافلہ کے جادو بیان مقررین کی تقریروں کا سلسلہ بھی شہر میں جاری تھا۔ جمعہ کے روز جہاں یہ لوگ نماز پڑھتے تھے، مسجدیں تنگ ہو جاتی تھیں۔ مسجدوں سے باہر دُور تک فرش اور جا نمازوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

چند ہی روز کے تعارف کے بعد عقیدت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شہر کے تقریباً تمام ہی علماء[3] اور مشائخ سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ عوام کا مذہبی طبقہ

---

[1] اس کی تفصیل یہ ہے۔ مشروع کے دو تھان۔ اعلیٰ قسم کی چکن کے دو تھان۔ بیش قیمت عطر دان۔ الائچیوں سے بھرا ہوا پان دان (سیرت سید احمد شہید ص۱۲۵)۔ [2] ایضاً ص۱۲۵

[3] ایک جمعہ کو وعظ میں مولانا محمد اشرف صاحب، مولانا مخدوم صاحب، مولانا امام الدین صاحب بنگالی، مولانا امام الدین صاحب لکھنوی برادر مولانا نصیر الدین (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

جان چھڑکنے لگا۔

جب ہر کوچہ اور گلی میں قافلہ کا چرچا ہونے لگا تو کچھ وہ لوگ بھی جن کی زندگی آوارگی میں صرف ہوئی تھی، متوجّہ ہوئے اور حلقہ بگوش ہو گئے۔

کچھ زنانوں نے بھی اس بہتی گنگا سے وضو کرنا چاہا، چنانچہ وہ حاضر خدمت ہوئے اور پچھلی باتوں سے توبہ کرکے قافلہ میں شامل ہو گئے۔

قافلہ کے اثرات شہر سے گذر کر چھاؤنی میں پہنچے۔ چنانچہ رسالدار مینڈو خاں اور اُن کے بھائی عبداللہ خاں نے تمام عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر سیّد صاحب کو اپنی چھاؤنی میں بُلایا۔ آپ سے نصیحتیں[1] حاصل کیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صاحب بازار خانم، مولانا عبدالباسط صاحب شاگرد مولانا محمد اشرف صاحب، مولانا ابوالحسن صاحب نصیر آبادی، مولانا عبداللہ صاحب، مولانا رحیم اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا نجیب اللہ صاحب بنگالی۔ شاہ یقین اللہ صاحب اور ان کے صاحبزادہ مولوی عبدالوہاب صاحب، میر اُمید علی صاحب جو لکھنؤ میں صاحبِ خدمت مشہور تھے، یہ سب حضرات موجود تھے۔ وعظ کے بعد یہ سب بیعت سے مشرف ہوئے۔ اکثر نے تو اسی مسجد میں بیعت کی، اور مولوی محمد اشرف صاحب، مولوی مخدوم صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب وغیرہ نے اُسی روز مکان پر لے جا کر بیعت کی (سیرت سیّد احمد شہید ص ۱۳۸)۔ مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی جو اس تحریک کے دورِ ثانی کے بانی ہیں (جس کو وہابیوں کی تحریک کہا جاتا ہے) جن کا مفصّل تذکرہ مستقل جلد میں آئے گا (انشاء اللہ) وہ بھی اس موقع پر اپنے اُستاذ مولانا محمد اشرف صاحب کے ساتھ بیعت ہوئے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] رسالہ کے سپاہیوں نے حضرت سیّد صاحب کو توجہ دلائی تھی کہ مینڈو خاں رسالدار اُن مسافروں کا خیال نہیں کرتے جو اس طرف نکل آتے ہیں۔ ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم خدمت کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرف جو مسافر آتے ہیں وہ اکثر یہاں خالی پیٹ رات گذارتے ہیں۔ سیّد صاحب نے مینڈو خاں کو اس طرف توجّہ دلائی۔ مینڈو خاں نے وعدہ کیا کہ مَیں آئندہ ہر ایک مسافر کا خیال رکھوں گا اور جو مَیں کھاؤں گا وُہی اُن کو بھی کھلاؤں گا۔

Marfat.com

دعائیں لیں[1] اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔[2]

سرکاری حلقوں میں ردِّ عمل سیّد صاحب کے یہ اثرات ریزیڈنٹ صاحب اور اُن کے حواریوں کو کب برداشت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اوّل شیعہ سُنّی اختلاف کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی گئی، جس کی چنگاریاں لکھنؤ کی فضا میں پہلے سے موجود تھیں۔ مگر سیّد صاحب کے حسنِ تدبیر اور حضرات مقرّرین کی سنجیدہ اور مؤثر تقریروں کے باعث جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو جبر و تشدد کے مظاہرہ کا شرمناک حربہ

---

[1] مینڈو خاں رسالہ دار کے سواروں کی وردی عجیب قسم کی تھی۔ باناتی ٹوپی اور باناتی کُرتی اور پاجامہ وردی میں ہوتا تھا۔ اس رسالہ کا نام بھی عجیب مضحکہ انگیز تھا۔ ان کو لولو کے سوار کہا جاتا تھا۔ سیّد صاحب سے مینڈو خاں صاحب نے دعا کی درخواست کی کہ یہ نام بدل جائے اور اُن کی ترقّی بھی ہو جائے۔ سیّد صاحب لکھنؤ سے واپس ہوئے تو دو ڈھائی ماہ بعد یہ نام بھی بدل دیا گیا اور ترقی کر کے خیرآباد اور بہرائچ کا علاقہ اُن کے حوالہ کر دیا گیا۔ مصنفین سوانح نے اس کو حضرت سیّد صاحب کی دعا کی برکت فرمایا ہے۔ ہم دعا کی برکت کے ساتھ دوا کا شائبہ بھی یہاں پاتے ہیں۔ یعنی سیّد صاحب نے اللہ تعالےٰ سے دُعا بھی کی، اور کچھ بعید نہیں کہ معتمد الدولہ سے چند گھنٹوں کی ملاقات میں یہ سفارش بھی فرما دی ہو۔

[2] فقیر محمد خاں نائب جرنیل اور مینڈو خاں وغیرہ جن کا تعلّق سیّد صاحب سے ہو گیا تھا اس تعلّق کے بعد حکومت نے ان کی جاگیروں اور مناصب میں اضافہ کیا مگر لکھنؤ سے منتقل بھی کر دیا۔ فقیر محمد خاں صاحب کو محمّدی لکھیم پور کا علاقہ عطا ہوا، اور مینڈو خاں صاحب خیرآباد و بہرائچ بھیجے گئے۔ جو لوگ سیاست کے داؤ پیچ بالخصوص انگریزی ڈپلومیسی کی خاموش اور نہایت نرم ریشہ دوانیوں سے واقف ہیں، وہ اس ترقّی سے زیادہ انتشار کو اہمیّت دیں گے۔ یعنی ان افسروں کو اس طرح منتشر کر کے ان اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو سیّد صاحب کے طویل قیام کے باعث فوجی علاقہ میں پیدا ہو گئے تھے۔

Marfat.com

استعمال کیا گیا اور خاص خاص لوگوں کے ذریعہ دھمکی دی گئی کہ اگر لکھنؤ سے کوچ نہ کیا گیا تو قافلہ کا سارا قیام گاہ توپ دم کر دیا جائے گا۔ اس وقت لڑنا مقصود نہیں تھا۔ اس لئے سیّد صاحب نے روانگی کا پروگرام بنا لیا۔[۱]

بادشاہ اور وزیر شیعہ بھی تھے اور انگریز دوست بھی، مگر یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ فوج کا سُنّی عنصر اور شہر کے مسلمان جن میں سنّیوں کی اکثریت تھی، برانگیختہ اور مشتعل ہوں۔ لہٰذا حکمتِ عملی سے کام لیا گیا یعنی ایک طرف بے ضابطہ طور پر دھمکیاں اور سیّد صاحب کو لکھنؤ سے رخصت کر دینے کی کوشش جاری تھی، دوسری جانب سیّد صاحب اور قافلہ کے تمام دوستوں سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا گیا اور جب سیّد صاحب کی روانگی طے ہوگئی تو نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم نے پورے قافلہ والوں کی شاندار دعوت کی۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب کا اپنے یہاں وعظ کرایا۔ مبلغ پانچ ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے

---

[۱] یہی معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت جنہوں نے خط لکھ کر سیّد صاحب کو بُلایا تھا، انہیں نے سیّد صاحب کے خاص ارادت مند فقیر محمد خاں کی معرفت کہلا بھیجا کہ اگر سیّد صاحب نہیں جاتے تو دو چار توپیں بھیج کر ان کی قیام گاہ کو مسمار کرا دونگا۔ غلام رسول صاحب مہر نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت سیّد صاحب سے بیعت کرنے والوں میں کچھ شیعہ بھی تھے۔ اس سے اکابر کو تشویش ہوئی اور انہوں نے سیّد صاحب کو منع کرا دیا کہ شیعوں کو بیعت نہ کریں۔ سیّد صاحب نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو پھر یہ طے کیا کہ سیّد صاحب کو لکھنؤ بدر کر دیا جائے لیکن یہ بہت چھوٹی سی بات ہے اس پر یہ سزا کہ سیّد صاحب شہر بدر ہو جائیں ورنہ قیام گاہ کو توپ دم کر دیا جائے گا، قطعاً غیر متوازن اور غیر معقول ہے لیکن اگر اس وقت کے سیاسی حالات پر نظر رکھی جائے تو جرم و سزا میں صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے۔ بیشک معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کے مقابلہ میں سیّد صاحب کی پناہ لے سکتا تھا مگر جب آقایانِ شاہ کی نظریں تیز ہوئیں تو پھر معتمد الدولہ کی معتمدیت کا فیصلہ لامحالہ وہی تھا جو اُس نے کیا ؎

در پسِ پردہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ اُستاذِ ازل گفت ہماں می گویم

[۲] سیرت سیّد احمد شہید ص ۱۵۲، ص ۱۵۴۔

Marfat.com

اور تنہائی میں سید صاحب سے ملاقات کی درخواست کی۔ چنانچہ روانگی کے دن تقریباً دو[۲] گھنٹہ خلوت میں گفتگو ہوتی رہی۔ نواب کو سید صاحب نے نصیحتیں کیں مظالم کے نتائج بد سے متنبہ کیا۔ نواب صاحب نے توبہ بھی کی۔ سید صاحب نے ایک عمدہ گھوڑی نواب صاحب کو ہدیۃً پیش کی۔ نواب صاحب نے بہت کچھ عذر معذرت کے ساتھ سید صاحب کا ہدیہ قبول کیا۔ (وغیرہ وغیرہ)۔

جب قافلہ روانہ ہو چکا تو بادشاہ صاحب کا بھی پیغام پہنچا کہ ملاقات کا اشتیاق ہے۔ سید صاحب خود تو دوبارہ تشریف نہیں لائے۔ البتہ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو بھیج دیا۔ یہ دونوں بزرگ دو[۲] ہفتہ لکھنؤ میں قیام پذیر رہے مگر اہل دربار نے اس کا پورا انتظام رکھا کہ اس عرصہ میں بادشاہ سلامت کسی وقت بھی ہوش میں نہ آئیں ع

من چہ سرائم وطنبورہ من چہ سراید

چنانچہ دو ہفتے لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد یہ دونوں بزرگ واپس تشریف لے گئے۔

سیّد صاحب اور آپ کے قافلہ کا دوسرا دورہ

سات[۱] ہزار میل کی انقلاب انگیز سیاحت

لکھنؤ سے واپس ہو کر چند ماہ رائے بریلی میں قیام رہا۔ پھر دوسرے دورہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مقصود دورہ اس دورہ کے متعلق اعلان تو یہی تھا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے یہ دورہ ہے لیکن یہ عجیب و غریب سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے کہ کیا سید صاحب

---

[۱] یعنی رائے بریلی سے کلکتہ، کلکتہ سے مکہ معظمہ پھر مدینہ منورہ، مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ ہوتے ہوئے بمبئی۔ بمبئی سے براستہ سمندر کلکتہ، کلکتہ سے رائے بریلی۔

Marfat.com

اور اُن کے ساتھیوں پر حج فرض تھا؟ اور جن حالات میں سید صاحب اور اُن کے رفقاء نے یہ سفر کیا، کیا وہ اس قابل تھے کہ شرعی نقطۂ نظر سے حج فرض ہو سکے؟

شرعی نقطۂ نظر سے حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کی ضروریات سے بچا ہوا اتنا سرمایہ موجود ہو کہ سفر حج کی تمام ضرورتیں بآسانی انجام پاسکیں۔ یہاں سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ دو وقت کھانا بھی آسانی سے میسّر نہیں ہو سکتا تھا۔ بقول شخصے ؏

برات عاشقاں بر شاخ آہو

سوانح نگاروں نے اس سفر کا مقصد بھی ایک غلط عقیدہ کی اصلاح قرار دیا ہے۔ یعنی اُن خطرات کی بناء پر جو اٹھارھویں صدی عیسوی[1] میں پرتگالیوں کی بحری قزاقیوں کے باعث پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ علماء نے فریضۂ حج کی معافی کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جس کی بناء پر عام خیال ہو گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند پر حج فرض نہیں۔ سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کا منشا یہ تھا کہ اس غلط عقیدہ کی اصلاح کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبد الحیؒ صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کا ایک فتویٰ اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف سے اس فتویٰ کی پُر زور تصدیق[2] بھی نقل کی جاتی ہے۔

لیکن سوانح نگاروں کی اس رائے سے ہم مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ اس غلط عقیدہ کی اصلاح کے لئے صحیح فتوے کی اشاعت کافی تھی۔ اصلاح کے لئے ایسا سفر اختیار کرنا

---

[1] تاریخ کی کس قدر عبرت انگیز حقیقت ہے کہ وہی مسلمان جو سمندروں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے جن کے سفینے ساتوں سمندروں کے سینوں پر رات دن دوڑتے تھے جنھوں نے ساری دنیا میں بحری تجارت کی راہیں کھولی تھیں، اور آخری بات یہ کہ جو کولمبس کے بیڑے کو یورپ سے امریکہ لے گئے اور جن کی راہنمائی سے واسکوڈی گاما افریقہ کے ساحل سے ہندوستان پہنچا، پھر یہی ہیں جو اپنے پروردہ پرتگالیوں سے اتنے سہمے کہ فریضۂ حج کی معافی کا فتویٰ دینے لگے۔ [2] ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اوّل ص ۱۷۵

Marfat.com

جو فقہی نقطۂ نظر سے خود اصلاح طلب ہو، کسی طرح بھی حضرت سید صاحب اور اُن کے پاکباز ساتھیوں کے شایان نہیں۔ (رحمہم اللہ)

اس سفر کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کا (جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے آٹھ سو ہو گئی تھی) اصل سرمایہ توکل تھا یعنی وطن سے روانگی کے وقت زادِ راہ سے دامن خالی تھا۔ محض خدا کے بھروسہ پر سفر شروع کیا گیا۔ ایسی حالت میں حج فرض تو کیا ہوتا[1]، حج کے لئے سفر کا جواز بھی مشتبہ اور مشکوک ہے۔

کچھ ساتھیوں نے ایثار سے کام لیا، اور جو زمین، جائداد اُن کے پاس تھی اُس کو فروخت کر کے وہ سفر میں شریک ہو گئے۔ یہ ایثار خواہ کتنا ہی قابلِ قدر ہو مگر شریعت نے اس کا حکم نہیں کیا اور نہ ایسی صورت میں ایثار شیوہ پر فریضۂ حج عائد ہوتا ہے۔

بہر حال ایثار اور قربانی کی تاریخ میں یہ سفر خواہ کتنا ہی واجب الاحترام ہو لیکن اگر اس کا مقصد صرف اصلاحِ عقیدہ تھا تو شرعی فیصلہ اس کے حق میں بہت زیادہ مشکوک ہے۔ شریعت نہ اس کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ اس کی اجازت دیتی ہے، کہ غلط عقیدہ کی اصلاح ایسے عمل سے کی جائے جس کا جواز خود مشتبہ ہو۔ علاوہ ازیں اصلاحِ عقیدہ بھی اُسی وقت ہو سکتا تھا جب الگ الگ سفر کرتے۔ اس طرح ایک فوج بنا کر جانے میں تو وہ خطرہ خود ہی ختم ہو جاتا تھا جس کی بناء پر یہ غلط عقیدہ قائم ہوا تھا۔

---

[1] چنانچہ تبت کے چند مسلمان جو پٹنہ میں شریکِ قافلہ ہونا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کو حج کے بجائے خود اپنے وطن میں جا کر تبلیغ و اصلاح کی ہدایت کی کیونکہ اُن کے پاس مصارف نہیں تھے۔ آپ نے فرمایا چونکہ زادِ راہ تمہارے پاس کم ہے اس لئے حج تم پر فرض نہیں اور مراد بیت اللہ شریف کی زیارت سے یہ ہے کہ اللہ راضی ہو۔ اب اگر تم سب صاحب مانو، تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے وطن جاؤ اور تبلیغ و اصلاح کی کوشش کرو اور اس کی پابندی کرو کہ کوئی تم کو خواہ کتنی ہی ایذا پہنچائے تمہیں مارے پیٹے یا ستائے تم صبر سے کام لو، انتقام اور بدلہ کا تصور بھی دماغ میں نہ لاؤ (سیرت سید احمد شہید ص ۲۱۹ ج ۱)

ایشیائی بلاک حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مدبرین تقریباً پچاس سال پہلے محسوس کر چکے تھے کہ بیرونی طاقت کی امداد کے بغیر ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ[1] نہیں ہو سکتا یہی وجہ تھی کہ سلطان ٹیپو فرانسیسیوں سے ساز باز کرتا رہا اور سلطان کو اگر وقت پر فرانسیسیوں کی امداد حاصل ہو جاتی تو ہندوستان کا سیاسی نقشہ دوسرا ہوتا۔ مرہٹوں نے بھی اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا، چنانچہ ان کی فوجوں میں فرانسیسیوں کی بہت بڑی طاقت کام کر رہی تھی۔

یہ پچاس سال پہلے کی باتیں تھیں۔ سیّد صاحب کے دور میں انگریزی اقتدار ترقی کی پچاس منزلیں اور آگے طے کر چکا تھا، اور ہندوستانی طاقتیں پچاس درجہ نیچے گر چکی تھیں۔ اب ہندوستان کے کسی تاجدار یا تخت نشین کی امداد کے بھروسہ پر کامیابی کی توقع عبث تھی۔ پھر ان اقتدار پسندوں کا تماشا سیّد صاحب خود دیکھ چکے تھے کہ جب انگریز کا سبز باغ سامنے آیا تو نہ ہلکر[2] کے قدم ثابت رہے اور نہ خان[3] کے۔ اس وقت جو ہندوستان کا

---

[1] چنانچہ ۱۷۸۹ء میں جب جنرل میدوز اور کرنل میکسول سلطان ٹیپو سے برسرِ پیکار تھے تو "بورنگ" کا بیان ہے:

> سلطان نے پانڈیچری پہنچ کر فرنچ گورنر سے درخواست کی کہ اس کو چھ ہزار فرانسیسی سپاہیوں سے مدد دے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ ٹیپو نے اس وقت بھی یہ وعدہ کیا کہ انگریزی مقبوضات فرانس والوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ گورنر نے اس درخواست کو شاہ فرانس کے پاس بھیجا لیکن "لوئی شانزدہم" نے انقلابِ فرانس کے ڈر سے اس درخواست پر اس وقت توجہ نہیں دی۔ (تاریخ سلطنت خداداد میسور ص ۲۳۲)

میجر جنرل سر جان میلکم جو ٹیپو کو انگریزی حکومت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ خطرناک دشمن قرار دیتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ٹیپو انگریزوں کے مقابلہ میں فرانس سے تعاون کے لئے راضی تھا (ملاحظہ ہو سیاسی تاریخ ہند)۔

[2] جسونت راؤ ہلکر جن کو اندور کی ریاست دے کر خاموش کر دیا گیا۔ [3] امیر علی خان جن کو ٹونک کی ریاست پر راضی کر لیا گیا۔

Marfat.com

سب سے بڑا اور سب سے مضبوط جنگ جو حکمراں[1] تھا، پنجاب و ملتان و سندھ کی پوری طاقت جس کے زیر نگیں تھی، اُس نے بھی اُن کو یہی مشورہ دیا کہ :

"صاحبان کمپنی سے جنگ کرنا غلط ہے۔ ریاست لو اور چین کرو۔"

بہرحال مایوسی اور عافیت کوشی کے اس دور میں کامیابی کی صرف یہی راہ تھی کہ

الف : عوام میں رُوحِ انقلاب پیدا کی جائے۔

ب : اور یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں ایشیائی طاقتوں کو متحد کیا جائے۔

مذہبی عنوان حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اصول کے مطابق ایشیائی طاقتوں کا یہ اتحاد اقتصادی مسائل کی بنیاد پر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس وقت تک اقتصادی مسائل میں اتنی کشش نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اُن کی بنیاد پر رُوحِ انقلاب پیدا کی جاسکتی البتہ مذہبی جذبات[2] بیدار تھے۔ اور اُن کے نام پر انقلاب کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کا مطالبہ بھی کامیاب ہوسکتا تھا، اور ایشیا کی برسرِ اقتدار طاقتیں جن سے ہندوستان کا تعلق عرصہ سے تھا، وہ سب ایک ہی مذہب رکھتی تھیں۔ لہٰذا سیاسی انقلاب اور ایشین اتحاد کیلئے

---

[1] یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ جن سے امداد لینے کے لئے ۱۸۰۹ء میں جسونت راؤ ہلکر اور نواب امیر علی خان پنجاب گئے تھے۔ مہاراجہ نے امداد دینے کے بجائے ان کو مشورہ دیا کہ انگریزوں سے صلح کرلیں۔ پھر کوشش کرکے صلح کرادی (مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی)۔ [2] سید صاحب کی اس تحریک سے تقریباً تیس سال بعد ۱۸۵۷ء میں جب قومی انقلاب کی اسکیم تیار کی گئی تو اس وقت بھی مذہبی عنوان ہی اختیار کرنا پڑا تھا۔ یعنی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کا مسئلہ اور یہ پراپیگنڈہ کہ پن چکی کے آٹے میں ہڈی پیس کر ملادی جاتی ہے۔ اس وقت ظفر شاہ بہادر نے جو اپیل کی تھی، اس میں بھی مذہب ہی کا واسطہ دیا تھا کہ انگریز جملہ مذاہب کو غارت کیا چاہتے ہیں ——— چند مثالیں پیش کرکے آخر میں یہ تھا۔ "اہلِ ہنود کو گنگاجی اور تلسی اور سالک رام کی قسم اور مسلمانوں کو قرآن شریف کی قسم ہے کہ وہ بالاتفاق شامل ہوکر اپنی جان اور ایمان کی حفاظت کے واسطے انگریزوں کا قتل اپنے ذمہ فرض سمجھیں (تاریخ بغاوت ہند ص۳۸۵ و ص۳۸۷)۔

مذہبی عنوان کا راستہ مختصر بھی تھا اور اس سے کامیابی کی توقع بھی زیادہ تھی۔

دورہ کا اصل مقصد سید صاحب نے جن حالات میں سفرِ حج کا اعلان کیا، وُہ فرضیتِ حج کے لئے ناکافی تھے یعنی ان حالات میں نہ سید صاحب پر حج فرض تھا نہ آپ کے ساتھیوں پر۔ البتّہ فرضیتِ انقلاب کے لئے وہ حالات کافی اور وافی تھے۔ کیونکہ اسلامی تعلیم ایسے حالات میں کہ وطنِ عزیز پر اجنبی طاقت کا تسلّط ہوجائے، انقلاب کو فرض قرار دیتی ہے۔ اور یہ فرض صرف اجتماعی نہیں رہتا بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک کا فرض ہوجاتا ہے کہ جہاں تک اس کی آخری مقدور ہو، وہ انقلاب کے لئے اپنی جدّوجہد صرف کردے۔ اس موقع پر جو قربانی بھی پیش کی جاتی ہے، وہ مستحق صد تحسین اور پسندیدہ ہوتی ہے۔

ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ بال بچوں کو بھوکا پیاسا چھوڑ کر بلا کسی سازو سامان کے ادائے حج کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہو۔ لیکن اگر وہ انقلابی مقصد کے لئے ایسا کر رہا ہے تو اس کا ہر ایک اقدام مبارک اور اسکی ہر ایک قربانی باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ اب وُہ گرد بھی مقدّس ہے جو اس کے پیروں پر پڑتی ہے، اور وہ غبار بھی طوطیائے چشمِ سعادت ہے جس سے اس کے کپڑے مَیلے ہوتے ہیں۔

سید صاحب کے اس دورہ کا ظاہری عنوان بے شک حج بیت اللہ تھا مگر جو معنے اس عنوان میں پوشیدہ تھے، وہ وہی تھے جو اس پارٹی کا نصب العین تھا یعنی فکّ کُلّ نظام ــــ "سیاسی، سماجی، ہمہ گیر انقلاب"۔

چنانچہ ابھی آپ فرائضِ حج سے پوری طرح فارغ نہیں ہوئے تھے کہ آپ نے "منا" کے مقدّس قیام گاہ میں یعنی اس مقام پر جہاں تقریباً ساڑھے بارہ سو برس پہلے داعیٔ حق رحمۃ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انصار سے بیعت لی تھی، آپ نے ساتھیوں سے بیعتِ جہاد لی۔[1]

---

[1] سیرت سید احمد شہید کی عبارت یہ ہے "منٰی میں عقبہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے بیعت لی"۔

Marfat.com

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ایشین بلاک کے لئے اس کی ضرورت نہیں تھی، کہ آٹھ سو ساتھیوں کا قافلہ حج کرنے مکہ معظمہ جائے۔ چند خاص خاص ارکان جماعت کی سفارت بھی ایشیائی قوموں کے سامنے یہ دعوت پیش کرسکتی تھی۔ چنانچہ اس دورہ کے بعد آپ سفراء کے ذریعہ یہی پیغام پہنچاتے رہے۔ مگر یہ اعتراض اُسی وقت ہوسکتا ہے جب تحریک کا پورا مقصد سامنے نہ ہو۔

تحریک کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ سیاسی انقلاب کے ساتھ سماجی انقلاب بھی کیا جائے تاکہ نظریۂ "فک کل نظام" کی تکمیل ہو، اور انقلاب کے بعد حکومت ایسے ہاتھوں میں پہنچے جو اصلاح یافتہ ترقی پذیر سماج کے کامیاب معمار ثابت ہوں۔ یہ آٹھ سو ساتھیوں کا قافلہ محض سیاسی قسم کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اصلاح و تربیت کا نہایت کامیاب ذریعہ تھا۔ یہ گویا چلتا پھرتا اصلاحی آشرم تھا جس کا ہر ایک ممبر خود بھی تربیت پا رہا تھا اور اپنے دیکھنے والوں کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعتِ طریقت[1] لینے کے لئے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعتِ جہاد لینے کیلئے دورہ پر بھیجا، اس کے بعد سارے قافلے سمیت حج پر جانے کا حکم دیا تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے۔"[2]

دوسرے دورہ کے مختصر حالات

اس تمہید کے بعد دوسرے دورہ کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

کان پور: کوڑہ جہاں آباد، قصبہ مجھاون، کھجوہ، فتح پور اور قصبہ ڈلمؤ کے باشندے حضرت سیّد صاحب کے قافلہ کو ایک عرصہ سے دعوت دے رہے تھے،

---

[1] یعنی اخلاق اور رُوحانی اصلاح کے لئے معاہدہ۔ [2] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۵۳

سید صاحب نے پہلے اُن کا تقاضا پورا کیا اور ان مقامات کا دورہ فرماکر اپنے وطن رائے بریلی تشریف لے آئے۔ اس مختصر دورہ میں بڑے دورہ کے لئے رفقاء فراہم کئے گئے اور اس کے مقاصد بھی سمجھائے گئے۔

آخر شوال ۱۲۳۶ھ[1] مطابق ۱۸۲۱ء روز دوشنبہ آپ دوسرے دورہ کے لئے اپنی خانقاہ (تکیہ شاہ علم اللہ) سے روانہ ہوئے۔ ساتھیوں کی تعداد چار سو تھی اور کُل قافلہ کا خرچ آپ کے ذمّہ تھا۔ تکیہ سے نکل کر سب سے پہلے "سی" ندی پابوسی کے لئے حاضر تھی آپ نے ندی پار کی۔ دوسرے کنارے پر پہنچے۔ جو لوگ پہنچانے گئے تھے، اُن کو رخصت کیا۔ آپ کے خزانچی مولانا محمد یوسف صاحب کی تحویل میں جو کچھ تھا، اُس کا جائزہ لیا۔ کچھ اُوپر سو روپے تھے۔ آپ نے یہ پوری رقم اپنے ہاتھ سے رائے بریلی کے غرباء، بھنگی، دھوبی، حجّام وغیرہ شاگرد پیشہ لوگوں کو تقسیم کر دی۔

اللہ پر بھروسہ کی ایک مثال ایک میل چل کر ایک باغ میں آرام فرمایا۔ اہلِ قافلہ شمار کئے گئے۔ چار سو پانچ تھے۔ ان کے علاوہ اسّی (۸۰) گھار تھے۔ آپ نے مولانا محمد یوسف صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا اب بھی آپ کی تحویل میں کچھ باقی ہے؟ مولانا محمد یوسف صاحب نے جواب دیا۔ صرف سات روپے باقی ہیں۔

حضرت سیّد صاحب: سات روپیہ میں قافلہ کا ایک وقت کا خرچ بھی نہیں چل سکتا۔ لاؤ، وطن عزیز کے غرباء میں سے جو یہاں موجود ہیں۔ جن کو پہلی مرتبہ کچھ نہیں ملا۔ یہ روپے اُن کو تقسیم کر دو۔

مولانا محمد یوسف جب تعمیلِ حکم سے فارغ ہو چکے تو سیّد صاحب نے برہنہ سر

---

[1] منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری فرماتے ہیں۔ یکم شوال ۱۲۳۶ھ یعنی بروز عید الفطر بعد ادائے نماز عید مع چار سو مرد، عورتوں اور بچوں کے بارادہ حج آپ بریلی سے روانہ ہوئے۔ ایک میل چل کر ایک باغ میں ڈیرہ ہوا۔ وہاں کُل اہلِ قافلہ کی شمار کی گئی۔ کُل چار سو سات آدمی تھے (سوانح احمدی ص ۵۹)

Marfat.com

دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور اپنے پروردگار سے عرض کیا :

"اے کریم کارساز! تُونے اتنی مخلوق اس بندۂ ذلیل کے سپرد فرمائی ہے۔ خداوندا تُو ہی کارساز و چارہ گر ہے۔ اپنی مہربانی سے اس پورے قافلہ کی کفالت فرما اور اس کو بخیر و خوبی منزلِ مقصود تک پہنچا۔"

اہلِ قافلہ کی کیفیت چار سو سے زائد ساتھیوں کا یہ قافلہ گویا ایک خاندان تھا۔ نئے ساتھیوں کو کسی وقت بے سروسامانی اور تہی دستی سے پریشانی ہوتی، تو پُرانے ساتھی فوراً اُن کو ضبط و تحمّل اور خدا پر توکّل کی تلقین کرتے (بقول مصنف وقائع احمدی و مخزن)

قافلہ کے ساتھی راستہ کا سرد و گرم برداشت کرنے کے لئے تیار اور تنگی و ترشی میں خدا کے ذکر و شکر سے اُن کی زبانیں تر رہتی تھیں۔ کبھی سخت بارش ہوتی۔ کبھی کڑاکے کی دُھوپ، دلدل اور کیچڑ، ندی نالے راستہ میں ملتے۔ اگر کسی کا پاؤں پھسلتا تو وہ ہنس کر خدا کا شکر ادا کرتا اور کہتا کہ تیرے احسان کے قربان کہ تیرے راستہ میں گرا ہوں۔ پچھلی تمام لغزشوں اور بے ہودہ حرکتوں کی تلافی یہی ہے۔ کوئی خواجہ حافظ کا یہ شعر حسبِ حال پڑھتا ہے

در بیاباں گر زشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور[1]

پہلا مقام قصبہ ڈلمئو میں لبِ دریا ایک قلعہ تھا۔ اس کی بارہ دری میں سب سے پہلا قیام ہوا۔ قرب و جوار کے باشندے ہزاروں کی تعداد میں ملاقات اور زیارت کے لئے آتے تھے۔ اور مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تقریروں سے نئی زندگی حاصل کر کے واپس ہوتے تھے۔

۴ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ، ۳۱ اگست ۱۸۲۱ء کو ڈلمئو سے سفر دریا کے راستے سے شروع

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۵۹

ہوا۔ بنارس تک پانچ کشتیاں[1]، پانچ سو روپیہ کرایہ پر لی گئیں۔ عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کو اُن پر سوار کر دیا گیا۔ باقی مردوں کے دو گروپ کر دیئے گئے۔ ایک مولانا عبدالحیؒ[2] صاحب کی زیر قیادت دریا کے کنارہ کنارہ روانہ کیا گیا۔ ۸۰ آدمیوں کا دوسرا گروپ مولانا محمد یوسف صاحب کی رہنمائی میں دوسرے راستہ سے روانہ کیا گیا۔ دونوں قافلوں کو ہدایت یہ تھی کہ راستہ کے دیہات میں وعظ و تقریر اور اپنے مقاصد کا پیغام دیتے ہوئے چلیں[3]۔

سید صاحب نے ڈلمئو کے اجتماعات میں اور کشتیوں پر سوار ہوتے وقت اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرمائی :

(۱) ایک ماں باپ کی اولاد کی طرح آپس میں محبت اور اتفاق سے رہو۔ دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھو۔ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاؤ۔ کمزوروں کی مدد کرو۔ خدمت کو عزت سمجھو۔ اللہ کی رضامندی کے کام یہی ہیں[4]۔

(۲) ہم صرف اللہ کے لئے محض اللہ کے بھروسہ پر گھر سے نکلے ہیں تقویٰ ہمارا خصوصی امتیاز (شعار) ہونا چاہیئے۔ ہمارا زادِ راہ توکل ہے۔ ہم کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے ضرورت پڑی تو ہم مزدوری کریں گے۔ آدھا کھائیں گے اور آدھا جماعتی ضرورتوں کے لئے محفوظ کریں گے[5]۔

---

[1] پانچ کشتیاں سو روپیہ فی کشتی کے حساب سے کرایہ پر لیں اور سو روپیہ پیشگی ادا کر دیئے (سید احمد شہید ص۱۹۰)

[2] غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق یہ ہے "سید صاحب نے اپنے ساتھیوں میں سے مضبوط اور توانا آدمیوں کی ایک جماعت کو پیدل چلنے کا حکم دیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالحیؒ اور مولوی محمد یوسف صاحب پھلتی، باری باری اس جماعت کی قیادت فرماتے تھے۔ الہ آباد سے بنارس تک کے سفر میں شاہ اسمٰعیل نے فرضِ قیادت انجام دیا (سید احمد شہید ص۲۰۲)۔ [3] سیرت ص۱۸۳۔ [4] سیرت سید احمد شہید ص۱۸۰، ۱۸۱۔ [5] ایضاً ص۱۸۳۔ وقائع احمدی میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے اہلِ ہند کے لئے جناب الٰہی میں بہت دعا کی۔ الٰہی! ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے۔ ہزاروں مال دار صاحب زکوٰۃ مر گئے مگر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اسکے بعد آپ نے سید زین العابدین صاحب سے فرمایا۔ جو کچھ باقی ہو لے آؤ۔ صرف پانچ روپے باقی تھے۔ سید صاحب نے وہ بھی ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیئے، اور فرمایا۔ پروردگار کا خزانہ بھرا ہوا ہے[1]

کشتیاں روانہ ہوئیں۔ خشکی کے قافلوں نے بھی قدم بڑھایا۔ موضع ڈھٹی، موضع ڈگڈگی، پیرنگر، قصبہ گتنی، موضع کیمہ، موضع اوجھنی، موضع اسرولی، موضع چھپری، موضع برھمنڈی میں کہیں ایک وقت اور کہیں ایک دو دن قیام کرتے ہوئے قافلہ الٰہ آباد پہنچا۔ بلوہ گھاٹ پر کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ "راجہ اودت نرائن" کی بارہ دری میں قیام ہوا۔ شیخ غلام علی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نفس و شیطان کے بہکانے سے اس بنا پر حج سے محروم رہ گئے کہ راستہ میں امن نہیں ہے۔ ہزاروں صاحب ثروت اب جتنے ہیں اس وسوسے میں پڑ کر حج کے لئے نہیں جاتے۔ الٰہی! اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے، بے دغدغہ چلا جائے۔ اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب فرمائی۔ ارشاد ہوا جب تو حج کرے گا، تو یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے۔ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے وہ انشاءاللہ بچشم خود یہ سب کچھ دیکھ لیں گے (وقائع بحوالہ سید احمد شہید ج ۱ ص ۱۹۲)۔ مگر یہ واضح رہے کہ اس سے عزم جہاد کی نفی نہیں ہوتی "بیک کرشمہ دو کار" کی یہ بہت ہی مقدس مثال ہے۔ محمد میاں

چنانچہ خود مہر صاحب مصنف "سید احمد شہید" بھی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں فتح باب حج سلطانوں اور فرماں رواؤں کا کام تھا، جنہیں اسباب و وسائل پر وسیع قدرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس دروازے کو کھولنے اور راستے کی ساری مشکلات کو بے حقیقت ثابت کرنے کا شرف سید صاحب کو بھی ملا جن کے پاس اسلام کی بے میل محبت کے سوا کوئی متاع نہ تھی۔ اس طرح باب جہاد بھی اربابِ سلطنت و حکومت ہی کے ذریعے سے کھل سکتا تھا جو خیل و خدم اور ثروت و حشم کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس مقدس فریضے کو بھی بارہ (۱۲) صدیوں کے بعد منہاج نبوت پر قائم کرنے کی برتری صرف سید صاحب ہی کو حاصل ہوئی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(ص ۱۹۳ ج ۱)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۸۳

Marfat.com

صاحب رئیسِ اعظم الہ آباد (مختار راجہ اودت نرائن) میزبان تھے۔ بارہ روز قافلہ مقیم رہا۔ تقریباً دو ہزار آدمیوں کا کھانا دونوں وقت تیار ہوتا تھا۔ روانگی کے وقت قافلہ کے لئے تقریباً تین ہزار روپیہ کے اسلحہ، ایک بڑا خیمہ، بارہ چھوٹے خیمے، پانچ ہزار روپیہ نقد، قافلہ کے ہر ایک شخص کے لئے ایک جوڑا کپڑا، ایک روپیہ نقد۔ سید صاحب اور اُن کے اہل وعیال کے لئے عمدہ کپڑے، کچھ بیش قیمت تحفے، مبلغ پانچ صد روپے نقد پیش کئے گئے[1]۔

اس موقع پر وقائع احمدی کی ایک معنی خیز روایت ملاحظہ فرمائیے:

"شیخ صاحب (شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد) کا یہ معمول تھا کہ جتنی مرتبہ آپ خدمت میں آتے، کوئی عمدہ بیش قیمت ہتھیار ضرور لاتے۔ دن میں ایک بار بھی، دو بار بھی۔ حضرت نے فرمایا۔ ابھی ہم حج کو جاتے ہیں وہاں ہتھیار لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ آپ ہر وقت روز، روزینہ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ وہاں سے جب اللہ تعالیٰ ہم کو مع الخیر لائے گا، تب ہم آپ سے لیں گے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ اوّل تو مجھ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کہاں جہاد کریں گے۔ اس ملک میں یا کسی اور ملک میں۔ پھر مجھ کو خود اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں۔ اگر میں مرگیا، تو میری آرزو باقی رہ جائے گی۔ آپ اس کو لے جائیں۔ پھر آپ کو اختیار ہے جہاں چاہیں رکھ دیں[2]۔

یہ تو روزمرہ کا دستور تھا۔ اور جب شیخ صاحب اسی قیام کے دوران میں سید صاحب سے بیعت ہوئے تھے تو بیش بہا نذرانہ[3] کے ساتھ سترہ ایسے خوبصورت اور نادر ہتھیار پیش کئے تھے جو امیروں کے سلاح خانوں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے[4]۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ اس قافلہ کی مہمان داری اور نذرانہ میں بیس ہزار روپے شیخ

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۹۲، ۱۹۳۔ [2] وقائع احمدی بحوالہ سیرت سید احمد شہید ص ۱۹۲ ج ا۔ [3] نذرانہ کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے۔ اکیس کشتیوں میں کم خواب، مشروع کے تھان اور کئی جوڑ دوشالے، نمینوں، ململ اور خاصہ کے تھان اور پانچ سو روپیہ نقد۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۹۲)۔

Marfat.com

علام علی صاحب نے خرچ کر دیئے تھے۔[۱]

شیخ صاحب کے ذمہ کام | یہ شیخ صاحب کی خاطر مدارات تھی۔ سید صاحب نے اس کے صلہ میں جو عنایت فرمایا، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

> سید صاحب نے فرمایا۔ شیخ صاحب! پورے علاقہ کی اصلاح آپ کے ذمہ ہے۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کے بہت سے کام سرکار سے پڑتے رہتے ہیں آپ ان میں غریب کاشتکاروں کی امداد فرمایئے۔ مال گذاری میں کمی کیجئے۔ تحصیل وصول میں نرمی سے کام لیجئے۔ آپ اُن کے دل میں گھر کر لیجئے۔ پھر یہ آپ کے ہیں۔ آپ جو کہیں گے یہ اس کے لئے جان چھڑکیں گے۔[۲]

قلعہ الہ آباد | میں تقریباً تین سو مسلمان سپاہی تھے۔ انہوں نے سید صاحب کی دعوت کی۔ سید صاحب کو قلعہ میں لے گئے۔ مسلمان بادشاہوں کے شہ نشین پر سید صاحب کو بٹھایا۔ سید صاحب سے بیعت ہوئے۔ چالیس روپیہ نقد، ایک پستول، ایک انگریزی گرج، ایک فرڈ ناٹ نذرانہ پیش کیا۔[۳] مولوی کرامت علی صاحب صدر امین نے سفید پارچے اور پشمینے کے تھان اور چالیس روپے نقد پیش کئے۔ شاہ اجمل صاحب[۴] رحمہ اللہ نے پچاس روپے نقد اور خوشنما رضائیاں ہدیہ کیں۔

الہ آباد سے مرزا پور | بارہ روز الہ آباد قیام کرنے کے بعد پھر اُسی شان سے قافلہ روانہ ہوا۔ عورتیں بچے اور کمزور مرد کشتیوں میں، باقی آدمی دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر دیہات کا گشت کرتے ہوئے مرزا پور پہنچے۔ مرزا پور کے ایک سوداگر نے قیام کا انتظام کیا۔ دل

---

[۱] سیرت سید احمد شہید ص۱۹۳۔ [۲] سیرت سید احمد شہید۔ [۳] الہ آباد کا دائرہ شاہ اجمل جس کے سجادہ نشین آج کل مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری صدر جمعیۃ علماء اُتر پردیش ہیں۔ آپ ہی کے اسم گرامی اور نام نامی کی طرف منسوب ہے۔ [۴] حضرت شاہ اجمل صاحب بیمار تھے۔ آپ خود تشریف نہیں لا سکے۔ آپ نے اپنے صاحبزادہ شاہ ابو المعالی رحؒ کو استقبال کے لئے بھیجا، اور جب قافلہ الہ آباد سے روانہ ہونے لگا، تو یہ نذرانہ پیش فرمایا۔ (وقائع احمدی و سیرت سید احمدؒ وغیرہ)

Marfat.com

کھول کر قافلہ والوں کی مدارات کی۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد روانگی ہوئی تو چار ہزار روپیہ نقد اور ایک پستول نذر میں پیش کی اور خود بھی بارادہ حج شریکِ قافلہ ہو گئے مولانا فرزند علی صاحب نے بھی مبلغ اسّی[۸۰] روپیہ اور اہلِ قافلہ کی پوشاک کے لئے گاڑھے کے چالیس تھان پیش کئے۔

مرزا پور سے چنار گڑھ ہوتا ہوا ۸ ر ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ کو ایک ماہ ۲۶ روز میں یہ قافلہ بنارس پہنچا۔ ایک ماہ بنارس میں قیام کیا۔ یہاں سے دوسری کشتیاں کرایہ پر لی گئیں۔ ۱۰ محرّم ۱۲۳۶ھ کی شام کو بنارس سے روانگی ہوئی۔ پہلا قیام زمانیہ (ضلع غازیپور) میں ہوا۔ پھر غازی پور، بارہ، بکسر، بلیا قیام کرتے ہوئے چھپرا پہنچے۔ جہاں فرحت علی صاحب کے مکان پر بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ چھپرے سے داناپور پہنچ کر ایک ہفتہ قیام کیا۔

داناپور سے روانہ ہو کر قافلہ عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ مدرسہ کے متصل کشتیاں باندھ دی گئیں۔ دو ہفتہ اس شہر میں قیام رہا۔ ہزارہا بندگانِ خدا فیض یاب ہوئے۔

عظیم آباد سے قصبہ باڑھ پھر مونگیر، اس کے بعد بھاگل پور قیام کرکے مرشد آباد پہنچے۔ وہاں چند روز قیام رہا۔ پھر ہگلی میں کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ جہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔

ہگلی میں شیخ امین الدین[ل] احمد صاحب تاجر نے پیش قدمی کرکے اپنے یہاں قیام کی دعوت دی۔ شیخ صاحب آپ کے قیام کے لئے ایک باغیچہ خرید چکے تھے جس میں عظیم الشان

ل منشی امین الدین صاحب بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے۔ کلکتہ کے ممتاز امیروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ انگریزی کمپنی میں انہیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا، اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب کی وساطت سے ہی پیش ہوتے تھے۔ تنخواہ مقرر نہ تھی، مگر حقِ وکالت کی رقم چالیس ہزار کے قریب ماہانہ ہو جاتی تھی، جو ہاتھیوں پر لاد کر ماہانہ بھیجی جاتی تھی۔ بڑے فراخ حوصلہ مخیر تھے۔ چار سو، پانچ سو طلبہ کا خرچ اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ (سید احمد شہید)

Marfat.com

حویلی تھی۔ جو قافلہ کا قیام گاہ بنی۔

سیّد صاحب کے پاس کافی اسلحہ تھے، اور کلکتہ میں اسلحہ کا داخلہ ممنوع تھا۔ شیخ امین الدّین صاحب کے تعلّقات کام آئے اور یہ ممنوع فعل نظر انداز ہوگیا۔ قافلہ پورے اسلحہ کے ساتھ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

کلکتہ میں دو ماہ قیام رہا۔ قافلہ کا چرچا بنگال سے گزر کر آسام، برما اور جاوا تک پہنچ گیا۔ پیگو (برما) سے سیّد حمزہ سونا فروخت کرنے کے لئے کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ پیگو کے سرکاری حلقہ میں ان کا اثر اور رسوخ کافی تھا۔ انہوں نے سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی طرح سلہٹ، چاٹ گام وغیرہ سے بھی بہت سے لوگ آئے اور حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

سرزمین بنگال جو سراج الدولہ کے زمانہ سے زخم خوردہ تھی، اور مولانا شریعت اللہ صاحب[۱] جیسے جانبازوں کی قربانیاں اس زخم کو اب تک ہرا کئے ہوئے تھیں۔ سیّد صاحب کی تشریف آوری سے نئے جواہر اُگلنے لگی۔

بنگالیوں کے ہجوم ہزاروں کی تعداد میں بنگال کے کونہ کونہ سے آتے اور شمعِ عزیمت

---

[۱] مولانا شریعت اللہ صاحب بہادر پور ضلع فرید پور کے ایک جوان صالح جنہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں زیارت بیت اللہ الحرام کے لئے اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہا۔ بیس سال حجاز مقدس میں قیام کیا۔ شیخ طاہر السنبل مکی شافعی کے فیوض سے دامنِ تحصیل پُر کیا۔ ۱۸۰۲ء میں ہندوستان واپس آئے اور تبلیغ و اصلاح کے چراغ روشن کئے۔ ۱۸۰۴ء میں ایک اصلاحی جماعت قائم کی جس کا نام "فرائضی" رکھا۔ تجدّد و اصلاح کا ذوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ پیر اور مرید کے پُرانے الفاظ بھی اُستاد اور شاگرد کے الفاظ سے بدل دیئے گئے۔ پیر و مرشد کی بجائے اُستاد و شاگرد بولتے تھے۔ دھودو میاں اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ جنہوں نے بہادر پور کو صدر مقام قرار دے کر بالخصوص کاشتکاروں میں تبلیغ کی۔ اُن کا منشاء مذہبی تبلیغ کے علاوہ غرباء میں باہمی امداد کی رُوح پیدا کرنا اور اُنہیں زمینداروں کی دست بُرد سے بچانا تھا۔ (مذاہب ہند کی تحقیقات از پادری ٹائیٹس (انگریزی) ص۱۷۹ و ۱۸۱ بحوالہ روشن مستقبل ص۱۰۴)۔

Marfat.com

بے پروانہ بن کر اپنی زندگیاں قربان کرنے کا نیا معاہدہ کرتے۔ صبح سے رات تک وعظ و نصیحت اور بیعت کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک ایک شخص سے بیعت لینا مشکل تھا تو کئی کئی دستاریں کھول دی جاتی تھیں۔ لوگ دستار کو ہاتھ میں تھامتے اور بیعت کے الفاظ زبان سے ادا کرتے۔ روزانہ سترہ اٹھارہ مرتبہ یہ عمل ہوتا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ساٹھ ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔[1]

اس گرویدگی کا اثر یہ تھا کہ بنگال کے قحبہ خانے سونے پڑ گئے۔ شراب اور تاڑی کی دوکانیں بند ہو گئیں۔ ٹھیکیدار ٹھیکوں کی واپسی کے نوٹس دینے لگے۔[2]

ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر جو سیّد صاحب کو لٹیرا کہہ کر اُن کے پاک باز دامن پر دھبہ لگانا چاہتا ہے۔ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ:

"۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مرید اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے، اور صاحبِ جاہ اور علماء عام خدمت گاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد اُن کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظامِ حکومت کی ضرورت پیش آگئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرّر کئے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستہ میں پڑتا ہو، تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اُس کے بعد انہوں نے چار خلیفہ مقرّر کئے۔ یعنی رُوحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرّر کیا اور اُس کے لئے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا، جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر

---

[1] روزانہ ایک ہزار کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے۔ روز بروز یہ ہجوم بڑھتا رہا۔ بیعت ہونے والوں میں بنگال کے علاوہ آسام اور جاوا کے مسلمان بھی شامل تھے۔ (سیرت سیّد احمد شہید ص ۲۳۱)۔ [2] سیرت سیّد احمد شہید۔

Marfat.com

مقرر کرتے وقت فرمان جاری کیا کرتے تھے[1] - چار خلفاء یہ ہیں۔ مولانا ولایت علی صاحب، مولانا عنایت علی صاحب، مولانا محرم علی صاحب، مولانا فرحت حسین صاحب، قاضی القضاۃ شاہ محمد حسین صاحب۔

اس کے بعد ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انھوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں لوگوں کو سلسلۂ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اسی طرح ہجوم جمع ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لئے مشکل تھا۔ بالآخر اُن کو پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ ہر وہ شخص جو اُس کے کسی حصہ کو چھوئے گا، اُن کا مرید[2] ہو جائے گا۔

سلطان ٹیپو مرحوم کے پس ماندگان ٹیپو سلطان مرحوم کے اہل وعیال کلکتہ میں نظر بند تھے۔ سید صاحب کے خاندان سے اُن کا پُرانا تعلق تھا کیونکہ سلطان ٹیپو کے والد نواب حیدر علی بانی ریاست، سید صاحب کے نانا مولانا شاہ ابوسعید صاحب سے بیعت تھے، شاہزادوں اور بیگمات نے اس پُرانے تعلق میں نئے رشتہ کا پیوند لگایا۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء کو مدعو کیا۔ شاندار دعوت کی اور بیش بہا نذر پیش کی۔

کلکتہ سے روانگی اور واپسی حج بیت اللہ شریف ربیع الثانی ۱۲۳۷ھ کی آخری تاریخوں میں

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۳۔ مگر ہنٹر کو اس موقع پر کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ چار خلیفہ جاتے وقت نہیں بلکہ حج بیت اللہ شریف سے واپسی کے وقت مقرر کئے تھے۔ جاتے وقت تو قیام مختصر رہا کیونکہ کچھ لوگوں نے کلکٹر کو مشتعل کرنے کی کوشش کر دی تھی کہ یہ لوگ سرکار کے مخالف جہاد کیلئے تیاری کر رہے ہیں۔ کلکٹر نے اگرچہ بظاہر اس شکایت سے اثر نہیں لیا۔ تاہم سید صاحب نے زیادہ قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ (وقائع احمدی)

Marfat.com

قافلہ جہازوں پر سوار ہو کر جدّہ کی طرف روانہ ہوا۔ چار ماہ تک سمندر کی موجوں سے کھیلتے ہوئے جدّہ پہنچے اور ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ساڑھے پانچ مہینے اس سرزمین پاک میں قیام رہا۔ فریضۂ حج سے فراغت کے بعد ۱۵ صفر کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ۲۹ ربیع الاوّل کو آپ مدینہ منوّرہ سے رخصت ہوئے۔ مکہ معظمہ آکر قافلہ خیمہ زن ہوا۔ رمضان شریف گذرنے کے بعد ۵ شوال ۱۲۳۸ھ کو آپ روانہ ہوئے۔ بادبان جہازوں کے سینے قافلہ کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ چند ماہ سمندر میں زندگی گذار کر آپ ۱۲۳۹ھ کے شروع میں بمبئی پہنچے۔

بمبئی میں تشریف آوری اور قیام | جزیرہ بمبئی پرتگیزوں اور انگریزوں کا گہوارہ تھا۔ مگر پیشوایانِ مرہٹہ کی داستانِ الم بھی اسی گہوارہ کی آغوش میں چھپی ہوئی تھی۔ ہلکر اور امیر علی خاں کی جنگِ آزادی کے نعرے ابھی تک گونج رہے تھے۔ سیّد صاحب کے قدم جیسے ہی ساحلِ بمبئی پر پہنچے، بمبئی نے اپنی داستان سُنانی شروع کر دی۔ جنگِ آزادی کے پُرانے نعروں نے نئی تڑپ دل میں پیدا کی اور آپ نے بمبئی کو بھی دوسرا کلکتہ بنا دیا۔ اٹھارہ روز کے قیام میں ہزاروں آدمی بیعت سے مشرف ہوئے، اور آپ سے جنگِ آزادی کا سبق یاد کیا۔

سوانح نگاروں کے خیال میں یہ گرویدگی صرف اس لئے تھی کہ سیّد صاحب حج بیت اللہ شریف کے مقدّس سفر سے واپس آئے تھے مگر برطانوی امپیریلزم کے سیاسی مبصر کی شہادت یہ ہے:

> بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے، اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سُننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے، اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کر سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے، اُس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ پُر امن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دُور دراز جنگ جُو آبادی پر

Marfat.com

لگی رہتی تھی۔[1]

ہنٹر نے اس موقع پر اس بہتان کی بنیاد بھی رکھ دی ہے جس کا پراپیگنڈا کر کے انگریزی مشینری نے اس تحریک کو ناکام بنایا۔ وہ چند سطر پہلے کہتا ہے کہ :

سید احمد صاحب جب مکہ معظمہ میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ سید صاحب کے عقائد بھی اُن صحرائی بدّوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اُٹھانے پڑے۔ لہٰذا مکہ معظمہ میں ان کی علانیہ بے عزّتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جب ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبدالوہاب کے پکّے مرید تھے۔[2]

یہ الزام سراسر بہتان ہے اور قطعاً بے اصل۔ مکہ معظمہ میں اُن کی کوئی بے عزّتی نہیں کی گئی۔ البتہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے کچھ بدوؤں نے ان کے قافلہ کو لوٹنا چاہا تھا، مگر ان عربوں اور بدّوؤں نے جن کے اونٹوں پر قافلہ سفر کر رہا تھا، حملہ آور بدّوؤں کو سمجھا کر واپس کر دیا۔ نہ لوٹ مار ہوئی نہ کشت و خون۔[3]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صنہ ۹۰ از ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر۔ [2] ایضاً صہ ۸۹۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، سیرت سید احمد شہید، وقائع احمدی، مخزنِ احمد اور سوانح احمدی وغیرہ۔ ہنٹر کے اس غلط الزام کی کوئی توجیہ ضروری سمجھی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نیوتنوی کے واقعہ کو حضرت سید صاحب پر چسپاں کر دیا ہے اور وہ بھی رنگ آمیزی اور مبالغہ کے ساتھ۔ اس واقعہ کی حقیقت غلام رسول صاحب مہر کے الفاظ میں یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب بہت تیز مزاج تھے۔ وہ بعض مرّوجہ غیر شرعی مراسم کے ردّ و ابطال میں تیزی سے کام لیتے تھے، اور چونکہ چند سال ہوئے نجدیوں سے جنگ ہو چکی تھی، حجاز کے لوگوں میں انتہائی اشتعال تھا کہ بدعت کے ردّ میں اگر کوئی سختی سے کام لیتا تو اس کو بھی وہابی سمجھ لیا جاتا تھا۔ اس وہم کی بنا پر مولانا عبدالحق صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا عبدالحی صاحب نے ضمانت دے کر اُن کو چھڑایا، اور (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

فارسی کی مثال ہے "دروغ گو را حافظہ نہ باشد"۔ یہ مثال یہاں چسپاں ہو رہی ہے۔ ہنٹر کا خود اقرار ہے کہ:

۱۸۱۳ء اور ۱۸۲۳ء کے درمیان کوئی وہابی مکہ معظمہ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالے بغیر نہیں پھر سکتا تھا۔

پھر یہ کہنا کہ سید صاحب واپس ہوئے تو عبدالوہاب کے پکے مرید تھے، سراسر بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟ مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کو سید صاحب سے بھی ایسا بدظن اور مشتعل کر دیا جائے جیسے اُس زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب سے لوگ مشتعل تھے۔

ہزاروں پراپیگنڈوں اور غلط الزامات کے باوجود حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے، اور وہ مجبوراً زبان پر آجاتی ہے۔ چنانچہ ہنٹر بھی حقیقت کے اس قدرتی عمل کے سامنے مجبور ہے اور باوجودیکہ کتاب کا منشاء مسلمانوں کو اس تحریک سے بدظن کرنا تھا، اسی بنا پر سید صاحب کو ڈاکو، قزاق وغیرہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس اقرار پر بھی مجبور ہے کہ:

یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے۔ انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لئے نہیں لیا[1]۔ سید صاحب کی زندگانی کا درمیانی حصہ ایسا بھی تھا کہ جس میں اُن کا دل برادرانِ وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا تھا[2]۔ انہوں نے برادرانِ وطن کی عملی زندگی پر وعظ کہنا شروع کیا اور ہر قسم کی اصولی بحثوں سے پرہیز کیا۔ جس کے متعلق اُن کے دشمن تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے، اور اُن کے مریدوں کا یہ دعویٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقدمہ کی جواب دہی کے موقع پر بھی مولانا ہی تشریف لے گئے اور عدالت سے بات چیت کر کے اُن کو رہا کرایا۔ اس طرح مولوی عبدالحق صاحب رہا ہوئے۔ مکہ معظمہ تک سید صاحب کے ساتھ رہے۔ پھر صفا چلے گئے، اور قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لے کر ہندوستان آئے (سیرت سید احمد شہید ص۲۳۶ و ص۲۳۷ ج ۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] باب چہارم ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۰۶۔ [2] باب دوم ایضاً ص۶۷۔

> ہے کہ یہ اُن کی برتری اور بزرگی کی شان کے خلاف تھا[1] - ان کا سیاسی اور
> مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی اُمید و بیم کے عین مطابق ہے۔
> ان میں ہزارہا اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعی بہت بڑے متقی ہیں۔
> اور نفس کُشی کو اپنا فرضِ اوّلین تصوّر کرتے ہیں[2]۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز بات یہ ہے کہ ایک طرف سیّد صاحب کو عبدالوہّاب کا پکّا مرید بتاتا ہے، پھر دوسری طرف یہ الزام بھی کہ سیّد صاحب کو بارہ اماموں یا چھ اماموں میں سے ایک امام مانا جاتا تھا[3] وغیرہ - حالانکہ وہابیت اور عقیدہ امامت میں منافات اور تضاد ہے۔ اتنا تضاد کہ ہر ایک دوسرے کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیتا ہے۔

بمبئی سے کلکتہ اٹھارہ روز بمبئی میں قیام فرما کر آپ بحری راستہ سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں دو روز "الفی" (ایلپی) بندر پر قیام فرمایا۔ کلکتہ میں اس مرتبہ شیخ عبداللہ صاحب (خلف فخر التجار شیخ غلام حسین صاحب) پورے قافلہ کے میزبان تھے۔ چونکہ ایک جہاز جس کا نام عطیۃ الرحمٰن تھا، راستہ سے بھٹک کر پیچھے رہ گیا تھا اس کے انتظار میں تقریباً ایک ماہ قیام کرنا پڑا۔ یہ عرصہ سخت پریشانی کا گذرا۔ ساتھیوں کی جُدائی کا قلق، پھر طرح طرح کے وسوسے ہر وقت پریشان رکھتے تھے۔ دعائیں ہوتی تھیں اور وظیفے پڑھے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے جب ایک ماہ بعد یہ جہاز بخیریت پہنچ گیا، تب رائے بریلی کی طرف سفر شروع ہوا۔ مگر تیاری جہاد کا جذبہ اب پہلے سے کہیں زیادہ تھا، اور اب یہ سفر گویا میدانِ جنگ کی طرف تھا۔

---

[1] باب دوم ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۷۷ ۔ [2] تیسرا باب ایضاً ص۱۵۸ ۔ [3] ایضاً ص۷۸ باب ۲

مقامی حضرات

جنھوں نے دوسرے دورہ میں قافلہ کی خدمت کی

سیّد صاحب کا یہ قافلہ جس کے شرکاء ستّر سے شروع ہو کر آٹھ سو ہو گئے تھے جہاں جہاں پہنچا، وہاں اس کی میزبانی اور مدارات میں بہت سے حوصلہ مندوں نے حصّہ لیا، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن افسوس تاریخ ان سب کے نام محفوظ نہیں رکھ سکی۔ جو نام سوانح کی مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ذیل کے نقشہ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس نقشہ میں چند نام غیر مسلموں کے بھی ملیں گے۔ اس سے تحریک کے عمومی اثر اور اس زمانہ کے باہمی تعلّقات پہ ہلکی سی روشنی پڑے گی۔

مقام اور مدّتِ قیام	کارکنوں اور میزبانوں کے نام اور مختصر کیفیت
ڈلمئو۔ چار روز :	یہاں دو بھائیوں میں اس پر بحث چل رہی تھی کہ پہلے دعوت کون کرے سیّد صاحب کے سامنے یہ بحث شروع ہوئی تو آپ نے بڑے بھائی کے حق میں فیصلہ کیا کہ بڑے کا حق مقدّم ہے۔
موضع ڈھئی دھمدھمہ :	(ایک شب قیام رہا) شیخ مظہر علی صاحب نے قافلہ کی مدارات کی۔
موضع ڈگڈگی : (دن بھر)	شیخ محمد پناہ صاحب اور ان کے فرزند ارجمند شیخ محمد کفاء۔ صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملّاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہ آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دُور دُور تک ایسی خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی اس اثناء میں کالی گھٹا اُٹھی۔ تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہوئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گذرے گی۔ اچانک دُور سے مشعلیں نظر آئیں۔ مشعلوں والے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ تیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کی خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی

Marfat.com

ہیں اور خود گھوڑے پر سوار آیا ہے[1]۔

گتنہ۔ ایک دن : آصف خاں رسالدار کے مکان پر قیام ہوا۔

جہان آباد : یہاں گھاٹ پر تین روز کشتیاں رُکی رہیں۔ مہمان داری کا سارا انتظام شیخ برکت علی صاحب نے کیا۔ شیخ حسن علی کیما کے باشندے تھے جو جہان آباد کے گھاٹ سے تین کوس کے فاصلہ پر تھا روانگی کے وقت شیخ حسن علی صاحب اپنے چاروں بھائیوں اور مستورات کے ساتھ حج کے ارادہ سے ساتھ ہوئے۔

موضع اوجھنی ایک روز : شیخ لعل محمد صاحب زمیندار موضع اوجھنی نے دعوت کی۔[3]

موضع اسروٰلی ایک روز : شیخ محمد وزیر (شیخ لعل محمد صاحب کے خسر)

موضع چھپری ایک روز :

الہ آباد۔ بارہ روز : گھاٹ پر شیخ غلام علی رئیس۔ محمد تقی اور اُن کے بھائی۔ عبداللہ قصاب۔ شاہ اجمل صاحب کے فرزند شاہ ابوالمعالی۔ قلعہ الہ آباد کے داروغہ بستی میاں۔ رنجیت خاں میواتی۔ مولوی کرامت علی صدر امین۔ حافظ اکرام الدین دہلوی۔ حافظ نجابت علی سوداگر۔ محمد حسین۔ عبدالقادر شیخ سازنگ وغیرہ۔

مرزا پور۔ تین روز : شیخ عبداللطیف صاحب اور شیخ شاہ محمد۔ دونوں مشہور تاجر تھے اور شیخ عبداللطیف صاحب کے متعلق تو بیان کیا گیا ہے کہ مختلف شہروں میں اُن کی ستائیس تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ روانگی کے وقت چار ہزار روپیہ نقد پیش کئے اور اپنی والدہ کو ساتھ لے کر حج کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص۲۴۷ و ص۲۴۸۔ [2] سید احمد شہید۔ [3] یہاں سے چلے تو راستہ میں ایک انگریز کی مسلمان عورت نے دعوت کرنی چاہی۔ سید صاحب نے انکار کر دیا۔ پھر انگریز نے آکر اپنی طرف سے دعوت کی تو آپ نے منظور فرمالی۔ (سیرت سید احمد شہید ص۱۹۵)

Marfat.com

لئے ایک کشتی کرایہ کرلی۔ شیخ شاہ محمد صاحب نے پانچ سو روپیہ نقد، ایک جوڑی پستول۔ بیس تھان ململ۔ تینوں مشروع وغیرہ۔ اٹھارہ تھان گاڑھے کے قافلہ کی پوشاک کے لئے پیش کئے۔

چنار گڑھ تین روز: پانچ دعوتیں ہوئیں۔ ایک تمباکو کے تاجر کی طرف سے، دوسری چاولوں کی منڈی کے چودھری کی طرف سے، تیسری شہر کے چودھری کی طرف سے، چوتھی قلعہ کے سپاہیوں کی طرف سے، اور پانچویں قلعہ کے خلاصیوں کی طرف سے۔

بنارس: بارش کا زور تھا۔ پندرہ روز مسلسل بارش ہوتی رہی۔ مگر سلسلۂ تبلیغ و اصلاح برابر جاری رہا۔ اسی میں دعوتیں بھی ہوتی رہیں۔ ہزاروں آدمی بیعت سے مشرف ہوئے۔ خاص خاص نام یہ ہیں:

ایک ماہ عید الاضحیٰ سے پہلے پہنچے اور ۱۰ محرم الحرام ۱۲۳۷ھ کو روانہ ہوئے۔

شاہزادہ مرزا بلاقی[۱]۔ شاہزادہ مرزا حاجی۔ مولانا عبداللہ صاحب۔ میاں بھولا چابک سوار۔ میاں اللہ رکھو صاحب۔ میاں یار محمد صاحب۔ میاں دین محمد صاحب۔ میاں لعل محمد صاحب یارو۔ مرزا کریم اللہ بیگ صاحب۔ مولوی غلام یحییٰ صاحب۔ حکیم سلامت علی خاں صاحب۔ حیات النساء بیگم، اس خاتون نے چھ سات ہزار روپیہ کا مال پیش کیا۔ مگر چونکہ اس کا پہلے انگریزوں سے تعلق رہا تھا، اس لئے سید صاحب نے اس کا نذرانہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ خاتون رونے لگی کہ میں تو توبہ کر چکی ہوں، کیا میری توبہ قبول نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ مال ناپاک ہے۔ میں صرف مالِ حلال کے نذرانے لیتا ہوں۔ حکیم سلامت علی خاں صاحب اس بیگم کے مختارِ عام تھے۔

---

[۱] یہ اودھ کے شاہزادے ہیں۔ مرزا حاجی کچھ دنوں غازی الدین حیدر کے مقرب بھی رہے ہیں۔ (قیصر التواریخ ص ۱۲۸ و ص ۱۲۹ جلد ۱)۔

Marfat.com

زمانیہ۔ دو روز : سیّد صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب رستم علی خاں تھے۔ وہ اس زمانہ میں ٹونک گئے ہوئے تھے۔ اُن کا بیٹا آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کے بہت سے پٹھانوں نے بیعت کی۔ قریب کے جنگل میں ایک مجذوب رہتا تھا اگر کوئی شخص اس کے پاس جاتا تھا تو پتھروں سے خبر لیتا تھا۔ سیّد صاحب تنہا اس کے پاس گئے۔ ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مجذوب نے سیّد صاحب کو دیکھا تو بڑی خوش الحانی سے حافظ کی غزل پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب
کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

پوری غزل کیف و مستی کی حالت میں پڑھی۔ پھر خواجہ حافظ کی اور غزلیں سنائیں۔ آخر میں دریافت کیا کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ سیّد صاحب نے بتایا کہ "حرمین شریفین"۔ مجذوب بولا۔ کیا بیت المقدس بغداد، نجف اور کربلا بھی جاؤ گے؟ سیّد صاحب نے فرمایا "ایک ضروری کام درپیش ہے۔ بعد ادائے حج اس کی تدبیر کرنی ہے، اس لئے اور کہیں جانے کا ارادہ نہیں"۔

غازی پور۔ تین روز شاہ منصور عالم صاحب رئیس غازی پور، شیخ غلام ضامن قاضی محمد حسن صاحب۔ تیغ علی خاں صاحب۔ ان سب حضرات نے دعوتیں کیں اور اہل و عیال سمیت بیعت سے بھی مشرف ہوئے۔ غازی پور کے ایک دوسرے رئیس شیخ فرزند علی صاحب، سیّد صاحب کے مخلص اور جان نثار دوست تھے۔ اتّفاق سے وہ یہاں تشریف نہ رکھتے تھے۔ متاجری کے کام پر گئے ہوئے تھے۔ البتہ آپ کے مختار مرزا محی الدین بیگ کشمیری یہاں مقیم تھے۔ میزبانی کے تمام فرائض مختار صاحب نے اپنے رئیس کی طرف سے انجام دیئے۔

Marfat.com

بارڈا۔ایک روز : یہ گاؤں انہیں شیخ فرزند علی صاحب کا خریدا ہوا تھا۔یہاں شیخ صاحب کے فرزند ارجمند محمد امیر صاحب قیام فرماتھے۔آپ ہی نے سید صاحب کے فرائضِ ضیافت انجام دیئے۔پھر گاؤں کے تمام چھوٹے بڑوں کے ساتھ شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے۔سیّد صاحب نے تیغ علی خاں اور سردار خاں کو خلافت نامے عطا کئے۔

موضع بلیا (ایک روز) : یہ گاؤں بھی شیخ فرزند علی صاحب کا تھا۔یہاں بھی شیخ صاحب کی طرف سے فرائضِ مہمان داری انجام دیئے گئے۔شیخ فرزند علی صاحب کے قابلِ قدر نذرانوں کا تذکرہ انشاء اللہ آگے آئے گا۔یہ بات قابلِ تذکرہ ہے، کہ تحریکِ کانگریس کے مشہور رہنما ڈاکٹر سیّد محمود صاحب وزیر امورِ خارجہ حکومتِ ہند انہیں شیخ فرزند علی صاحب کے پوتے ہیں۔

بکسر : قاضی بکسر نے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر حق میزبانی ادا کیا، اور بہت سے لوگ بیعت سے مشرف ہوئے۔

چھپرہ۔ایک روز : فرحت علی صاحب۔

داناپور اور موضع ڈنکھا۔ایک ہفتہ : شیخ علی جان جو یہاں کے بہت بڑے دولت مند تھے، وہ آپ کو اپنے موضع ڈنکھا بھی لے گئے۔جب سیّد صاحب جہاد کو تشریف لے گئے تو اطرافِ بہار کے عقیدتمندوں کی امدادی رقمیں انہی شیخ علی جان صاحب کے پاس جمع ہوتی تھیں۔ان کے نام سیّد صاحب کے متعدد مکتوب بھی ہیں۔شیخ صاحب کے علاوہ داناپور کے مشہور اہلِ خیر صدرالدین قصاب بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

عظیم آباد۔پٹنہ آٹھ روز : مولانا سید منظر علی صاحب۔مولانا الٰہی بخش صاحب صادق پوری۔لکھی میاں رئیس۔مولانا فتح علی صاحب۔شاہ محمد حسین صاحب نمو ھیہ۔خواجہ قمر الدین کشمیری۔نواب زادہ قطب الدین صاحب۔

Marfat.com

آپ نے ہدیہ میں بہت سے بہترین اور اعلیٰ قسم کے کپڑے۔ ایک پرانی اور نہایت قیمتی گجراتی تلوار۔ ایک انگریزی پستول۔ ایک بندوق دو کمانیں۔ دو ترکش اور مبلغ پانچ سو روپیہ نقد پیش کئے۔ رحیم خاں افغان تاجر چرم۔ امیر خاں (برادر زادہ و داماد رحیم خاں صاحب) عبدالرحمٰن صاحب تاجر۔ ان تاجروں نے کپڑوں کے تھان بھی پیش کئے اور نقد رقم بھی نذر گذرانی۔ یہ سب حضرات مع اہل و عیال بیعت ہوئے۔ ان کے علاوہ ہزاروں نے بیعت کی۔

باڑھ۔ ۲ روز : یہاں ارد گرد کی بستیوں سے بہت سے آدمی آئے ہوئے تھے۔ جن میں خواجہ مولا بخش صاحب۔ خواجہ افضل علی۔ "شیخ سُوپن"۔ واجد علی صاحب۔ اکرام الحق صاحب۔ شاہ گھسیٹا صاحب۔ یہ بہت با اثر اور بارسوخ تھے۔ خلافت نامہ انہیں کو دیا گیا۔

راج محل ۲ روز : منشی محمدی انصاری صاحب، سید صاحب کے ایک خاص اور مخلص مرید تھے۔ اُن کا وطن راج محل سے دس بارہ کوس تھا۔ یہ منشی صاحب، سید صاحب کو اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں مع اہل و عیال بیعت کی۔ آپ کے تمام اقارب بھی سلسلۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ منشی شاہ محمد صاحب۔ (فرزند منشی شیخ محمدی انصاری)۔ منشی رؤف الدین صاحب۔ منشی مخدوم بخش صاحب۔ منشی حسن علی صاحب۔ منشی فضل الرحمٰن صاحب۔ منشی عزیز الرحمٰن صاحب۔

کلکتہ۔ دو ماہ : منشی امین الدین صاحب۔ شیخ رمضانی صاحب۔ شیخ امام بخش صاحب تاجر۔ قادر بخش صاحب لکھنوی۔ سعید الدین صاحب نانفدا۔ منشی حسن علی صاحب۔ شیخ غلام حسین صاحب فخر التجار۔

Marfat.com

عبداللہ صاحب خلف شیخ غلام حسین صاحب۔

حج سے واپس ہو کر رائے بریلی پہنچنے تک قافلہ نے جہاں جہاں قیام کیا۔ اُن کے نام اور مختصر کیفیت درجِ ذیل ہے۔

نام مقام و مدّتِ قیام	کیفیت
بمبئی محلہ میمن واڑہ ۱۸ روز	مندرجہ ذیل حضرات نے خدمت میں نمایاں حصّہ لیا۔ مولانا محمد انس صاحب اُن کے صاحبزادے مولانا محمد صدّیق صاحب۔ امام الدّین صاحب۔ محمدّی صاحب۔ شیخ بڈھن۔ شیخ بڈھن صاحب قافلہ میں شریک ہو گئے۔
کلکتہ۔ دو ماہ	شیخ عبداللہ صاحب (مذکورہ بالا) اور شیخ عنایت اللہ صاحب۔
منگل کوٹ۔ ایک روز	منشی محمدّی۔
کھنہ ضلع مرشد آباد چند روز	دیوان غلام مرتضیٰ صاحب۔ روانگی کے وقت دیوان صاحب نے نقد رقم کے ساتھ سات عمدہ طمنچے اور ایک رومی بندوق پیش کی جس میں سات دیدبان تھے۔ ہر دیدبان سے دو سو قدم فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ ساتویں دیدبان پر چودہ سو قدم کے فاصلہ پر یہ بندوق کام کر سکتی تھی۔ دیوان صاحب نے نئی بات یہ کی کہ دوکانداروں سے کہہ دیا کہ قافلہ کے حضرات جو کچھ خریدیں، اُس کا بِل ہمارے خزانہ سے وصول کیا جائے۔ مگر اہلِ قافلہ کے جذبات کی دنیا ہی بدل چکی تھی جو شاہانہ تکلّفات چھوڑ کر سوکھی روٹی کے عادی ہو چکے تھے، وہ تکلّفات کی چیزیں کیا خریدتے۔ چنانچہ دیوان صاحب کو ایک بِل بھی ادا نہیں کرنا پڑا۔
مونگیر۔ چند روز	اسلحہ سازوں سے بندوقیں اور طمنچے خریدے۔
قصبہ باڑہ۔ چند روز	مولانا ولایت علی صاحب۔ شاہ محمد حسین صاحب۔ سیّد کرامت اللہ صاحب۔ سیّد عبدالرحمٰن صاحب۔ طالب حسین صاحب۔ محمد حیات صاحب

Marfat.com

نے فرائض میزبانی انجام دیئے۔ پھر یہ سب قافلہ میں شریک ہوگئے۔

پھلواری شریف : (ایک روز) حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب۔ مولانا احمدی صاحب۔

محمد آباد یوسف پور چند روز : یہ وہی یوسف پور محمد آباد ہے جس کی خاک پاک سے تقریباً پچاس سال بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب جیسے نوجوان پیدا ہوئے جنہوں نے بیسویں صدی میں تحریکِ آزادیٔ ہند میں عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ یہاں ایک خاص واقعہ قابلِ یادگار ہے۔ قافلہ محمد آباد میں ٹھہرا ہوا تھا کہ سید صاحب تن تنہا ایک گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ساتھیوں نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے تو آپ نے فرمایا۔ "بوئے دوست مے آید"۔ دوست کی خوشبو آرہی ہے یہ دوست قاضی فرزند علی تھے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ یہ علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ جب دوست سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ایک لاکھ روپیہ اور ایک عمدہ گھوڑی پیش کی۔ پھر ایک بیٹا بھی قافلہ کے لئے نذر کردیا جس کا نام سید محمد امجد تھا۔ آپ نے بڑے فخر اور ناز سے اپنے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ دیکھا تم نے میرے دوست کو۔

جذبات کی یہی ہم آہنگی تھی کہ اُس نے قاضی صاحب کی اولاد کو اسی رنگ میں رنگ دیا، اور اُن کے پوتے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی نشو ونما بھی جذبۂ حریت کی سرمستی کے ساتھ ہوئی۔

بنارس۔ چند روز : مرزا محمود بخت اور مرزا بلاقی جو اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، خاص طور پر قافلہ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔

مرزا پور۔ ایک روز : یہاں شیخ عبداللطیف صاحب نے فرائضِ میزبانی انجام دیئے جو قافلہ کے ساتھی بھی بن گئے تھے۔ اور یہ شیخ غلام حسین صاحب رئیس، الہ آباد

Marfat.com

کے صاحبزادے بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔ مرزا پور سے الہ آباد تک قافلہ کی تمام ضروریات انہیں صاحبزادے صاحب نے اپنے خرچ سے فراہم کیں۔

مہرونداوایلادگنج : الہ آباد سے آپ غلام حسین صاحب کے گاؤں مہروندا تشریف لے گئے وہاں ایک رات ٹھہرے۔ پھر ایلاد گنج میں قیام فرمایا۔ مصطفےٰ آباد وغیرہ سے بھی گذرے۔ اس سفر میں طالب علی عظیم آبادی نے گھوڑے کی رکاب تھام رکھی تھی۔ سوءِ اتّفاق اُن کے پاؤں میں لیمو یا کھٹے کا کانٹا چُبھ گیا۔ ایک رفیق نے اپنی سواری کا گھوڑا ان کی خدمت میں پیش کیا کہ آرام سے منزل کٹ جائے۔ لیکن وہ بولے، کوئی صاحب تختِ رواں بھی دیں تو قبول نہ کروں گا۔

زراہِ عشق اگر در پا خلد خارے ۔۔۔ نباید از خلش پرہیز کردن
کہ از خارش بسے گلہا شگوفد ۔۔۔ قدم برخار باید تیز کردن

واپسی مختصر یہ کہ دو سال دس ماہ بعد ۲۹ شعبان المعظم ۱۲۳۹ھ، ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو آپ اپنے وطن عزیز میں نزول فرما ہوئے۔

بیت المال جب قافلہ وطن سے روانہ ہو رہا تھا تو خزانہ خالی اور صرف خدا کے بھروسہ خزانہ پر بھروسہ تھا۔ اس اعتماد اور بھروسہ کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سال دس ماہ تک شاہانہ فراخ حوصلگی سے پورے قافلہ کے مصارف، کافی تعداد میں اسلحہ، اور نہ صرف اپنے اعزہ اور اقارب بلکہ ساتھیوں کے اعزّہ و اقارب کے لئے بھی تحفے اور ہدیے خریدنے کے بعد، جب رائے بریلی پہنچ کر جائزہ لیا گیا تو بیت المال میں دس ہزار روپے نقد موجود تھے۔

اصلاح و تربیت

حج ایک مقدس فرض ہے اور اس کی ادائیگی ایک مقدّس مقصود۔ مگر جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا، اس دورہ کا مقصد صرف ادائے حج نہیں تھا، بلکہ وہ انقلابی تحریک جس کا نصب العین بانیٔ تحریک (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب) **"فك كل نظام"** معین کر چکے تھے۔ جس کی تعلیم و تبلیغ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اپنی سیاسی تربیت گاہ

میں پچاس سال سے کر رہے تھے۔ یہ دورہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور اسی زنجیر کا ایک حلقہ تھا۔ اس قافلہ کے آٹھ سو ساتھی صرف حاجی ہی نہیں تھے بلکہ وہ مجاہدین انقلاب تھے جو اپنے نفوس کو ہمہ گیر انقلاب کے لئے تیار کر رہے تھے۔ یہ اپنی کایا پلٹ چکے تھے اور جن کے یہاں پہنچتے تھے، اُن کی کایا پلٹ دیتے تھے۔ یہ سیاسی انقلاب کو دامن، اور اخلاقی وسماجی انقلاب کو چولی سمجھتے تھے۔

یہ سیاسی اقتدار کے بُھوکے نہیں تھے۔ بلکہ مُلک کے گوشہ گوشہ میں تقریباً سو سال سے سیاسی اور فوجی انقلاب ہو رہے تھے، یہ خود اُن سیاسی انقلابوں کے خالق اور فوجی معرکوں کے مردِ میدان رہ چکے تھے مگر وہ ان سب خون ریز تماشوں سے اُکتا کر یہی طے کر چکے تھے کہ اصل انقلاب سماجی انقلاب ہے۔ اس کے بغیر نہ "فک کل نظام" کا نصب العین کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ ملک اور قوم کو دوسروں کی غلامی سے مکمّل نجات مل سکتی ہے۔

ان کو اس سے انکار نہیں تھا کہ شمشیر زنی بھی جہاد ہوا کرتا ہے مگر اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ تلوار بندوق کی لڑائی اسی وقت جہاد ہوتی ہے جب مجاہدین کی نیّت درست، اُن کے اخلاق بلند اور اُن کے مقاصد اعلیٰ ہوں۔ وہ اخلاقی لحاظ سے تربیت یافتہ اور سماجی نقطہ نظر سے اصلاح پذیر ہوں۔

وہ خوب سمجھتے تھے کہ قرآن حکیم نے جہاد بالسیف سے پہلے خود اپنی اور اپنے سماج کی اصلاح کو نہ صرف فرض بلکہ "جہادِ کبیر" فرمایا ہے جاھدھم بہ جھادا کبیرا۔ (فرقان)

عام طور پر جہاد کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ دوسروں کو فنا کر دینا۔ مگر یہ مجاہدین پاک باز و پاک نفس اس حقیقت کو پہچان چکے تھے کہ اسلام نے جس جہاد کو افضل ترین عبادت قرار دیا ہے وہ خود اپنے کو فنا کر دینے کا نام ہے۔ یعنی مجاہد وہ ہے جو انانیت کو ختم کر دے، اپنی شخصیت کو اس طرح مٹا دے کہ خود بینی و خود پرستی کا کہیں ادنیٰ شمہ بھی باقی نہ رہے۔

نیشنلزم جو آج کی سیاسی اخلاقیات میں متقدس جذبہ قرار دیا جاتا ہے، یہ بزرگ

Marfat.com

اس کو بھی ملوکیت اور اقتدار پسندی کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس میں اپنی ذات نہ سہی اپنی قوم اور اپنی نیشن کی برتری کا تصور سامنے رہتا ہے، اور اپنا خاندان نہ سہی اپنی وطنی برادری کو مخلوقِ خدا کے سینوں پر سوار کرنے کی ہوس کار فرما ہوتی ہے۔ جو لا محالہ امنِ عالم کو ختم کرتی ہے اور قومیت کے نام پر فتنہ و فساد کا جہنم دہکاتی ہے، جس کو اسلام جاہلانہ عصبیت قرار دیتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون عُلُوًّا في الارض ولا فسادًا۔

یعنی وہ دارِ آخرت جو مقدس ترین مقصد ہے، خالقِ کائنات نے اُس کو ان کا حصہ قرار دیا ہے جو دنیا میں اقتدار پرستی اور قومی برتری کو نصب العین نہیں بناتے اور فساد پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

اس جہادِ کبیر اور سماجی اصلاح کی چند مثالیں پہلے دورہ کے مختصر حالات کے بعد ہم تحریر کر چکے ہیں۔ اس دورہ میں جو اصلاحات کی گئیں اُن کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

خدمتِ خلق | جب قافلہ مرزا پور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کشتی لنگر انداز ہے اُس پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی ہیں۔ مالک اُن کو اُتروانا چاہتا ہے مگر مزدور نہیں مل رہے قافلہ کے ساتھیوں کو مالک کی پریشانی کا احساس ہوا۔ وہ کشتی کی طرف بڑھے اور روئی کی تمام گانٹھیں اُتار کر گودام پر پہنچا دیں۔ مالک بھی حیران تھا، اور شہر والے بھی تعجب کر رہے تھے کہ یہ فرشتے کہاں سے آگئے کہ پہلے سے کوئی جان پہچان نہیں۔ شریف صورت، اُجلی پوشاک اور مزدوروں کا کام محض اللہ واسطے کر رہے ہیں۔

مساوات | اسی مرزا پور کا ذکر ہے کہ وہاں سات گھر اینٹ پکانے والوں کے تھے۔ چونکہ وہ اینٹیں پہنچانے کے لئے گدھے بھی رکھتے تھے اس لئے گدھے والوں کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ شہر کے وہ خاندان جو شرفاء کہلاتے تھے، ان کو ذلیل اور کمین سمجھتے تھے، اور یہ تو بہت ہی بڑی عار کی بات سمجھی جاتی تھی کہ اُن کے یہاں جا کر کچھ کھایا پیا جائے۔

Marfat.com

ان غریب گدھے والوں کو بھی شوق ہوا کہ سید صاحب اور آپ کے قافلہ والوں کی دعوت کریں۔ اوّل تو انہیں عرض کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور جب ہمت کرکے یہ درخواست پیش کی تو قافلہ کے میزبانوں نے سختی سے مسترد کرا دینا چاہا۔ مگر میزبانوں اور شہر کے تمام ہی لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جب سید صاحب نے خندہ پیشانی سے اُن کی دعوت قبول فرمائی۔ بڑے شوق سے اُن کے محلّہ میں گئے اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی دعوت تناول کی۔ دعوت کے بعد اُن لوگوں نے ایک طشت میں چار سو روپیہ نقد اور دوسرے طشتوں میں کمخواب، گلبدن وغیرہ اعلیٰ قسم کے چند تھان پیش کئے۔ سید صاحب نے اس ہدیہ کے قبول کرنے سے معذرت فرمادی، اور فرمایا کہ اگر آپ کا ہدیہ قبول کر لیا گیا تو شہر والے سمجھیں گے کہ اس ہدیہ کے لالچ میں دعوت کھائی تھی۔ اس طرح اصلاح کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

بنارس بنارس میں چمار ذات کا ایک شخص تھا۔ "تلوکا" نام۔ غریب آدمی تھا۔ ایک چھوٹے سے چبوترے پر جھونپڑی ڈال رکھی تھی۔ اسی میں وہ اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب اور بھولا چابک سوار سے اس کا یارانہ تھا۔ سید صاحب جب قافلہ لے کر نئے انداز سے بنارس پہنچے۔ پورے شہر میں اس کا چرچا پھیلا اور لوگوں نے بڑے شوق سے خاطر مدارات اور دعوتیں کیں تو اس غریب چمار کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوئی۔ مگر دل مسوس کر رہ گیا کہ غریب چمار کے گھر یہ وقت کا بادشاہ کیسے آئے گا اور کون اُس کو آنے دے گا۔ جب اس کے دوست مولوی عبداللہ اور بھولا چابک سوار بیعت ہو گئے، اور حضرت سید صاحب کی تعریف شروع کی غریب "تلوکا" کے دل کی حسرت سوا ہونے لگی۔ ان دونوں دوستوں نے اطمینان دلایا کہ اگر تم بُلانا چاہو گے تو سید صاحب ضرور تمہاری اس جھونپڑی میں آئیں گے۔ تلوکا کو اور کیا چاہیئے تھا۔ اُس نے بڑے شوق سے درخواست پیش کی۔ ان حضرات نے اس پس ماندہ مایوس کی درخواست حضرت سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ سید صاحب فوراً آمادہ ہو گئے۔ اس کی جھونپڑی پر پہنچے۔ یہ پھٹی دھوتی اور میلا کچیلا پھٹا ہوا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ یہ اسی حالت میں سید صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ سید صاحب

Marfat.com

اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے اور اس کے ساتھ بے تکلّف بات چیت شروع کر دی۔ اس نے سات پیسے نذر میں پیش کئے۔ آپ نے بڑی خوشی سے وہ قبول فرمائے اور ساتھیوں کو دے کر ہدایت فرمائی کہ یہ تحفہ محفوظ رکھا جائے۔ اس سادگی اور بے تکلّف محبّت کا نتیجہ ظاہر تھا وہ اور اُس کے کنبہ کے بیس پچیس گھر سیّد صاحب کے جان نثار بن گئے اور مسلمان ہو کر سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔[1]

کلکتہ کلکتہ میں ایک پیرزادہ صاحب نے دعوت کی اور راستہ میں پگڑیاں بچھا دیں کہ سیّد صاحب اُن پر گذر کر تشریف لائیں۔ سیّد صاحب نے تمام پگڑیاں اُٹھوا دیں اور فرمایا کہ کپڑا پہننے کے لئے ہے، پامال کرنے کے لئے نہیں۔[2]

کلکتے سے گیارہ جہاز کرایہ پر لئے گئے۔ اُن میں ایک بہت بڑا جنگی جہاز تھا۔ اُس کا نام "عطیۃ الرحمٰن" تھا۔ ساٹھ توپیں اس پر چڑھی رہتی تھیں۔ اس کا ناخدا محمد حسین ترک چالیس جہازوں کا کپتان تھا۔ سیّد صاحب کے جاں نثار خاص فخر التجار غلام حسین صاحب نے تجویز پیش کی کہ سیّد صاحب اس جہاز پر سوار ہوں۔ جب آپ عرب پہنچیں گے، تو وہاں کے لوگ بڑی عزّت کریں گے۔

یہ سُن کر سیّد صاحب کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو گیا۔ فرمایا عزّت اور ذلّت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ نمائشی عزّت ہمیں درکار نہیں۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اچھے اچھے جہازوں پر سوار کرایا، اور خود ایک بوسیدہ جہاز پر سوار ہوئے جس کا نام "دریا بقی" تھا اور جس کے متعلق مشہور تھا کہ بہت کم چلتا ہے۔[3]

اسی سادگی اور مساوات پسندی کا تقاضا تھا کہ آپ نے کلکتہ میں شیخ محمد امین صاحب کو ہدایت کر دی تھی کہ صرف ایک قسم کا کھانا تیار کرایا کریں اور متعدد قسم کے پُر تکلّف کھانے جو روزانہ پیش کئے جاتے ہیں بند کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔

کلکتہ کے حوصلہ مند اہلِ خیر نے قافلہ والوں کے لئے کئی کئی جوڑوں، اور کئی کئی

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید ص۲۰۷۔ [2] ایضاً ۲۴۸۔ [3] ایضاً ص۲۵۵

احراموں کے لئے تھان خریدے - آپ کو معلوم ہوا، تو آپ نے صرف دو دو احرام منظور کئے (یعنی دو دو لنگیاں اور دو دو چادریں فی کس) باقی سب واپس کر دیئے کہ ضرورت کے لئے یہ کافی ہیں - آئندہ جب ضرورت ہوگی، خدا خود انتظام کر دے گا - ابھی سے بوجھ لادنا حماقت ہے۔

دوسرے دورہ کے سلسلہ میں سب سے نمایاں اصلاح یہ ہے کہ تعزیہ داری بند کرائی - وہ چبوترے جو تعزیہ رکھنے کے لئے تقریباً ہر ایک حویلی میں ہوا کرتے تھے اور مسجد کی طرح اُن کا احترام کیا جاتا تھا، اُن کو خود مالکوں کی مرضی سے توڑ وا دیا تعزیوں کے کھپچیوں کا ایندھن بنا کر قافلہ کا کھانا تیار کرایا - اسی طرح قبر پرستی وغیرہ کا انسداد کیا کیونکہ اوہام پرستی کی ان رسومات نے مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا کر دی تھی، وہ حقائق سے ناآشنا ہو گئے تھے اور اقتصادی لحاظ سے بھی یہ رسومات تباہ کن تھیں۔

بیعت ہونے والوں میں بڑی تعداد اُن عیش پسندوں کی تھی جن کی زندگیاں جام و سبو کی دلچسپیوں اور کاکل و رخسار کی دلآویزیوں میں گذری تھیں شیخ امین الدین صاحب کلکتہ والے اور شیخ غلام علی صاحب الہ آبادی جیسے مخلص جاں نثار جن کی نظیر اخلاص اور فدائیت کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے، بیعت کے وقت تک رقص و سرود کے دلدادہ اور ہر قسم کی عیش پرستی کے عادی تھے، ایسے بااثر لوگوں کی توبہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں یہ قافلہ پہنچا وہاں کے زمین و آسمان بدل گئے۔ کلکتہ میں زیادہ عرصہ قیام رہا تو تاڑی فروشوں کا دیوالہ نکل گیا اور ٹھیکیدار ٹھیکوں کی منسوخی کی کوشش کرنے لگے - یہ تھا سماجی انقلاب جس کے بغیر "فک کل نظام" کا نصب العین کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

عدم تشدد اصلاح و تربیت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ سختی اور بدخلقی سے کام نہ لیا جائے نرم گفتگو اور ضبط و تحمل کو کامیابی کا ذریعہ بنایا جائے۔ کچھ آدمیوں کو تبت کے علاقہ میں بھیجا، تو اُن کو ہدایت کر دی کہ تم کو کوئی لکڑی، پتھر، لات گھونسا کتنا ہی مارے تم اس پر صبر کرنا اور اُن کو کچھ نہ کہنا۔ (سیرت سید احمد شہید ص۲۱۹)

آسام اور بنگال میں کام کرنے کے لئے جن کو متعین کیا، اُن کو بھی یہی ہدایت کی:

"اور جو تم کو مارے کُوٹے، رنج و ایذا دے، صبر کرنا اور وعظ و نصیحت سے باز نہ رہنا"[۱]

سرزمینِ حجاز میں بدّو اور ڈاکو ہم معنیٰ لفظ بن گئے تھے۔ حاجیوں کے قافلے پر ڈاکے ڈالنا معمولی کام تھا۔ مکّہ معظمہ سے مدینہ منوّرہ تک آنے جانے میں ڈاکوؤں کا خطرہ ایک یقینی بات تھی۔ اس لئے حاجی بھی مسلّح ہو کر یہ سفر کیا کرتے تھے۔ آپ کی داد و دہش اور تقریباً آٹھ سو نفر کی تنہا ذمّہ داری نے آپ کے متعلق یقین دلا دیا تھا کہ دولت کے خزانے آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس لئے آپ کے قافلہ پر ڈاکوؤں کا حملہ اتنا ہی یقینی تھا جیسے رات کے بعد دن کا آنا اور آفتاب کا روشن ہونا۔ مگر آپ نے اس یقینی خطرہ کے باوجود ساتھیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ کسی قسم کا کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھیں اور بالکل ننگے ہاتھ مدینہ طیّبہ کے لئے روانہ ہوں۔ چنانچہ یہ قافلہ ایسا تھا جس میں کسی ایک کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

دیانت داری اور امانت دیانت داری اور امانت اخلاقیات میں اصل اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قافلہ کا ہر ایک فرد دیانت و امانت کا پیکر بن گیا تھا! اسی دیانت کا تقاضا تھا کہ قیامِ کلکتہ کے زمانہ میں شیخ امین الدّین کے باغیچہ میں ہر قسم کے میوے بکثرت تھے اور پورا باغیچہ ان بزرگوں کی راحت رسانی کے لئے وقف تھا۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ کسی پھل یا پھول کا توڑنا تو درکنار، گرے ہوئے پھل بھی کوئی نہیں اُٹھاتا تھا۔ تمام پھل جمع کر کے سیّد صاحب کے یہاں پہنچوا دیئے جاتے تھے اور سیّد صاحب ان کو قافلہ والوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک طرف یہ دیانت داری کی بہترین مثال تھی، دوسری جانب نظم و نسق کا سبق اس سے ملتا تھا۔

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کھنہ ضلع مرشد آباد میں دیوان غلام مرتضیٰ صاحب نے بازار کی تمام چیزیں اہلِ قافلہ کے لئے وقف کر دی تھیں لیکن آپ نے ترکِ دنیا

---

[۱] سیرت سیّد احمد شہید ص۲۴۳

ہر خواہشات کا بھی یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھا کہ قافلہ کے ایک متنفس نے بھی بازار کی کسی چیز کا رُخ نہیں کیا۔

بے شک اس طویل سفر کے بعد ضرورت تھی کہ دوست احباب کے لئے کچھ ہدیے فراہم کر لئے جاتے اور اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا تھا کہ بازار کھلا ہوا ہے اور وہاں کی ہر چیز آپ کے لئے وقف ہے مگر ضبطِ نفس، دیانت و امانت کی یہ بلندی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ ہر ایک ہوس کا خون کیا جا رہا ہے اور اپنے میزبان پر اپنی طرف سے معمولی بار بھی برداشت نہیں کیا جا رہا۔

رہنمایانِ تحریک کے ذاتی اوصاف

مقاصد تربیت کے عملی نمونے

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) کی تربیت گاہ کا ذکر کرتے ہوئے ہم مقاصد تربیت بیان کر چکے ہیں۔ پہلے اور دوسرے دورہ کے حالات اور اصلاحی کارگذاریوں سے تربیت کے نتائج و اثرات کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے رہنما اور رضا کاروں کے بھی کچھ حالات بیان کر دیئے جائیں تاکہ تربیت کے نتائج پر دوسرے عنوان سے بھی نظر پڑ جائے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ شرکاءِ قافلہ جو اجتماعی حیثیت سے دوسروں کی اصلاح کر رہے تھے وہ شخصی اور انفرادی طور پر کہاں تک یہ اصلاح قبول کر چکے تھے اور کہاں تک اس رنگ میں رنگ چکے تھے۔

ذاتی اور شخصی رجحانات معلوم ہونے کے بعد یہ فیصلہ بھی آسانی سے کیا جا سکے گا کہ ان حضرات نے جو جہاد کیا، اس کا مقصد کیا تھا؟

Marfat.com

حضرت سیّد احمد صاحب شہیدؒ

سیّد صاحب جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ پورا خاندان خداترسی، پاک بازی، اور خدمتِ خلق میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہی اوصاف تھے جن کی بنا پر اس خاندان کی خانقاہ جو تکیہ شاہ علم اللہ[۱] کے نام سے مشہور تھی، پورے اودھ کا علمی اور روحانی مرکز بن گئی تھی۔

۱؎ حضرت شاہ سیّد علم اللہ صاحب ۱۲ ربیع الاوّل ۱۰۳۳ھ دوشنبہ کے روز قصبہ نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا تقریباً ڈھائی مہینے پہلے اور والدہ ماجدہ کا دو تین سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ کے ماموں سیّد ابو محمد، شاہجہاں بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ آپ ہی نے اس یتیم بھانجے کی پرورش کی۔ شاہ علم اللہ صاحب نے تعلیم اپنے چچازاد بھائی دیوان خواجہ احمد صاحب سے حاصل کی۔ جوان ہوئے تو ماموں نے ملازمت کی کوشش کے لئے لشکر میں طلب کر لیا۔ لیکن آپ ملازمت سے پہلے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر خدا طلبی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ اسباب امارت کو وقف عام کر دیا تھا اور دو سال لشکرگاہ میں ٹھہر کر نفس کی تہذیب و تربیت کے لئے خدماتِ شاقہ انجام دیتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفۂ اعظم حضرت سیّد آدم بنوری کا آفتابِ ہدایت و ارشاد پورے عروج پر تھا۔ حضرت شاہ علم اللہ صاحب، حضرت سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور تھوڑی مدّت میں اس راہ کی تمام منزلیں طے کرلیں۔ حضرت سیّد آدمؒ نے اپنا عمامہ اور حضرت مجددؒ صاحب کی دستار مبارک عنایت فرمائی اور وطن کی طرف رخصت کر دیا۔ شاہ صاحب نے رخصت ہوتے وقت عرض کیا کہ اودھ میں بہت سے علماء اور فضلاء اور مشائخ موجود ہیں میری ان میں کیا حیثیت ہوگی۔ حضرت سیّد آدم صاحب نے کچھ دیر مراقبہ کر کے فرمایا۔ جیسے چراغوں میں شمع کی۔ پھر کچھ دیر مراقبہ کے بعد فرمایا۔ جیسے تاروں میں آفتاب کی۔ جب حضرت سیّد آدم بنوریؒ حج کو جانے لگے تو آپ بھی شیخ کی رفاقت میں حج کے لئے تیار ہوگئے۔ حضرت سیّد آدم نے اجازت دی مگر یہ بھی فرمادیا کہ کوئی مردِ خدا تم کو کہیں روکے تو ٹھہر جانا۔ شاہ علم اللہ صاحب اہل و عیال کو لے کر سفر حجاز کی نیّت سے نصیر آباد سے رائے بریلی آئے تو یہاں ایک خدارسیدہ بزرگ شاہ عبدالشکور صاحب مجذوب نے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

آپ کے نانا شاہ ابوسعید صاحب[1]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مخصوص شاگرد، اور ماموں شاہ ابواللیث صاحب[2]، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مخصوص تلمیذ تھے۔ اس بنا پر ولی اللّٰہی سلسلہ کے خصوصی اوصاف گویا آپ کی گھٹی میں پڑے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شیخ کا قول یاد دلاکر باصرار رائے بریلی کے قیام پر آمادہ کیا اور "سی" ندی کے کنارے ایک جگہ قیام کے لئے تجویز کر دی۔ شاہ صاحب نے وہیں طرح اقامت ڈال دی ۱۰۷۵ھ میں آپ نے حج کیا۔ پھر دوسری مرتبہ ۱۰۸۲ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ واپسی میں کعبہ مکرّمہ کا نقشہ اور اس کی صحیح پیمائش ساتھ لائے۔ اور ۱۰۸۴ھ میں اس نقشہ اور پیمائش کے مطابق اپنے مسکن میں "سی" کے بالائی کنارے اپنے اور اپنی اولاد کے ہاتھ سے خدا کا گھر تعمیر کیا۔ جس کی بنیادوں میں آبِ زمزم ڈالا ۱۰۹۶ھ عہدِ عالمگیر میں ۶۳ سال عمر پاکر وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کی رات کو عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج کی رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ علماء نے تعبیر دی کہ اس شب میں کسی متبع سنّت عالم کا انتقال ہوا ہے۔ پھر سرکاری وقائع نگار کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت موصوف نے اسی شب میں انتقال کیا تھا (سیرت سید احمد شہید جلد ۱ ص ۴۹)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سید صاحب کے نانا حضرت سید شاہ ابوسعیدؒ (بن حضرت سید محمد ضیا بن حضرت سید آیت اللہ بن حضرت شاہ علم اللہ) اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم اور اکابر مشائخ میں سے تھے۔ جوانی میں اپنے عم محترم مولانا سیّد محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعتِ طریقت کی۔ اپنے آبا کرام کی نسبت اپنے والد کے خلیفہ شاہ محمد یونس سے حاصل کی۔ پھر دہلی حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلوک کی تکمیل کی اور بشارتِ عظیمہ سے ممتاز ہوئے۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے مخصوص لوگوں میں سے تھے۔ جود و سخاوت، مہمان نوازی اور غرباء پروری میں اپنے زمانہ میں ممتاز تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ آیا۔ گھر کے باہر رکھ دیا اور وہیں سے ضرورتمندوں کو تقسیم کر دیا۔ مدراس اور چیناپٹن میں آپ کا بڑا اثر اور مقبولیت تھی (سیرت سیّد احمد شہید ص ۶۵)۔ یہ ایک لاکھ روپیہ غالباً سلطان ٹیپو کے والد نواب حیدر علی کا عطیہ تھا۔ (سیرت سیّد احمد شہید)۔ [2] شاہ ابواللیث صاحب حضرت ابوسعید صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ زیادہ تر مدراس اور جنوبی ہند کے علاقے میں رہے، اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ سلطان ٹیپو کے معاصر تھے۔

Marfat.com

چنانچہ سیّد صاحب کے محلّہ اور پڑوس والوں نے سیّد صاحب کو بچپن ہی سے ایسے بچّہ کی حیثیت سے پہچانا، جس کے دل و دماغ پر خدمتِ خلق کا جذبہ چھایا ہوّا تھا۔

فطرت کے صحیح رہنمائی اس بچّہ کو محلّہ بھر بلکہ دوسرے محلّہ کے بھی ضعیف، اپاہج اور لاوارث خواتین سے مانوس کر دیا تھا۔ دل میں ایک درد تھا جو اس بچّہ کو صبح و شام ان ضرورت مندوں کے یہاں جانے پر مجبور کرتا۔ اُن سے اُن کی ضرورتیں معلوم کرتا اور خوشی خوشی اُن کو انجام دیتا۔ بازار سے سودا سلف لاکر دیتا۔ کنوئیں سے پانی بھر کر اُن کے یہاں پہنچاتا بیماروں کی تیمارداری کرتا، مزدوروں کو سہارا دینا اور کمزوروں کے بوجھ اُٹھاکر اُن کے گھروں تک پہنچانا، یہی اس بچّہ کی دلبستگی کے کام تھے۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی رہی، نوشت و خواند کا شوق تو آگے نہیں بڑھا مگر خدمتِ خلق کا جذبہ یہاں تک آگے بڑھا کہ جب وہ فکرِ معاش اور تلاشِ روزگار میں ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ وطن سے نکل کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہوّا، تو وہ اپنے ساتھیوں کا صرف خدمت گذار ہی نہیں تھا بلکہ اُن کا باربردار بھی تھا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں جب والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے روزگار کی تلاش میں لکھنؤ جارہے تھے اور ہم عمر سات نوجوان ساتھ تھے تو جیسے ہی چند میل چلے، ہر ایک کا سامانِ سفر اس کو بار معلوم ہونے لگا۔ سیّد صاحب نے ساتھیوں کی تکلیف محسوس کی اور بڑی تدبیر سے سب کے سامان کی ایک گٹھڑی بناکر سر پر رکھ لی۔ سب ساتھی سبک سار تھے اور یہ خادمِ خلق سیّد زادہ باربردار۔ رائے بریلی سے لکھنؤ تقریباً پچاس میل ہے۔ تین روز میں یہ سفر طے ہوّا۔ سیّد صاحب کا روزانہ کا دستور یہی رہا۔ ساتھی اگر انکار بھی کرتے تو منّت سماجت کرکے اُن کو راضی کرلیتے اور بڑے شوق سے یہ باربرداری کی خدمت انجام دیتے۔ لکھنؤ پہنچے تو سیّد صاحب کو وہاں کے ایک رئیس نے پہچان لیا۔ اُس کا اصرار تھا کہ آپ اُس کے مہمان ہوں۔ سیّد صاحب نے ساتھیوں کو چھوڑ کر تنہا مہمان بننا پسند نہیں کیا۔ تو رئیس صاحب نے دونوں وقت سیّد صاحب کی قیام گاہ پر کھانا پہنچانا شروع کر دیا۔ سیّد صاحب ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھاتے اور اس بیروزگاری

Marfat.com

کے دنوں میں بسا اوقات سب ساتھیوں کا فاقہ اسی کھانے سے ٹوٹتا۔

کئی ماہ گذر گئے۔ روزگار میسّر نہ آیا۔ آپ نے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ دہلی چلیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی کمائی کریں۔ ساتھی اس پر راضی نہیں ہوئے تو آپ تنہا روانہ ہو گئے۔

اسی سفر کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بوڑھے مزدور کو دیکھا کہ راب کا بھرا ہوا گھڑا سر پر رکھے ہوئے ایک سپاہی کے ساتھ جا رہا ہے۔ بوڑھے کی کمزوری چلنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر مجبوراً سر پر بوجھ لادے ہوئے چل رہا ہے۔ پہلے آپ یہ سمجھے کہ اس سپاہی نے اس غریب کو بیگار میں پکڑ لیا ہے تو آپ نے سپاہی کو فہمائش شروع کی۔ مگر جب سپاہی نے جواب دیا کہ بیگار نہیں بلکہ میں نے اس سے مزدوری طے کی ہے، مزدور نے بھی اقرار کیا کہ میں نے بھوکے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے اس مزدوری کو غنیمت سمجھا ہے۔ آپ مہربانی کریں اور سپاہی کو نہ بگاڑیں تو آپ نے مزدوری کے پیسے اس بوڑھے کو دلوائے اور سامان خود اٹھا کر سپاہی کے ساتھ ہو لئے اور جہاں اس کو جانا تھا وہاں تک سامان پہنچا دیا[1]۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے صحت و تندرستی کی دولت عطا فرمائی تھی۔ بدن ورزشی تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ صبح کو کم از کم پانچ سو ڈنڈ لگاتے تھے۔ آپ کے مگدروں کا وزن ایک من بائیس سیر ہوتا تھا، مگر یہ تن پروری کے لئے نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ خدا کی اس نعمت سے خلقِ خدا کی خدمت زیادہ کر سکیں۔

ایک خاص مقصد اور خاص نصب العین کے ماتحت آپ امیر علی خاں کی فوج میں بھرتی ہوئے۔ فنِ سپہ گری کے جوہر نے آپ کو ترقی کا موقع دیا۔ مگر اس سپاہیانہ زندگی میں بھی آپ خدا ترس، عابد شب بیدار رہے۔ کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ کسی کا مال نہیں لوٹا۔ کھیتوں کو برباد کر دینا، گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ دینا فوج کے لئے معمولی بات ہے۔ جو قطعاً جائز سمجھی جاتی تھی، مگر آپ کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنے گھوڑے کو فوج کے گھوڑوں سے الگ

---

[1] سوانح احمدی، مخزن احمدی و سیرت سید احمد شہید وغیرہ۔

Marfat.com

رکھتے۔ اُس کے دانے اور چارے میں بھی جائز و ناجائز کی پوری احتیاط برتتے۔

گھوڑا بھی کچھ ایسا سدھ گیا تھا کہ وہ بھوکا رہتا، مگر کسی کے کھیت میں منہ نہ ڈالتا تھا۔[1]

غریبوں کی خدمت اور مالی امداد کا سلسلہ اس زندگی میں بھی اُسی حوصلہ مندی سے جاری تھا، اور فراخ دستی کا یہ حال تھا کہ مشہور یہ ہوگیا تھا کہ آپ کو دستِ غیب ہے۔

ملازمت کا دَور ختم ہوا۔ آپ دہلی تشریف لائے۔ یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کے دربار سے امیرِ قافلہ بنایا گیا۔ اب سیاسی رہنما بھی ہیں اور شیخِ طریقت بھی مگر اصول مساوات کی پابندی یہ ہے کہ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ ضرورت پڑتی ہے تو ساتھیوں کے ساتھ مل کر لکڑی چیرتے ہیں۔ گھاس چھیلتے ہیں، بوجھ اُٹھاتے ہیں۔[2]

رائے بریلی کو مرکز بنایا گیا تو سینکڑوں ساتھیوں کے قیام کے لئے وسیع مکان (بیرک) کی ضرورت ہوئی۔ یہ کچّا مکان رفقار قافلہ نے خود اپنے ہاتھ سے تعمیر کیا۔ سیّد صاحب ان ساتھیوں کے دوش بدوش کام کر رہے تھے اور دنیا کو مساوات و اشتراکیت کا صحیح درس دے رہے تھے۔[3]

شیخ الاسلام مولانا سیّد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

آپ کے والد صاحب کا نام ہبۃ اللہ تھا اور آپ کے دادا مولانا نور اللہ صاحب تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص شاگرد اور پارٹی کے ممتاز رُکن تھے۔ اصل وطن بڈھانہ (ضلع میرٹھ) تھا۔[4]

آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے وہ نامور شاگرد ہیں[5] جن کو خود استاد نے

---

[1] سوانح احمدی ص۱۸۔ [2] سیرت ص۱۱۹۔ [3] سوانح احمدی ص۴۸ و ص۴۹۔ [4] شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک ص۴۷۔ [5] شاہ ولی اللہ صاحب سے آپ کا خاندانی رشتہ بھی تھا۔ حضرت شاہ صاحب آپ کے پھوپھا ہوتے تھے، پھر آپ کے خسر بھی ہوگئے۔

Marfat.com

علماء محققین اور شیخ الاسلام تحریر فرمایا ہے سنجیدہ مزاج، خوش اخلاق، خاموش طبیعت، کم گو، مگر تقریر کے وقت خطیبِ جادو بیان جو چند ہی جملوں میں دماغوں کی دنیا پلٹ دیتا تھا۔
علمی کمالات، اعلیٰ اخلاق و کردار، تدبّر و اصابت رائے اور بلند پایہ خطابت نے آپ کو نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند کا ممتاز رہنما بنا دیا تھا۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب ہی آپ کی عزّت کرتے تھے۔ مگر جب آپ سیّد صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو ساری عظمت و شہرت سیّد صاحب کے قدموں پر نثار کر دی۔ اب آپ سیّد صاحب کی جوتیاں اُٹھایا کرتے، رکاب تھام کر چلتے اور پالکی کے ساتھ پا پیادہ دوڑتے۔ مگر صاف گوئی اور حق پسندی کا وہ بلند مقام آپ کو حاصل تھا کہ نہ کسی کا ادب و احترام اس پر غالب آسکتا تھا اور نہ کسی کا رعب و طنطنہ وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ سیّد صاحب سے معمولی سی لغزش بھی ہوتی تو یہی جاں نثار و فداکار مرید تنبیہ فرما دیتے۔

سیّد صاحب نے نکاح کیا تو دو روز نمازِ صبح میں اتنی دیر ہو گئی کہ تکبیرِ اولیٰ میں شرکت نہ ہو سکی۔ مولانا عبدالحی جیسے مریدِ رشید کو کب برداشت تھی۔ دوسرے ہی روز پیر و مرشد کو ٹوکا۔ اور پیر بھی وہ حق پرست تھے کہ فوراً اپنی کوتاہی تسلیم کر لی۔ اصلاحی تحریکات میں نکاحِ بیوگان کا مسئلہ بھی تھا۔ اسلام نے عدّت گذر جانے کے بعد نکاحِ بیوہ کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بعض اوقات واجب اور فرض بھی قرار دیا ہے۔ لیکن جاہلانہ تصوّرات ہمیشہ اس سیدھے سادے مسئلہ میں غلط جذبات برانگیختہ کرتے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی انہیں غلط جذبات کا غلبہ تھا اور بیوہ کا نکاح بہت بڑی عار سمجھا جاتا تھا۔ اتّفاق سے حضرت سیّد صاحب کے بڑے بھائی مولانا محمد اسحاق صاحب کی وفات ہو گئی تو یہ مسئلہ خود گھر میں پیدا ہو گیا۔ سیّد صاحب کو طبعی تاثّر کی بناء پر کسی قدر تامّل ہوا تو فوراً اس صداقت پرست مرید نے تنبیہ کی "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"۔ چنانچہ فوراً ہی بیوہ کا نکاح کر دیا گیا۔

درحقیقت حق و صداقت ہی وہ رشتہ تھا جس نے پیر و مرید میں یہ اتّحاد پیدا کیا تھا اور ہر ایک قول و فعل اسی معیار پر پرکھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سیّد صاحب نے فرمایا۔ مولانا اگر

Marfat.com

کوئی بات میری طرف سے خلافِ شریعت دیکھیں تو تنبیہ فرمادیں۔

مولانا نے جواب دیا "حضرت! جب آپ کوئی خلافِ شریعت فعل کریں گے، تو عبدالحی آپ کے ساتھ ہی نہ ہوگا۔"

یہی صداقت وحق پرستی تھی جس نے اس شیدائے علم کو درس گاہ سے ہٹا کر قافلہ کے کیمپ میں پہنچایا۔ اور مسند نشینی کے بجائے صحرا نوردی پر آمادہ کیا۔

اسی کو حدیث شریف کے الفاظ میں الحبُّ للہ اور الحبُّ فی اللہ فرمایا گیا ہے۔ یہی ہوں گے جن کے مراتب جنت میں اتنے بلند ہوں گے کہ اُن کے اعزاز واکرام کی کرسیاں مشک کے ٹیلوں پر سجائی جائیں گی۔

شیخ الاسلام مولانا عبدالحی صاحبؒ، سیّد صاحب کی تمام جدّوجہد اور نقل و حرکت میں اعلیٰ مشیر کی حیثیت سے ساتھ رہے اور دستِ راست بن کر کام کرتے رہے۔ جب علاقہ سرحد میں آزاد حکومت قائم کی گئی تو آپ حکومت کے مشیرِ اعلیٰ اور عدالتِ عالیہ کے جج قرار دیئے گئے۔ مگر جنگ شروع ہونے سے پہلے آپ کو اسہال اور پیچش کی شکایت ہوئی اور اسی میں وفات ہوگئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

حضرت شاہ محمّد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ

ملک وملّت کا وہ سرفروش مجاہد جس کا عمل فلسفہ ولی اللہ کی تفسیر تھا اور جس کا ایثار، قربانی ذبیح اللہ کی زندہ تصویر۔ جس کا دل دولتِ درد سے مالا مال تھا اور جس کا جگر سوزِ محبّت کا سرمایہ دار، جس کا علم ہمدوشِ عمل، اور جس کا عمل آئینہ دارِ علم بے پایاں۔ آزادیٔ فکر کا سب سے بڑا حامی، جمہوریت کا علم بردار، ملوکیّت کا سب سے بڑا دشمن، شاہ پرستی کے لئے فرشتۂ موت، سرمایہ داری سے بیزار، غلامی کے ناپاک تصوّر سے ناآشنا، اس کی زندگی سعیٔ پیہم تھی۔ کتابِ زندگی کا آغاز باب جہاد سے ہوا، اور اسی جہاد پر زندگی کا آخری ورق پلٹا گیا۔

Marfat.com

باپ مولانا شاہ عبدالغنی، دادا وہی حضرت شاہ ولی اللہ، جن کی تحریک کو لے کر میدانِ جہاد میں پہنچا، اور اسی راستہ میں شہید ہو کر حیاتِ جاوداں حاصل کی۔

علم و عمل کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسی فضا میں تربیت پائی۔ والد کی وفات لڑکپن میں ہو گئی تھی۔ قدرت نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی آغوشِ شفقت پرورش کے لئے منتخب کی۔ بھتیجا چچا پر ناز کرتا تھا اور چچا کو بھتیجے پر فخر تھا۔ وہ بار بار کہا کرتا تھا:

الحمد للہ الّذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق

گہوارۂ علم میں پرورش پانے والا بچہ نازک مزاج ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اُس کو نزاکت سے نفرت تھی۔ شوقِ جہاد اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ نزاکت آفرینی کے بجائے اُس نے اپنے بدن کو شدائد و مصائب کا یہاں تک خوگر بنایا کہ سردی اور گرمی کا احساس گویا مفقود ہو گیا تھا۔

اُس نے جس طرح منطق و فلسفہ، ریاضی اور اقلیدس میں اعلیٰ کمال حاصل کیا، حدیث و فقہ کا جس طرح وہ ماہر ہوا، ویسے ہی اُس نے فنِ سپہ گری میں بھی استادانہ شان پیدا کی۔

وہ جس طرح مفسّر و محقّق، فقیہ اور محدّث تھا، ایسے ہی وہ بہترین شمشیر زن اور اعلیٰ درجہ کا نشانہ باز بھی تھا، وہ اعلیٰ درجہ کا مدبّر اور مفکّر تھا، نظم و نسق کا بہترین ماہر اور ایسے ہی میدانِ جنگ کا بہترین جرنیل اور فیلڈ مارشل۔

پُرانے خاندانوں کے بچے کھچے لوگ آج بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ دوپہر کے وقت جامع مسجد کے فرشِ سنگین پر ٹہل ٹہل کر اُس نے تمازتِ آفتاب کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ اور دریائے جمنا کی پاک دھاریں آج بھی شہادت دے سکتی ہیں کہ وہ دریا کی موجوں سے کھیلتا ہوا زینت المساجد (دہلی) سے تاج محل (آگرہ) تک پہنچتا تھا، اور پھر انہیں لہروں سے باتیں کرتا ہوا زینت المساجد میں آجاتا تھا۔ وہ جس طرح مئی اور جون کی گرمی میں کمبل اوڑھ کر سفر کر سکتا تھا، ایسے ہی دسمبر اور جنوری کی سردیاں ململ و حریر میں گذار سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین "خدمتِ خلق" تھا، اور خلقِ خدا کے مفہوم میں جس طرح افلاس کے

Marfat.com

مارے ہوئے شریف اور باعزت خاندان یا نیک نفس طلبہ داخل تھے، ایسے ہی شراب کی بھٹیوں، جوئے کے اڈوں اور قحبہ خانوں کی قباحتوں میں زندگیاں گذارنے والوں کو وہ اپنی خیر خواہانہ ہمدردیوں کا مستحق سمجھتا تھا۔ اُن کی یہ پستی اور رسوائی، اس کے بااحساس دل میں درد پیدا کرتی اور یہ اُن تباہ حالوں کی اصلاح اور اپنے دردِ دل کے علاج کے لئے ہر ایک امکانی کوشش کام میں لاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بھیس بدل کر اُن کے مجمع میں پہنچتا اور اپنی صدا سُنا کر اُن کے دلوں کو پلٹ دیتا[1]۔

وہ ہزاروں انسان جن کی صلاحیتیں مفقود نہیں ہوئی تھیں راہِ راست پر آگئے لیکن وہ

---

[1] مشہور واقعہ ہے کہ دہلی کی بہت بڑی دولت مند اور ممتاز ترین "موتی" کے یہاں کسی تقریب میں تمام دہلی کی طوائف کا اجتماع تھا۔ شاہ صاحب کو علم ہوا تو آپ نے جامع مسجد میں نماز عشاء پڑھی اور فقیروں کے کپڑے پہن کر بازار خانم میں اس طوائف کے مکان پر تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر دستک دی۔ اندر سے ایک لڑکی نکل کر آئی۔ دریافت کیا کون ہے۔ آپ نے فرمایا، ایک فقیر ہے۔ لڑکی اندر گئی۔ اپنی آقا "موتی" کو خبر کی۔ موتی نے کچھ پیسے بھیج دیئے۔ لڑکی نے آکر پیسے دینے چاہے۔ آپ نے فرمایا اپنی بی سے کہو، فقیر کہتا ہے کہ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں۔ بغیر صدا کہے کچھ لینے کی عادت نہیں۔ تم پہلے میری صدا سُن لو۔ لڑکی نے جا کر کہا۔ موتی کو خیال ہوا کہ فقیر کی صدا اس بزمِ نشاط میں سرمستی پیدا کرے گی۔ اُس نے فقیر کو اجازت دے دی۔ فقیر اندر داخل ہوا۔ سارا مجمع فقیر کے گرد اکٹھا ہو گیا فقیر نے آنکھیں بند کر کے صدا کہنی شروع کی۔ یہ صدا کیا تھی۔ سورۂ والتین کی رقت انگیز تفسیر تھی۔ جو درد بھرے دل سے پُر درد لہجہ میں نکل رہی تھی، اور دلوں میں درد پیدا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ہر طرف سے گریہ وزاری توبہ و استغفار کی صدا بلند ہونے لگی۔ موتی اور اس کی بہت سی سہیلیوں نے آوارہ زندگی سے توبہ کی اور نکاح کر کے ساری عمر پاک دامنی اور شرافت کے ساتھ گذار دی۔

(سوانح احمدی و سیرت سید احمد شہید و امیر الروایات وغیرہ)

Marfat.com

کج طبع جن کی فطرت معکوس ہوچکی تھی اس ہمدردِ انسانیت کے دشمن بن گئے۔

ایسے تندخو بدمعاشوں کی دشمنی سے خوف کھا کر کچھ دوستوں نے شاہ صاحب کو اصلاح کی خطرناک سرگرمیوں سے باز رکھنا چاہا[1]۔ مگر نوعِ انسان کی خیر خواہی کا جو سوز و درد شاہ صاحب کو عطا ہوا تھا وہ کب چشم پوشی و خاموشی کی اجازت دے سکتا تھا[2]۔

اُن کی رسوائی ہوئی تو کیا میری رسوائی نہیں

---

[1] ایک مرتبہ کچھ بدمعاشوں نے حضرت شاہ صاحب کی اصلاحی کوششوں پر آوازے کسے۔ شاہ صاحب کے ایک دوست کو بدمعاشوں کی یہ حرکت ناگوار گذری اور ان کو صدمہ ہوا کہ یہ بدمعاش شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے کے منہ آرہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن کو شاہ صاحب پر بھی غصہ آیا کہ وہ کیوں ان بدمعاشوں کو منہ لگاتے ہیں کہ ایسے جواب سُننے کی نوبت آتی ہے۔ دوست نے شاہ صاحب کو ملامت شروع کی کہ آپ ایسے معزز خاندان کے معزز رکن ہیں۔ یہ آپ کیا حرکت کرتے ہیں کہ ان بدمعاشوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر اُن سے بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ کیا یہ انسان نہیں ہیں۔ کیا یہ اصلاح کے مستحق نہیں ہیں۔ کیا یہ طائف کے اوباشوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اگر سردرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور طائف کے بدمعاشوں سے سر بازار پتھر کھاتے ہیں جس سے جسم مبارک لہولہان ہوجاتا ہے تو اسمٰعیل کے لئے یہ ذلت نہیں بلکہ فخر ہے کہ میری طرف سے ہمدردی اور خیر خواہی ہو اور ان کی طرف سے توہین و ایذا رسانی ہو۔

بجرمِ عشق توام مے کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

[2] اصلاح اور پند و نصیحت کا بے پناہ جذبہ جو حضرت شاہ صاحب کو عطا ہوا تھا اس کے اندازہ کے لئے ایک مثال کافی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے وعظ کہا۔ وعظ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص آیا۔ اُس نے حیرت سے دریافت کیا کہ کیا وعظ ہوچکا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ وعظ ختم ہوگیا۔ اُس شخص نے افسوس کیا کہ میں گھر سے چل کر اسلئے آیا تھا کہ کچھ نصیحتیں سُنوں۔ آپ نے فرمایا۔ افسوس نہ کرو، میں تمہیں پھر سنائے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپنے پورا وعظ اوّل سے آخر تک دُہرادیا کہ شاید اسی ایک کو ہدایت ہوجائے (سیرت سید احمد شہید)۔

حضرت شاہ صاحب کی جوانی تھی اور دہلی کا دورِ جاں کنی۔ برطانوی سامراج کا ریذیڈنٹ یہاں مقرر ہو چکا تھا۔ اور اس رواداری "دل لی" میں جہاں سینکڑوں سال سے خیالات کی آزادی اور بین الملّی بھائی چارہ کا دور دورہ تھا۔ مذہب کے نام پر جنگ شروع کرا دی گئی تھی۔ یہ پہلا شخص تھا جس پر سامراجیت کے مفتی خانہ سے لامذہبیت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ کیونکہ یہ ان رسومات کو ختم کر دینا چاہتا تھا جو سوسائٹی کو اوہام پرست، بزدل اور پست ہمّت بنائے ہوئے تھیں اور جن کی فضول خرچیوں نے سماج کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ کر دیا تھا۔ یہ رہین مفتی صاحب کا جب فتویٰ کارگر نہ ہوا تو امنِ عامہ[1] کا بہانہ لے کر زبان بندی کر دی گئی۔ اب اس مجاہدِ حق نے عوام کے بجائے ریذیڈنٹ کی کوٹھی پر پہنچ کر خود ریذیڈنٹ کو مخاطب کیا۔ نتیجہ شاہ اسمٰعیل صاحب کے حق میں تھا۔ ریذیڈنٹ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ لامحالہ اس کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔[2]

سادگی جس کا دل سوز و گداز سے بھرا ہوا تھا وہ ظاہری رکھ رکھاؤ کی طرف کب متوجہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا دماغ بناؤ سنگار اور آرائش و زیبائش کے تصوّر سے بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کی سادگی مشہور ہے۔

اُن کے علم و فضل، تحریر و تقریر اور اعلیٰ خطابت و حاضر جوابی کے جو چرچے دُور دُور پھیلے ہوئے تھے اُن کو سُن کر ایک پُر تکلّف، باوضع شاندار اور صاحبِ جُبّہ و دستار شخص کا تصوّر دماغوں میں آتا۔ مگر جب لوگ اُن کو پا پیادہ سیّد صاحب کی رکاب تھامے ہوئے دوڑتے

---

[1] کیس کو مضبوط کرنے کے لئے دہلی کے شاہ پرستوں سے محضر نامہ مرتب کرایا گیا۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ اس پر دستخط کرائے گئے۔ محضر نامہ میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ شاہ صاحب کو اُن کی تقریروں سے روکا جائے۔ ایک عالم صاحب اس تمام کارروائی میں آلۂ کار تھے۔ مگر اس وقت ان عالم صاحب کا دورِ شباب تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ۱۸۵۷ء میں جہادِ حرّیت کا بازار گرم ہوا تو یہ عالم صاحب بھی وہی کر رہے تھے جو پہلے شاہ اسمٰعیل صاحب کر چکے تھے۔ فرق یہ رہا کہ شاہ صاحب بالاکوٹ میں شہید ہوئے اور اس عالمِ حق نے جزائر انڈمان میں حبسِ دوام کی سزا کاٹنے میں وفات پائی۔ رحمہما اللہ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات ولی۔

دیکھتے یا گرد و غبار میں اَٹے ہوئے نہایت معمولی صورت میں سامنے آتے یا گھوڑوں کو کھریرا کرتے ہوئے اُن پر نظر پڑتی تو حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ دیو بند کے جلیل القدر مشہور عالم حضرت مولانا ذوالفقار علی[1] صاحب کا بیان ہے۔

"جب حضرت سید صاحب کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو دیو بند کے بڑے بڑے لوگ استقبال کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے وہاں تک پہنچے تو سید صاحب نظر آئے۔ ایک ٹانگھن پر سوار تھے، اور دونوں طرف دو صاحب رکاب تھامے ہوئے چلے آرہے تھے استقبال کرنے والوں نے آگے بڑھ کر سید صاحب سے ملاقات کی۔ یہ ان رکاب تھامنے والوں کو نہ سمجھ سکے کہ کون ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا۔ ان سے ملو، یہ مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی ہیں۔[2]

لکھنؤ کے علم دوست آپ کے علم و فضل، حاضر جوابی اور نکتہ سنجی کی شہرت سن کر ملاقات کے لئے آتے تو کبھی آپ سے سپاہیانہ لباس میں پریڈ کرتے ہوئے ملاقات ہوتی کبھی گھوڑوں کے اصطبل میں اور کبھی یہ بتایا جاتا کہ مولانا اسمٰعیل وہ ہیں جو گھوڑے کو کھریرا کر رہے ہیں۔

جب قافلہ کلکتہ پہنچا تو قافلہ کے میزبان شیخ محمد امین نے سید صاحب سے کشتی پر

---

[1] مولانا ذوالفقار علی صاحب قصبہ دیو بند کے مشہور عالم و فاضل اور باحیثیت بزرگ تھے آپ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کے بڑے صاحبزادے بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سب سے پہلے جنگِ آزادی کے محرک اور مجاہد ہوئے۔ جن کو محبانِ وطن نے شیخ الہند کا خطاب دیا اور آج تاریخ کے صفحات میں اُن کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا بانی تحریکِ ریشمی رومال (مفصل ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ)۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب عربی فارسی کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی ادبی خدمات علومِ مشرقیہ کی یونیورسٹیوں میں بہت زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہیں۔ آپ کا شمار دارالعلوم دیو بند کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ عرصہ تک انسپکٹر مدارس رہے۔

[2] ارمغانِ احباب بحوالہ سیرت سید احمد شہید۔ طبع اول ص ۳۹۷۔

Marfat.com

ملاقات کرنے کے بعد سب سے پہلے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا مولانا موصوف دوسرے جہاز پر سوار تھے۔ آپ کو بلایا گیا۔ خانوادۂ علم کا یہ شاہزادہ جس سادہ وضع میں حاضر ہوا، وہ کچھ ایسی رقت انگیز تھی کہ شیخ امین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ حیران تھے کہ شاہ ولی اللہ کا پوتا، شاہ عبد الغنی کا لختِ جگر، شاہ عبد العزیز کا بھتیجا اور سلطنتِ فضل و کمال کا مسند نشین، اس قدر سادہ، الیسا بے تکلف اور اتنا جفاکش۔

شاہ پرستی کی مخالفت اور ملوکیت سے نفرت شاہ اسمٰعیل صاحب کی سیرت میں شاہ پرستی کی مخالفت سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں درجہ رکھتی تھی۔ جس بات کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اشاروں میں سمجھایا تھا جس مفہوم کو شاہ عبد العزیز صاحب نے غیر مطبوعہ تفسیر کی عبارتوں میں سمو دیا تھا، آپ نے کھلے بندوں اُس کو واضح کیا اور اُس کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی۔ آپ کی عجیب و غریب تصنیف "منصبِ امامت" آج بھی موجود ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی بادشاہت جس کو اللہ کا سایہ اور خدا کا انعام سمجھا جاتا تھا، آپ اس کو جبر و قہر کی سلطنت اور اپنے زمانہ کی سب سے بڑی لعنت قرار دیتے ہیں "منصبِ امامت" کے چند اقتباسات "تحریک کا نصب العین" کا بیان کرتے ہوئے پیش کئے جا چکے ہیں اسی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ انہیں ملوک اور بادشاہوں کے متعلق کس قدر سخت فیصلہ ہے:

"استیصالِ او عین انتظام سنت و اہلاکِ او عین اسلام و اطاعت ہر متسلط از احکام شرعیہ نیست و انقیاد ہر متجبر از اوامرِ دینیہ نہ۔ (ص۹۸ منصب امامت)

ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا عین انتظام ہے اور اُن کو فنا کے گھاٹ اُتار دینا عین اسلام۔ ہر صاحب اقتدار کی اطاعت کرنا حکم شریعت نہیں ہے اور نہ ہر جابر و قابض کے سامنے گردن جھکا دینا دین کا حکم ہے۔"

آخر میں یہ بھی غور فرمایئے کہ جب مسلمان بادشاہوں کے متعلق شاہ صاحب کا یہ فیصلہ ہے تو انگریزوں کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟

Marfat.com

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات

سید احمد صاحب کا قافلہ سفر حج سے واپس ہو کر ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا کہ یہ بوڑھا رہنما جس نے ملک و ملت کی خدمت میں مسلسل ترسیٹھ سال صرف کئے تھے اور جس کے اشاروں پر سید صاحب کی خدائی فوج نے مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملا دیئے تھے ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ، ۶ر مئی ۱۸۲۴ء کی صبح کو اس تلوّن مزاج دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس حادثہ کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی ضرورت۔ البتہ تحریک سے متعلق چند باتیں اس باب کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "ہمہ گیر انقلاب" کا جو بیج بویا تھا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی آبیاری سے وہ ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ جن کی تعلیم و تربیت اور ایک مخصوص قسم کی اخلاقی ٹریننگ جو اس نصب العین اور اس منزل مقصود تک پہنچنے کا بہت ضروری پروگرام تھا، اُس کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ پورے ہندوستان میں قرآن و حدیث کا کوئی ایک قابلِ اعتماد عالم ایسا نہ تھا جس کا رشتہ تلمذ بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز (قدس اللہ سرہ العزیز) کے دامنِ فیض سے وابستہ نہ ہو۔

لہ پیدائش ۱۱۵۹ھ، ۱۷۴۶ء۔ وفات ۱۲۳۹ھ، ۱۸۲۴ء۔ قمری حساب سے عمر ۸۰ سال۔ ۱۷ سال کی عمر میں والد صاحب کی جگہ ملکی و ملی خدمات کے مسند نشین ہوئے۔ ۶۳ سال متواتر سرگرم اور جلیل القدر خدمات سے مسند کو پُر رونق رکھا۔ تین عفت مآب صاحبزادیوں کے علاوہ آپ کے اولاد نہ تھی۔ صاحبزادیاں بھی صاحبِ اولاد ہو کر آپ کی حیات ہی میں وفات پاگئیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی مولانا رفیع الدین صاحب کے فرزند مولانا عیسیٰ سے منسوب ہوئی تھیں۔ منجھلی صاحبزادی شیخ محمد افضل صاحب سے منسوب ہوئی تھیں جن سے مولانا محمد اسحٰق صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحب پیدا ہوئے۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے نکاح میں تھیں جو حضرت سید احمد صاحب کے رفقاء میں سب سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔

Marfat.com

(۲) عسکری تنظیم کے سلسلہ میں سیّد صاحب کی زیرِ قیادت تقریباً آٹھ سو مجاہدینِ حرّیت کی فوج تیار ہو چکی تھی جس کے ہر ایک رضا کار کے رجحانات و جذباتِ ولی اللّٰہی اصول کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور وہ سیاسی و سماجی انقلاب کی زندہ تصویر بن چکا تھا۔

(۳) قافلہ کے پے درپے دوروں نے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں جذبۂ انقلاب کی وہ حرارت پیدا کر دی تھی کہ جس کو ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کا خونین سیلاب بھی سرد نہ کر سکا۔

(۴) اس کی پاک باز زندگی اور مخلصانہ خدمات نے لوگوں میں وہ گرویدگی پیدا کر دی تھی کہ جنازہ کی نماز جو ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہے، اس شہنشاہِ علم و عمل کے جنازہ پر پچپن ۵۵ مرتبہ پڑھی گئی۔[۱]

(۵) اقتصادی سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا بنیادی اصول یہ ہے، کہ معیارِ معیشت مساویانہ ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس اصول کے یہاں تک پابند تھے کہ ساری عمر گاڑھے اور دھوتر کے کپڑے پہنے اور مرنے کے وقت وصیّت کر دی کہ اُن کا کفن بھی اسی کپڑے کا ہو جو وہ اپنی زندگی میں پہنا کرتے تھے۔[۲]

(۶) آپ نے تاکید فرما دی تھی کہ آپ کی وفات کی خبر بادشاہ کو نہ دی جائے، کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ آپ کے جنازہ میں شرکت کرے[۳]۔ یہ وصیّت اور یہ تاکید اس وجہ سے نہیں تھی کہ بادشاہت کی ذات سے آپ کو نفرت تھی۔ یہ واقعہ ہے[۴] کہ بادشاہ آپ کا احترام کیا کرتا تھا اور آپ بھی بادشاہ کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آتے تھے بلکہ اس وصیّت کا اصل سبب وہ تنفّر تھا جو خدا پرست مومن کو ملوکیّت اور مُلوکانہ شان و شوکت سے ہونا

۱؎ مقالاتِ طریقت صفحہ ۲ و کمالاتِ عزیزی وغیرہ۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۲۔ ۳؎ کمالاتِ عزیزی و حیاتِ ولی صفحہ ۳۴۴

۴؎ نجف علی خاں اگرچہ آپ کا مخالف تھا مگر اس کے بعد نجیب الدولہ کے دَور میں حالت بدل چکی تھی خود نجیب خاں اور اسی طرح دوسرے اُمراء کی حالت یہ تھی کہ کہیں آپ کو دیکھ لیتے تھے تو اپنی سواری سے اُتر کر قدمبوس ہوتے۔ ایک مرتبہ ادشاہ سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملاقات ہو گئی تو بادشاہ نے آپ سے آگے تشریف لے چلنے کی درخواست کی (ملفوظات،

Marfat.com

چاہیئے اور جو "ہمہ گیر انقلاب" کا ایک جزو تھا۔

جانشین اور تقسیم کار | مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زندگی ہی میں اس گروپ کے سربراہ کار اور انچارج کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے جو تعلیم و تربیت اور مرکزی تنظیم کا ذمہ دار تھا۔ حضرت شاہ صاحب بھی آپ پر وہی اعتماد کرتے تھے جو صحیح جانشین پر کیا جاتا ہے[1]۔

لہذا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کے بعد حضرت شاہ اسحٰق صاحب ہی جانشین قرار دیئے گئے[2]۔

دوسرا گروپ جس کو فوجی خدمات اور امور خارجہ سپرد تھے وہ بدستور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی زیر قیادت اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا، بلکہ اپنے قائد اعظم کی وفات کے بعد پہلے سے زیادہ چست ہوگیا۔

---

[1] مولانا عبیداللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: مولانا محمد اسحٰق صاحب کو ہر معاملہ میں اپنے ساتھ شریک رکھ کر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ اُن کا حکم میرا حکم ہے۔ (ص ۱۵۳ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)

[2] مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا ارشاد ہے "جب ۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیز فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحٰق کے سپرد کردیا جو حزب ولی اللہ کی امامت کا عرفی دستور تھا۔ سید احمد صاحب شہیدؒ کا قافلہ جب حج سے واپس آیا تو انہوں نے امام عبدالعزیز کے بعد اس امامت کو تسلیم کرلیا۔ اس زمانہ میں اگر جمعیۃ کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحٰق صدارت کرتے اور سید احمد شہید حلقے میں بیٹھتے اور جب مدرسہ سے باہر مجلس منعقد ہوتی تو سید احمد شہید صدر ہوتے اور مولانا محمد اسحٰق حلقہ میں شریک ہوتے۔ اس لئے حزب ولی اللہ کی اساسی مصلحت کی حفاظت اور رجال و اموال جمع کرنے کے لئے دعاۃ کا سلسلہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ سے متعلق رہا اور عسکری و سیاسی سرداری سید احمد شہید کی جماعت سے وابستہ رہی۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۵۶ بحوالہ ارواح ثلاثہ)۔

Marfat.com

خلاصہ اور نتائج

یہ چند سو صفحات جو حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اور اُن کے رفقاء اور تلامذہ کی تصانیف سے اس طرح مرتب کئے گئے کہ پورے ہندوستان کا سیاسی نقشہ، ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کے رجحانات اور اُن کی کوششوں کی تاریخ سامنے تھی۔ آپ نے اُن کے مطالعہ میں کافی وقت صرف کیا۔ اب ان تمام صفحات کا خلاصہ صرف چند لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے۔ کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات پر آپ اس تاریخ کی ایک جلد ختم کر رہے ہیں، اور عملی اقدامات کی دوسری جلد آپ کے سامنے آرہی ہے۔

(۱) یہ تمام جدّوجہد نہ مغل شہنشاہیّت کی حمایت میں تھی، نہ اس لئے تھی کہ مسلم قسطائیت برپا کی جائے۔ بلکہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد کے لئے تھی کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو دنیا کو کارل مارکس، اینگلس اور لینن کی ضرورت پیش نہ آتی۔

(۲) کمیونزم کے اقتصادی مقاصد کو زیادہ مفید اور مہذّب طریقہ پر انجام دیتے ہوئے خصوصیت یہ ہوتی کہ سوسائٹی اخلاق اور روحانیت سے ناآشنا نہ ہوتی بلکہ خوفِ خدا، اعلیٰ اخلاق اور روحانیت کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ ایک عجیب وغریب سوسائٹی وجود میں آتی جس سے پورا ملک درحقیقت امن امان، خوش حالی اور پُراطمینان زندگی کی جنّت بن جاتا اور جس میں زیردست، پامال اور ستم رسیدہ انسانوں کے لئے بھی وہ سب کچھ ہوتا جو بالادست امراء اور جاگیرداروں کے لئے تھا جو صدہا سال سے عزّت وشرافت کا قشقہ اپنی پیشانیوں پر لگائے ہوئے تھے۔

(۳) کوڑہ جہاں آباد کے معاہدہ ۱۷۶۵ء کے بعد انگریز دشمن مسلمانوں کا رجحان مرہٹوں کی طرف بڑھتا رہا، اور نجیب الدولہ کی وفات (۱۷۷۰ء) کے بعد شاہ ولی اللہ کے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز کی ہمدردیاں انگریزوں کے برخلاف مرہٹوں کے لئے مخصوص ہوگئیں۔

(۴) ۱۷۷۰ء سے ۱۸۱۸ء تک تقریباً پچاس سال ایسے گذرے کہ اس پارٹی کے

Marfat.com

حامی، انگریزوں کے برخلاف مرہٹوں کے مددگار تھے۔ جگہ جگہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ کی، اور جب ایک ایک کر کے مرہٹہ طاقت ختم ہوگئی تو پھر علیحدہ پارٹی بنائی گئی۔

(۵) بظاہر یہی سبب ہے کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی نے عالمگیر اور شیواجی کے تلخ واقعات کو زیادہ سے زیادہ اُچھالا، اور وہ ہمدردیاں جو پچاس سال تک ایک ہی رُخ پر چلتی، اُن کے اثرات دماغوں سے محو کر کے آپس میں نفرت و نفاق اور بے اعتمادی پیدا کی۔

(۶) تحریکِ شاہ ولی اللہ کی قیادت بے شک علماء کے ہاتھ میں تھی مگر تحریک کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں غیر علماء بھی برابر کے شریک تھے۔ بلکہ غیر علماء کی تعداد علماء سے کہیں زیادہ تھی۔ قافلہ کے آٹھ سو افراد میں باقاعدہ عالم سو سے زیادہ نہیں تھے۔ قافلہ کے علاوہ جن ہزاروں مسلمانوں نے ہر قسم کی امداد دل و جان سے پیش کی، اُن میں شیخ غلام حسین[1] صاحب رئیس الہ آباد (ومختار عام مہاراجہ بنارس) ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل شیخ امین الدین صاحب (کلکتہ) اور نواب امیر علی خاں والیٔ ٹونک جیسے نواب زمیندار و سوداگر بھی تھے اور قاضی فرزند علی صاحب اور مولانا فتح علی جیسے دولت مند علماء بھی تھے، جنہوں نے مال سے امداد کی اور اپنی آل و اولاد بھی تحریک کے نام پر بھینٹ چڑھا دی۔

---

[1] غالباً یہ شیخ غلام علی رئیس الہ آباد ہیں جن کو غلطی سے شیخ غلام حسین لکھا گیا ہے۔ (مصحح)

Marfat.com

ولی اللّٰہی فوج کا انقلابی اقدام

ترکِ وطن، آزاد مرکز میں آزاد حکومت

سید صاحب حج سے واپس ہوئے تو آپ کے ارادے کیا تھے؟ اس کا جواب ڈاکٹر ہنٹر صاحب سے سنئے:

"پہلے جو چیز خواب و خیال تھی، اب اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی، جس میں اُنہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۸۹)۔

امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کا علم اُن کو یا صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ظاہری عادات بالکل بدل گئیں۔ اب اُن کی زندگی کا مقصد صرف مرید بنانا ہی نہ تھا، بلکہ مقصدِ اصلی کو پورا کرنے کے لئے یہ محض ابتدائی ذریعہ تھا۔

بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے، اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کر سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے، اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ ان پُر امن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دُور دراز جنگ جُو آبادی پر لگی رہتی تھی (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۹۰،

یہ ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے ۔ اب آپ کے حامی اور پیر منشی محمد جعفر تھانیسری کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیے :

"وطن پہنچ کر کچھ عرصہ تک تو مرمت مکانات میں جو آپ کی غیر حاضری میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے آپ مصروف رہے ۔ اس سے فارغ ہو کر سفر جہاد کی تیاری کرنے لگے ۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب وغیرہ علماء کو واسطے بیان کرنے مضامین ترغیب ہجرت و جہاد اطراف ہندوستان میں روانہ کر دیا گیا ۔ اس وقت سید صاحب کے مکان پر بجائے مراقبہ و مشاہدہ اور توجہ دہی کے فضیلت ہجرت و جہاد کا بیان اور تلوار و بندوق کی صفائی اور قواعد و چاندماری و گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی ۔ اب بجائے صوفی و درویش ہر شخص سپاہی بن گیا ۔ تسبیح کے عوض ہاتھ میں تلوار اور فراخ و جبّہ کی جگہ چست الخالق اور پیچ دار سربند لباس ہو گیا ۔"

جن لوگوں نے پہلے آپ کے تابعین کو بصورت درویشانہ اور اب بلباس وضع سپاہیانہ دیکھا تھا ، اُن کو سخت حیرت تھی ۔ ان دنوں میں جو کوئی تحفہ تحائف آپ کے لئے لے کر آتا تھا تو اکثر ہتھیار یا گھوڑے ہوتے تھے ۔ انہیں دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازی پور جمنیا سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآن مجلّد تحفہ لے کر آئے اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب موصوف لے کر آئے وہ امجد[1] نام اُن کا ایک نوجوان بیٹا تھا جس کو انہوں نے مثل ابراہیم خلیل اللہ کے راہِ خدا میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالے کر دیا اور عرض کیا کہ اس کو اپنے ساتھ

---

[1] یہ امجد صاحب جو ہر معرکہ میں پیش پیش رہے اور بہت سے معرکے ایسے انجام دیئے کہ اُن میں کامیابی کا تصوّر بھی لرزہ خیز تھا گویا موت کے منہ میں جا کر زندہ واپس ہوئے ۔ اسی وجہ سے سید صاحب کے دربار سے اُن کو "زندہ شہید" کا خطاب ملا تھا (سیرت سید احمد شہید ج ۱ صفحہ ۲۸۶) ۔

جہاد میں لے جائیے اور تیغِ اعداء سے اس کی قربانی کرائیے" (سوانح احمدی ص۸۹)

بہرحال جب فوجی طاقت فراہم اور ساتھیوں کی پوری تربیت ہوگئی تو ۱۲۴۱ھ[1] ۱۸۲۶ء میں آپ نے وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر آزاد قبائل کا ارادہ کیا۔ لیکن پنجاب کے راستہ سے گذرنا مشکل تھا تو آپ راجستھان ہوتے ہوئے سندھ پہنچے اور وہاں سے قندھار پھر کابل ہوتے ہوئے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوکر وہاں اپنا مرکز قائم کیا۔

پنجاب کے بجائے راجستھان کا راستہ پنجاب سے گذرنا بے شک دشوار تھا لیکن راجستھان کی گذرگاہ بھی سہل نہ تھی۔ وہاں مخالف حکومت کے خطرات تھے تو یہاں بے آب و گیاہ وادیوں اور خشک ریگستانوں کی حکومت بھی کم خطرناک نہیں تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوّر خطرات سے زیادہ ایک اور داعیہ یہاں موجود تھا۔ یہ راجستھان وہی لالہ زار تھا جہاں بہت سے پُرانے راجوں مہاراجوں کے داغ دار سینے موجود تھے جن میں آزاد حکمرانی کے جذبات تڑپ رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نے نواب امیر علی خاں" والئ ٹونک" کے اصرار پر پہلے ٹونک کا قصد کیا۔ مگر خدا جانے اس سے پہلی منزل کیوں فراموش کردی گئی یا اس کا علم نہیں ہوسکا۔ "یہ گوالیار" کی منزل تھی۔ یہاں" دولت راؤ سندھیا"[2] کا مرض استسقاء

---

[1] ۷ جمادی الثانیہ ۱۲۴۱ھ، ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء دوشنبہ۔ ایک شاعر صاحب نے یہ تاریخ کہی۔

به عزمِ جهاد اں شہ ملک و دیں — کہ شد احمدِ عصر نامش غریب

چوں بربست رخت سفر شد سوار — گرفت از پس و پیش فوجِ حبیب

بہ بحرِ تفکّر شدم غوطہ زن — دُر سال آں تا کہ گردد نصیب

بریدہ سرِ کفر و پائے عدو — بہ آہنگِ راحت، فزائے عجیب

سروشے ندا داد از بامِ چرخ — کہ نصر من اللہ فتح قریب

نصر من اللہ فتح قریب کے اعداد میں سے کفر کا سر یعنی کاف" اور عدو کے پاؤں یعنی "و" کے اعداد نکال دیئے جائیں۔ یعنی ۱۲۶۷ میں سے ۲۶ نکال دیئے جائیں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

میں مبتلا زندگی سے بعید اور موت کے انتظار میں پڑا تھا لیکن آزادی کی تڑپ اب بھی دل کی دھڑکن بنی ہوئی تھی۔ یہ سب سے آخری راجہ تھا جس کو مجبور ہو کر انگریزی اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ وہ اس خودمختاری کو نظربندی سمجھ رہا تھا۔

اس کی رانی اس کی رفیقۂ حیات، دلی جذبات میں ہم صفیر و ہم آواز تھی۔ مگر بیم و رجا کی کش مکش میں مبتلا، اس کا سرتاج زندگی سے مایوس تھا تو اس کی بھی دُنیا تاریک اور زندگی مایوس ہو رہی تھی۔

مہارانی کے بھائی راجہ ہندو راؤ زمامِ حکومت سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ وہی راجہ ہندو راؤ ہے جو مدت سے سید صاحب کا ارادت مند و معتقد تھا۔ گوالیار اسٹیٹ کے ایک معتمد رُکن "غلام حیدر خاں" ہیں۔ جو زمانۂ ملازمت سے سید صاحب کے یارِ غار اور گہرے دوست ہیں، اور جب نواب امیر علی خاں کا کارخانہ درہم برہم ہوا تو جذبات و خیالات کی یگانگت اُن کو گوالیار لے آئی ہے۔ یہاں مہاراجہ نے جوہر کی قدر کرتے ہوئے اُن کو بڑے منصب پر مامور کر دیا ہے۔

یہ تمام تعلقات کب اجازت دے سکتے تھے کہ سید صاحب اپنا لشکر لے کر گذر جائیں اور گوالیار کی سرزمین اُن کے سایہ سے محروم پڑی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب ڈلمئو، فتح پور، بھوا، دوسر منڈ، جلال پور، ایک ایک دو دو روز قیام کرتے ہوئے گوالیار پہنچے۔ جہاں آپ کو فتح علی خاں کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ مہاراجہ کی طرف سے مہمانداری کا پورا انتظام تھا۔ کئی مرتبہ راجہ ہندو راؤ نے دعوتیں کیں۔ ایک دعوت کی تفصیل راویوں نے یوں بیان کی ہے کہ:

> مرہٹی کھانا بھی پکوایا۔ شیرمال، پراٹھے، پلاؤ متنجن، کلیہ، فرنی، یاقوتی کباب پسندے، مرغ بریاں وغیرہ بھی تیار کرائے۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو ۱۲۴۱ صحیح تاریخ نکل آئے گی۔ ؎ اس موقع پر وہ سطور دوبارہ ملاحظہ فرمائیے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے خاتمے کے زیرِ عنوان تحریر کی گئی ہیں۔

Marfat.com

ساتھیوں کے ہاتھ راجہ ہندو راؤ نے خود دھلوائے۔ کھانے کے بعد جو پان پیش کئے گئے وہ سب ورق طلاء میں ملفوف تھے۔ بہت سے تحائف خوانوں میں لگا کر نذر کے لئے لائے گئے۔ اُن میں موتیوں کا بیش بہا ہار اور ایک چُغہ بھی تھا۔ جس پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔[1]

مہاراجہ سے ملاقات دولت راؤ خود حاضر نہ ہو سکا۔ معذوری کو دستاویز بنا کر سید صاحب کو محل میں بُلایا۔ جو سید صاحب کے ساتھ تھے اُن کو محل کے ایک بڑے کمرہ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ہندو راؤ سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آپ کو مہاراجہ کے کمرے میں لے گیا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوئیں۔ جن کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔[2]

مہارانی پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے عرض کیا کہ آپ ایک سال گوالیار میں قیام فرمائیں۔ آپ کے تمام ساتھیوں کی مہمان داری ہمارے ذمہ ہوگی۔ سید صاحب نے معذرت کی۔ پھر مہارانی نے کہا کہ اچھا اتنی مدت ٹھہر جایئے کہ آپ کے لشکر کے لئے پورا سامان مہیا کیا جا سکے۔ سید صاحب نے اس سے بھی معذرت کر دی۔ اسی اثنار میں نماز عصر کا وقت آگیا۔ شیخ باقر علی نے اذان کہی۔ ہندو راؤ کے حکم سے فوراً سقے آگئے۔ سب نمازیوں کو وضو کرایا۔ سید صاحب نے نماز پڑھائی۔ پھر مہاراجہ سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

غازیوں کی جماعتیں غازیوں کی سرسری جماعت بندی روانگی سے پیشتر رائے بریلی میں ہو چکی تھی۔ گوالیار پہنچ کر اُن کی باقاعدہ تنظیم ہوئی۔ تمام غازیوں کو "ترتیبِ لشکر" کے اصول پر پانچ جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) جماعت خاص۔ جس کے کمانڈر (سرعسکر) مولانا محمد یوسف صاحب پُھلتی تھے یہ جماعت قلب لشکر سمجھی جاتی تھی۔ خود سید صاحب اسی جماعت کے ساتھ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔

---

[1] سید احمد شہید ص ۲۸۸۔ [2] ایضاً۔ [3] یہ ملاقات فروری ۱۸۲۶ء میں ہوئی تھی۔ سید صاحب نے اپنے مرکز (سرحد) پہنچ کر پوری طرح اپنا نظام قائم بھی نہیں کیا تھا کہ مارچ ۱۸۲۶ء میں دولت راؤ سندھیا کا انتقال ہوگیا۔ اسی لئے سید صاحب کے خطوط اس کے نسبتی بھائی کے نام آئے جو بعد میں تحریر ہوں گے۔

Marfat.com

(۲) مقدمۃ الجیش جس کے کمانڈر حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید تھے۔

(۳) میسرہ۔ اس کے سر عسکر سیّد صاحب کے بھتیجے سیّد محمد یعقوب تھے۔ اور جب وہ کار خاص پر ٹونک تشریف لے گئے تو نیابۃً شیخ بدھن کو سر عسکر بنایا گیا۔

(۴) میمنہ۔ سر عسکر امجد خاں صاحب رئیس گتنہ۔

(۵) ساقۃ الجیش۔ سر عسکر اللہ بخش صاحب موراتوی۔

سیّد صاحب نے گوالیار میں دو جمعہ ادا کئے۔ یعنی کم از کم دس روز قیام فرمایا۔ پھر قرولی پہنچے جہاں کسمنڈی کے رئیس جلال الدین صاحب نے باصرار آپ کو ایک رات کے لئے ٹھہرا لیا اور پورے لشکر کو کھانا کھلایا۔ پھر "خوش حال گڈھ" دانتولی، ٹنڈاری، جیلانی ہوتے ہوئے آپ نے ٹونک میں ورود فرمایا۔

قیامِ ٹونک کی تفصیلات کا ذکر بے محل ہے۔ البتہ یہ بات خاص قابلِ توجہ ہے، کہ مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ روانگی کے وقت سیّد صاحب سے یہ اقرار لے لیا گیا تھا کہ اگر ضرورت پیش آنے پر نواب امیر علی خاں کو اطلاع نہ دی گئی تو یگانگی کا معاملہ باقی نہ رہے گا۔

ٹونک سے نکل کر دریائے بیاس کو عبور کیا اور رکلو میں منزل ہوئی۔ پھر جیلانہ میں ٹھہرے۔ "وصایا" سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کے وقت نواب امیر علی خاں اور نواب وزیر الدولہ چار کوس تک ساتھ گئے۔

ٹونک سے اجمیر ہوتے ہوئے پالی پہنچے۔ یہاں چار روز قیام فرمایا۔ ۱۵، ۱۶ر رمضان کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ یہ دُور افتادہ علاقہ جو آج نشر و اشاعت ریڈیو اور اخبارات کے زمانہ میں بھی پس ماندہ اور دنیا سے بے خبر مانا جاتا ہے، وہ اس تحریک سے آشنا باخبر تھا کہ دُور و نزدیک کے ہزاروں مردوں اور عورتوں نے بیعت کی تقریباً ایک سو آدمی روزے کی حالت میں گھروں سے چل پڑے کہ پالی پہنچ کر بیعت کرلیں۔ سیّد صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے اگلی منزل پر پہنچ کر بیعت کی۔ اس سے

Marfat.com

بھی زیادہ تعجب انگیز واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک بڑھیا اپنے گاؤں سے لمبی مسافت طے کرکے پالی پہنچی۔ سید صاحب نہ ملے تو اپنے نواسے کو ساتھ لے کر پیچھے روانہ ہوگئی۔ کٹھیا گڑھ پہنچ کر بیعت کی، اور پچاس روپے لشکر کی دعوت کے لئے پیش کئے۔"[1]

منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے پالی سے آپ حیدر آباد سندھ پہنچے۔ جہاں امیرانِ سندھ کی جانب سے سید صبغۃ اللہ[2] ولایتی نے آپ کا استقبال کیا۔ دو جمعے حیدر آباد میں گذارے۔ حکّام سندھ کی درخواست پر جمعہ کی نمازیں قلعہ میں ادا کیں۔ وہ زیادہ ٹھہرانا چاہتے تھے مگر سردیوں کا موسم قریب آ رہا تھا۔ موسم سرما میں برف باری کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے تھے۔ اس لئے آپ نے زیادہ قیام سے معذرت فرمائی۔ جب روانگی طے ہوگئی تو:

"ایک ہزار روپیہ نقد، ایک بندوق اور طپنچوں کی ایک جوڑی نذر پیش کی گئی۔"[3]

حیدر آباد سندھ سے پیر کوٹ، پھر شکار پور پہنچے۔ یہاں سید صاحب نے غازیوں کو گاڑھے کے کپڑے بنوا دیئے۔ یعنی اس پاکباز لشکر کی فوجی وردی تیار کرا دی جس میں اس وقت کے تاجدارانِ علم و فضل اور بڑے بڑے دولت مند گھرانوں کے چشم و چراغ شریک تھے۔ شکار پور سے روانہ ہو کر جاگن، خان گڑھ اور بھاگ وغیرہ سے گذر کر ڈھادر پہنچے

---

[1] سید احمد شہید ص ۲۹۴۔ [2] یہی سید صبغۃ اللہ ہیں جنہوں نے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی جو "حُر" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کے سربراہ کو "پیر پگاڑو" کہا جاتا تھا۔ جس کو تقریباً سو سال بعد ۱۹۴۴،۴۳ء میں انگریزوں نے فوجی طاقت سے کچل ڈالا۔ اس وقت کے سربراہ اور امیر (جن کا نام یہی صبغۃ اللہ تھا اور اسی بناء پر آپ کو صبغۃ اللہ شاہ ثانی کہا جاتا تھا) کو پھانسی دی گئی۔ تمام جائداد منقولہ اور غیر منقولہ جس میں کئی من سونا بھی تھا ضبط کیا گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے سید احمد شہید ص ۳۰۲ و ص ۳۰۸ تا ص ۳۱۰۔ [3] ایضاً ص ۲۹۸۔

Marfat.com

جہاں سے درہ بولان شروع ہوتا ہے۔ درہ کی کٹھن اور دشوار گزار منزلیں طے کرتے ہوئے کوئٹہ پہنچے۔ جہاں کے حاکم نے آپ کی بہت مدارات کی۔ روزانہ پُر تکلف کھانے اور میوے بھیجتا رہا۔ بیعت بھی کی، اور ساتھ چلنے کے لئے تیار بھی ہو گیا۔ مگر سیّد صاحب نے مصلحتاً منع فرما دیا۔

کوئٹہ سے آپ قندھار، پھر غزنی اور کابل سے گذرتے ہوئے پشاور پہنچے تین روز پشاور میں قیام فرما کر آپ "چارسدے" پہنچے۔ جہاں اُس مقصد کے لئے آپ نے قیام فرمایا، جس کی تکمیل کے لئے تقریباً دس ماہ پہلے آپ نے وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھا تھا[1]۔ اس سفر میں بعد کے آنے والوں کے لئے بھی قیام وغیرہ کے انتظامات مکمل کر دیئے گئے۔

بہار اور بنگال کا رہنے والا اس علاقہ میں قطعاً اجنبی بھی تھا اور اُس پر ہر قسم کا شک وشبہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ایسے انتظامات بھی کر دیئے گئے کہ اس کو راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ہر جگہ آدمی مقرر کر دیئے گئے کہ شُبہ سے اُس کو محفوظ رکھیں۔ جب تک اُس کا قیام ہو، اُس کی ضروریات فراہم کریں اور جب روانہ ہونے لگے تو اگلی منزل تک حفاظت سے پہنچنے کا بندوبست کریں۔

ایک مکتوب کی قلمی نقل[2] جو شیخ غلام علی صاحب الٰہ آبادیؒ کے نام حاجی صابر علی صاحب کے ذریعہ بھیجا گیا تھا، اس میں راستہ کی منزلوں کے متعلق یہ ہدایت ہے :

"ہر کہ خواہد کہ بلشکر سیّد احمد رسد، ہمیں منازلہا اختیار کند انشاء اللہ تعالیٰ بآرام تمام خواہد رسید۔

اوّل منزل قصبہ ٹونک۔ مالپورہ ۱۲۔ بھمبولہ ۹۔ کشن گڈھ ۹۔ اجمیر ۸۔ رپان ۱۴۔ میرٹھ ۸۔
کھجوانہ ۱۰۔ ناگور ۱۰۔ علی ۷۔ از بکوشش بہ مکان چوبدار ۱۰۔ بسنوکہ ۹۔ بیکانیر بر مکان ۸

---

[1] منزلوں کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔ سیّد احمد شہید مصنفہ غلام رسول مہر۔ [2] یہ سیّد محمد جعفری صاحب ناظر سُنّی مجلس اوقاف دہلی کے ذاتی کتب خانہ سے حاصل ہوئی ہے۔

Marfat.com

دیپار بخش۔ کاناسر و جلال سر۔ کیلتی۔ چھتر گڈھ۔ ویسیلی۔ بھوکرہ بمکان الٰہی بخش
۱۲ ۹ ۸ ۸ ۸
امیرگڈھ بمسجد۔ مرڈہ۔ جام سر۔ خیرپور۔ بہاول پور۔ ازانجا ڈیرہ غازی خاں۔
۸ ۸ غلہ بدست نمی آید ۵ ۱۲ ۴ منزل
ازانجا معلوم خواہد شد۔

نیچے لکھے ہوئے ہندسے کچھ اشارے ہیں جو واضح نہیں ہوسکے۔ ممکن ہے منزلوں کی تعداد مراد ہو۔ جیسا کہ ڈیرہ غازی خاں کے نیچے جو ہندسہ ہے وہاں منزل لکھ بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح ٹونک سے لشکر گاہ تک پہنچنے میں تقریباً پونے سات مہینے صرف ہوتے تھے۔ ٹونک سے پہلے دہلی کی منزل تھی اور ان منزلوں کا تذکرہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ یہ جو وطنِ عزیز سے دہلی یا ٹونک پہنچنے تک ہوتی تھیں۔

عارضی حکومت قافلہ نے جیسے ہی اس آزاد مرکز میں پڑاو ڈالا سکھوں کی فوجوں سے تصادم شروع ہوگیا۔ اب ہنگامی حالات میں ضبط و نظم قائم رکھنے نیز مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالنے کے لئے باقاعدہ نظامِ حکومت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ للہٰذا ۱۰ر جنوری ۱۸۲۷ء (۱۲ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ) میں عارضی حکومت قائم کی گئی۔

سول اور فوج کے محکمے اور عدل و انصاف کے لئے باقاعدہ حکومت قائم کی گئی۔ ایک اور محکمہ قائم کیا گیا جو ایسی حکومت کے لئے سب محکموں سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔ جو اخلاقی اصلاح کو بھی بنیادی مقصد کی حیثیت دیتی ہو۔ یہ محکمہ احتساب ہے۔ یعنی اخلاقی نگرانی کا محکمہ۔

سید احمد صاحب اس حکومت کے "امیر" سربراہ قرار دیئے گئے۔ ساتھیوں نے باضابطہ امیر کے سامنے وفاداری کا حلف اٹھایا[1] (بیعت کی)۔ قافلہ والوں کے علاوہ اس علاقہ کے پٹھانوں نے بھی وفاداری کا عہد و پیمان کیا۔

---

[1] اس بیعت کی حیثیت کیا تھی۔ یہ بیعتِ جہاد تھی یا بیعتِ امارت۔ اس بحث سے غلام رسول صاحب مہر کو دلچسپی ہے للہٰذا ان کی کتاب میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حکومت کی قسم کا ایک نظام ۱۰ر جنوری ۱۸۲۷ء سے قائم کر دیا گیا۔ محمدؐ میاں

Marfat.com

آزاد حکومت کے سفیر اور آرگنائزر ایران و افغانستان | آرگنائزروں اور داعیان کا تقرر

کے قبائل میں پہنچے اور ہندوستان جو مالی اور فوجی امداد کا مرکز تھا، یہاں بھی آپ کے آرگنائزر پھیل گئے۔ حیدرآباد دکن اور مدراس کا علاقہ اب تک چھوٹا ہوا تھا۔ وہاں جماعت کے بلند پایہ رُکن اور سرگرم مبلغ مولانا سید محمد علی صاحب رام پوری کو بھیجا گیا۔ اُن کے ساتھ تین آدمی مقرر کئے گئے۔ عنایت اللہ خاں۔ عبداللہ اور مقیم خاں۔ اُن کا ایک فرض یہ بھی قرار دیا گیا تھا کہ غازیوں کے لئے ہندوستان سے سرحد پہنچنے تک کے مناسب راستے کا انتظام کردیں جس میں کسی منزل پر رکاوٹ پیش نہ آئے۔[1]

(۲) کچھ دنوں بعد مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کو حیدرآباد کے لئے مقرر فرمایا۔ اور مولانا سید محمد علی صاحب کو مدراس پہنچنے کا حکم ہوا۔ جہاں اُن کے تبلیغی اور اصلاحی کارناموں نے ایک انقلاب برپا کیا۔ مولانا ولایت علی صاحب کو جب حیدرآباد پہنچنے کا حکم ہوا، تو یہ جدائی اُن کو گوارا نہ تھی۔ سید صاحب نے تسکین دیتے ہوئے فرمایا۔ مولانا ہم آپ کو تخم کرکے اُٹھاتے ہیں۔[2]

چنانچہ یہی تخم تھا جو سید صاحب کی شہادت کے بعد اس عظیم الشان تحریک کا تناور درخت بن کر نمودار ہوا۔ جس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی (انشاءاللہ) اُن کے ساتھ بھی تین آدمی بھیجے گئے۔ عبدالقادر۔ عبدالواحد اور کرامت اللہ۔

(۳) مولانا عنایت علی صاحب عظیم آبادی کو بنگال۔

(۴) مولانا محمد قاسم صاحب پانی پتی کو بمبئی۔

(۵) مولانا سید اولاد حسن صاحب قنوجی (نواب صدیق حسن صاحب والیٔ بھوپال کے والد ماجد) اور سید حمیدالدین صاحب (خواہرزادہ سید صاحب) یوپی کے مختلف حصوں میں تبلیغ و تنظیم کے لئے بھیجے گئے۔

---

[1] سطور بالا میں جو مقامات پیش کئے گئے ہیں غالباً وہ مولانا سید محمد علی صاحب نے اس دورے کے بعد متقرر فرمائے ہیں۔ [2] سوانح احمدی وغیرہ۔

Marfat.com

(۶) میاں دین محمد اور میاں پیر محمد نیز متعدد دوسرے اصحاب کا کام تھا، کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں خطوط پہنچاتے اور وہاں سے روپیہ لاتے رہیں یہ انتظامات سیّد صاحب کے زیر قیادت جنگی محاذ سے متعلق تھے۔ اور

(۷) شاہ اسحاق صاحب (جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) کی زیر سرپرستی دہلی کے مرکز سے ہر قسم کی امداد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ امداد پہنچانے کا راستہ غالبًا وہی تھا جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے۔

اس حکومت کی مقبولیت اور عوام کے رجحانات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابھی اس آزاد حکومت کو قائم ہوئے چند ہفتے گذرے تھے کہ جنگ سیدو کے مقام پر (جہاں سیّد صاحب کو زہر دیا گیا تھا) آپ کے ساتھ مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی[1]

عارضی حکومت کا مقصد

سیّد صاحب نے اگرچہ اس آزاد حکومت کی سربراہ کاری اور "امارت" منظور کر لی تھی مگر آپ نے پہلے واضح کر دیا تھا کہ اُن کو نہ حکومت و قیادت (لیڈری) کا شوق ہے اور نہ وہ "مالکِ ملک" بننا چاہتے ہیں۔ یہ سارا دھندا صرف اس لئے ہے کہ اجنبی اقتدار ختم ہو اور حق حقداروں کو مل جائے۔ چنانچہ آپ نے سلطان ہرات، والیٔ کابل، شاہِ بخارا، رئیس قلات، آزاد قبائل کے سرداروں، ہندوستان کے سربرآوردہ عمائدین علماء بعض فرماں رواؤں اور سکھ حکومت کے ذمّہ داروں کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے:

"خدا گواہ ہے ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں۔ نہ بندگانِ خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔

---

[1] سوانح احمدی و وقائع وغیرہ

Marfat.com

ہمارا منشاء وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس۔ اور یہ اس لئے کہ تقاضائے مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ متصوّر ہے[1]

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

سیّد صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی، اس سے آپ کو غرض نہیں۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں، وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرحد سے ریاست گوالیار[2] کے مدارالمہام اور مہاراج دولت راؤ سندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

بر رائے عالی روشن و مبرہن است کہ	جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور
بیگانگاں بعید الوطن ملوکِ زمین و زماں	اجنبی جو وطنِ عزیز سے بہت دُور کے رہنے
گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ	والے ہیں دنیاجہاں کے بادشاہ بن گئے

---

[1] مکتوب سید صاحب بنام شاہِ بخارا و مکتوب بنام سردار بدھ سنگھ جنرل افواج مہاراجہ رنجیت سنگھ

[2] غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کا مارچ ۱۸۲۷ء میں انتقال ہو چکا ہے اور کمپنی کے ایجنٹ ایک گیارہ سالہ لڑکے موکب راؤ ملقب بہ "عالیجاہ مھنگوجی راؤ سندھیا کو زبردستی متبنّیٰ قرار دے کر گدی پر بٹھا چکے ہیں اور اب اختیارات کے بارہ میں کمپنی کے کارپردازان اور مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی بیوہ "بیرا بائی" کے درمیان کش مکش جاری ہے جس کے نتیجہ میں بیرا بائی کو گوالیار سے جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ غریب ہندو راؤ کیا کر سکتا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد نامہ جات سرکار کمپنی انگریز بہادر حصّہ دوم جلد چہارم ریاست سندھیا۔

سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسار عالی مقدار برباد نمودہ اند وعزّت واعتبارِ ایشاں بالکل ربودہ۔

ہیں اور سودا بیچنے والے دوکاندار بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بلند مرتبہ روساء کی ریاست کو برباد کر دیا ہے اور اُن کی عزّت اور اُن کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے۔

چوں اہلِ ریاست و سیاست در زاویۂ خمول نشستہ اند ناچار چندے از اہلِ فقر و مسکنت کمرِ ہمّت بستہ ایں جماعتِ ضعفار ہرگز از دنیا داران جاہ طلب نیستند محض بنا بر خدمتِ دینِ ربِ ذوالجلال برخاستہ اند، نہ بنا بر طمعِ مال و منال۔

چونکہ وہ لوگ جو ریاست و سیاست کے مالک تھے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ گئے ہیں ناچار چند بے سروسامان فقیر کمرِ ہمّت کس کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کیلئے کھڑی ہو گئی ہے یہ لوگ جاہ طلب دنیادار نہیں ہیں بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کیلئے اُٹھے ہیں مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔

وقتے کہ میدانِ ہندوستان از بیگانگاں دشمناں خالی گردیدہ، و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبین آں مسلّم باد بیخ شوکت و سطوتِ ایشاں محکم شود۔ ایں ضعفار را از روسار کبار و عظمار عالی مقدار

جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا حکومت کے عہدے اور منصب اُن کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انہیں کی شوکت و عظمت کی جڑیں مضبوط کی جائینگی ہم کمزوروں کو بڑے بڑے روساء اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار

Marfat.com

ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمتِ	ہے کہ اہلِ اسلام کو اُن کا دلی تعاون
اسلام بجان و دل کنند و بر مسندِ	حاصل رہے۔ اور مسندِ حکومت اُن کو
مملکت خود متمکن شوند۔	مبارک ہو۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو تحریر فرماتے ہیں :

دریں صورت مناسب وقت	اس صورت میں مناسب وقت یہی
چناں مے نماید کہ ریاست پیرار	معلوم ہوتا ہے کہ آپ سردار والاقدر
سیاست آرار، عظمت نشان	راجہ ہندو رائے کو یہ بات سمجھائیں کہ
راجہ ہندو رائے را ایں معنے	ہندوستان کا بہت بڑا حصّہ غیر ملکیوں
بفہمانند کہ اکثر بلاد ہندوستان	کے قبضہ میں پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں
بدست بیگانگاں افتادہ و	نے ہر جگہ ظلم و جبر کی بنیاد قائم کر
ایشاں ہر جار بنیادِ ظلم وجور	دی ہے۔ روسار ہند کی ریاست
نہادہ ریاست روسار ہندوستان	برباد ہوگئی ہے۔ کوئی شخص مقابلہ
برباد رفتہ، کسے تابِ مقاومت	کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر
ایشاں نمے دارد۔ بلکہ ہر کس	شخص اُن کو اپنا آقا تصوّر کرتا
ایشاں را آقار خود مے شمارد۔	ہے۔
وچوں رؤسار کبار از مقابلہ	چونکہ بڑے بڑے صاحب ریاست
ایشاں نشستند لاچار چند	اُن کے مقابلہ کا خیال ترک کر کے
کس از ضعفار بے مقدار کمر	بیٹھ گئے ہیں۔ ناچار چند کمزور ناچیز
بستند۔ پس دریں صورت	کمر ہمّت کس کر کھڑے ہوئے ہیں۔
رؤسار عالی مقدار را لازم چنانکہ	پس اس صورت میں روسار
بر مسندِ ریاست سالہا متمکن	عالی مرتبت پر لازم ہے کہ جس طرح
ماندہ اند بالفعل در اعانتِ ضعفار	وہ سالہا سال مسندِ حکومت پہ متمکن

Marfat.com

مذکو دین مساعی بلیغہ بجا آرند کہ آں را باعث استحکام بنیانِ ریاست خود شمارند[1]
رہے ہیں فی الحال ان کمزور رفقاء کاروں کی امداد میں پوری پوری کوشش کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں۔

یہ افسوناک حقیقت ہے کہ یہ عارضی حکومت، اصل حکومت کی حیثیت اختیار نہ کر سکی۔ اگر اس کا موقع ملتا تو یہ تصوّر تو بہت ہی غلط ہے کہ ملوکیّت کی لعنت دوبارہ زندہ کی جاتی۔ البتہ یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ شاہ ولی اللہ کی پارٹی، شاہ صاحب کے اصول پر ہی حکومت قائم کرتی۔ شاہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب "البدور البازغۃ"[2] میں ترقی پذیر متمدّن حکومت کے تقاضوں اور مطالبوں کا تجزیہ کر کے اس کی بنیادی ضرورتوں کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر وہ رنگ و نسل، خاندان یا فرقہ کے امتیاز سے بالا ہو کر ایسے ماہر تلاش کرتے ہیں جو اپنی صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے ایک ایک شعبہ کے ذمّہ دار ہو سکیں۔ پھر صدارت یا وزارتِ عظمٰی کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس میں ان تمام شعبوں کی نگرانی کی بہترین صلاحیت موجود ہو۔ ایسا جامع شخص ہی "الامام الحق" (صحیح لیڈر، سچا رہنما) ہوگا۔ یہ "الامام الحق" ڈکٹیٹر بھی بن سکتا ہے مگر ایسا جامع اور کامل شخص عنقا ہے۔ بہت ہی مشکل سے ملتا ہے بلکہ نہیں ملتا۔ لہٰذا ممکن العمل متبادل صورت یہ تجویز کرتے ہیں کہ:

چند اربابِ دانش، صاحبِ تجربہ، ماہرین، اور یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر عوام کی مقبول اور منتخب جماعت (پارلیمنٹ اور کیبنٹ) حکومت کی ذمّہ دار ہوگی۔[3]

---

[1] مجموعۂ خطوط قلمی ص۱۴ بحوالہ کتاب مسلمانوں کے تنزّل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا ص۲۷۲ تا ص۲۷۶۔
[2] ص۱۷ تا ص۲۳ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۴ھ شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل۔ [3] البدور البازغہ ص۷۳۔
حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں "ہم
(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

عارضی حکومت کی آزاد فوج کا کردار

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رُوحِ جہاد دوسروں کو فنا کرنا نہیں بلکہ ایک مجاہد کے حق میں جہاد کی رُوح یہ ہے کہ وہ خود اپنی انانیت کو فنا کردے۔ حق اور اعلاء کلمۃ الحق کے مقابلہ میں وہ اپنی تمام تمنائیں، تمام آرزوئیں، تمام جذبات اور جملہ مفادات ختم کر چکا ہو۔ وہ ایک آلہ کی حیثیت میں ہو۔ تقاضائے حق محرک ہو اور یہ اُس کے اشاروں پر رقصِ بسمل کر رہا ہو۔

ایک مجاہد کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جس حق و صداقت کے لئے وُہ اُٹھا ہے، سب کچھ یہاں تک کہ جانِ عزیز کو بھی اُس پر قربان کردے۔

یہ جذبہ فدائیت دل کی گہرائیوں سے اُچھل کر زبان پر آجاتا تھا جبکہ سید صاحب اکثر عالمِ شوق میں یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

اے آنکہ زنی دم از محبت ‌ ‌ ‌ ‌ از ہستیِ خویشتن بہ پرہیز
بر خیـــز و بر تیغِ تیز بنشیں ‌ ‌ ‌ ‌ یا از سرِ راہ دوست برخیز[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آج کی زبان میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

ایک حقیقی امام کا جو ڈکٹیٹر بن سکے پیدا ہونا آسان نہیں ہے۔ اس کے نہ ملنے پر حاکم بنانے کے لئے ان تین صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا پڑیگا۔ ۱: ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ ۲: اگر محدود سوسائٹی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ اپنے تسلیم کردہ قانون پر اپنے تسلیم کردہ رئیس کی اطاعت میں قومی قانون کی پابندی کریگا یعنی سوسائٹی کو حکومت بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ان میں اس قسم کے اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتے جو امام بنانے کیلئے مجبور کردیں۔ ۳: یا عقلمندوں یا عوام کے مقبول لوگوں کا اجتماع ہوگا یعنی پارلیمنٹ بن جائے گی (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۵۱ و ص۱۵۲)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سید صاحب اسی مفہوم کو اپنے ایک مکتوب میں ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں۔ "بندہ کہ در مقابلہ اعداء مولائے خود غیرت و حمیت نمے دارد فی الحقیقت بندہ نیست و محبیکہ

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ان مجاہدین پاک طینت میں یہ رُوح کس طرح کارفرما تھی۔ اس کے موازنہ کیلئے چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

○ "اکوڑہ" پر شبخون کے لئے مجاہدین کی فہرست تیار کی جارہی تھی۔ عبدالمجید خاں آفریدی ساکن جہان آباد ضلع رائے بریلی اس لئے فہرست میں شامل نہیں کئے گئے کہ بخار میں مبتلا تھے۔ عبدالمجید خاں صاحب کو خبر ملی تو بے تاب ہو کر سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گریہ وزاری کے ساتھ عرض کرنے لگے۔ حضرت! میں ایسا بیمار تو نہیں ہوں کہ چل نہ سکوں۔ یہ اللہ کے نام پر پہلا معرکہ ہے۔ کیا میں سبقت کی فضیلت سے محروم رہ جاؤں گا؟ سیّد صاحب نے جذبۂ ایثار کی یہ بے تابی دیکھی تو فہرست میں نام شامل کر دیا۔ اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہمّت میں برکت دے۔ پھر ایسا اتفاق ہُوا کہ اسی شبخون میں یہ شہید بھی ہو گئے لیکن اس طرح کہ چودہ سپاہیوں کو ختم کرنے کے بعد اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ نرغہ میں گھر کر زخموں سے چُور ہوئے اور جامِ شہادت سے شوق و ذوق کی تشنہ لبی کو سیراب کیا۔[1]

جنگ پنجتار کے موقع پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بقول راوی:

تمام بھائی کمال تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے سے گلے مل مل کر خطائیں معاف کرا رہے ہیں۔ دنیاوی تعلّقات کا ہر ایک نقش اُن کے صفحاتِ دل سے مٹ چکا ہے۔ ایک دوسرے کو وصیّت کر رہے ہیں، مگر یہ نہیں کہ ہمارے اہل وعیال کا خیال رکھنا یا جائدادوں کو سنبھالنا یا رشتہ داروں کو سلام پہنچانا یا یادگاریں قائم کرنا۔ حاشا ثم حاشا۔

یہ پاک باز رضائے مولا میں کچھ اس طرح گُم ہیں کہ گویا اس دنیا کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جان و مال و عزّت و آبروئے خود را در تحصیل رضاء محبوب خود نگاہ دارد فی الحقیقت محبوب نے۔ (مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل صاحب قلمی نسخہ ص۱۰۹ بحوالہ جماعت مجاہدین ص۷۱) ۲۔ سیّد احمد شہید ص۲۴۸۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سیّد احمد شہید ص۳۵۱ و ص۳۵۷

Marfat.com

اُن کا کوئی رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ سب کی زبانوں پر صرف ایک وصیت اور صرف ایک پیام ہے اور وہ یہ کہ بھائیو ہم شہید ہو جائیں یا زخموں سے چُور ہو کر گر پڑیں، ہمیں اٹھانے یا سنبھالنے سے بے پروا ہو کر فرصت و مہلت کے ہر ایک لمحہ کو صرف آگے بڑھنے میں صرف کرو۔ کامیابی کی یہی ایک صورت ہے[1]

دیوبند کے مجاہدین میں شیخ بلند بخت اور اُن کے بھائی محمد علی صاحب بھی تھے۔ ایک معرکہ میں بھائی شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت صاحب کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا۔ الحمد للہ جو مراد لے کر آئے تھے وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے[2]

اسی طرح ایک صاحب کا تذکرہ ہے کہ زخمی ہو کر گرے تو بے اختیار زبان سے نکلا فزت برب الكعبة۔ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

صبر و استقامت جنگ شیدو میں شکست کے بعد منتشر شدہ غازی مقام چنگلئی میں جہاں سید صاحب کو بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیا گیا تھا، جمع ہوئے تو آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مجاہد بیمار پڑ گئے اور روزانہ ایک ایک دو دو وفات پانے لگے۔ دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی۔ سینکڑوں میں صرف چھ سات تندرست تھے۔ وہ رات دن تیمار داری میں مصروف۔

سید رستم علی جل گانوی، اکوڑے میں زخمی ہوئے۔ دو ڈھائی مہینے نوشہرے میں صاحبِ فراش رہے۔ چنگلئی پہنچنے پر اُن کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی، کہ تنہا چالیس بیماروں کا بوجھ اُٹھالیا اور اس خوبی سے خدمت کی کہ کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی۔

اس پر عسرت کا یہ عالم کہ ہر شخص کو روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی۔ تندرست

---

[1] سید احمد شہید ص۹۸ ۔ [2] ایضاً ص۱۷۱

غازی اُسے پیس کر روٹیاں پکاتے اور بیماروں کے لئے پانی میں اُبال کر آش بنا دیتے۔ لیکن عُسرت اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ جلد ہی وہ وقت آگیا کہ مُٹھی بھر جوار بھی میسّر نہ آسکی تو یہ لوگ باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں یا ایسے پتے تلاش کرتے، جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوں اور پانی میں جوش دینے سے گل جائیں۔ انہی چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں اُبالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے اور بیماروں کو بھی کھلا دیتے۔ اسی طرح ایک بُوٹی تھی جس کو پیس کر پانی میں پکاتے اور نمک ڈال کر مریضوں کو پلا دیتے۔

ان سختیوں اور مصیبتوں کے باوجود خوبی یہ تھی کہ راضی برضا تھے اور قدم جادۂ استقلال پر اسی طرح محکم واستوار تھے کہ گویا پہاڑ کی چٹانیں ہیں جن میں جنبش کا امکان نہیں۔

به درد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است[1]

اس حالت میں جن کی وفات ہوئی، اُن کے کفن کے لئے کپڑا میسّر نہیں تھا۔ اگر اُن کے پاس چادریں ہوتیں تو انہیں کا کفن بنا دیا جاتا۔ ورنہ جاجم کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اس کام میں لاتے۔[2]

امانت و دیانت اور جماعتی خیر خواہی کی سبق آموز مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

اسی شبخون کا واقعہ ہے کہ سکھ پہرے دار نے تکبیر کی آواز سُنتے ہی بندوق سر کی۔ گولی مولانا باقر علی صاحب عظیم آبادی کے لگی۔ زخم کاری تھا۔ وہ بیٹھ گئے اور بولے:

بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ یہ ہتھیار لو۔ یہ اللہ کا مال ہے —— ان الفاظ کے ساتھ ہی اُن کی رُوح پرواز کر گئی۔[3]

عارضی حکومت کے جو محصولات مقرر کئے گئے تھے۔ اوّل تو اُن کی مقدار یہ تھی کہ پیداوار اگر ہو تو اُس کا دسواں حصّہ سرکاری محصول دیا جائے جس کو "عشر" کہا جاتا ہے۔ پھر اُس کی تحصیل کرنے والوں کا کردار یہ تھا کہ:

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۲۱۰ و ۴۱۱۔ [2] ایضاً صفحہ ۴۳۷۔ [3] صفحہ ۳۵۵ ج ۱۔

Marfat.com

"رسالدار عبدالمجید خاں کا دستور یہ تھا کہ دورے پر نکلتے تو ہر آبادی سے نصف میل پر ٹھہر جاتے اور گاؤں کے سرداروں کو باہر ہی بلا کر حالات پوچھ لیتے۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ ایک سوار نے موضع ڈاگئی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی۔ عبدالمجید خاں سخت ناراض ہوئے۔ گاؤں والوں نے کہا۔ یہ معمولی بات ہے لیکن رسالدار نے اس سوار سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ضابطہ کی پابندی کیجئے۔ ورنہ "امیرالمومنین" کے پاس چلے جایئے"۔

ایک مرتبہ دو سواروں نے کسی سے شکر مانگی۔ اُس نے جواب دیا کہ شکر تو نہیں گُڑ موجود ہے۔ سوار غصہ میں آگئے۔ رسالدار کو اس واقعہ کا علم ہُوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے[1]

دفتر کے محرّر بھی مجاہدین کا نمونہ تھے۔ اُن میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ میدان جنگ میں عام سپاہیوں کی طرح کام کرتے تھے۔ قلمدان چھُری کی طرح کمر میں لٹکا لیتے۔ جب لکھنے کی ضرورت ہوتی، بے توقف لکھنے لگتے۔

سردار پائندہ خاں کا منشی محمد غوث سردار کو چھوڑ کر سیّد صاحب کے پاس آ گیا تھا وہ منشی خانہ کے سامان کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سیّد جعفری صاحب نقوی کے پاس بڑا قلمدان اور ایک پُرانی قینچی تھی۔ منشی محمد غوث نے کہا کہ مَیں آپ کو نیا چاقو اور نیا قلمدان لا دوں۔ سیّد جعفر علی نقوی نے فرمایا۔ مجھے آپ کے چاقو کی ضرورت نہیں۔ آپ دین کی خدمت کیجئے، مجھے اس سے مسرّت ہوگی۔ مجھے دنیادار حکومتوں کے کارکنوں کی طرح نہ سمجھئے۔ یہاں جاروب کش اور افسر یکساں ہے۔ اخلاص کامل کی ضرورت ہے۔ جب اس قلمدان اور اس پُرانی قینچی سے کام چل رہا ہے اور دوسروں کا چاقو لے کر قلم بھی بنایا جا سکتا ہے تو مجھے کسی چیز کی کیا ضرورت ہے[2]

---

[1] جماعت المجاہدین صہ۴۲ ۔ [2] منظورہ بحوالہ سیّد احمد شہید صہ۵

Marfat.com

فوجیں جب مارچ کرتی تھیں تو راستہ کے آس پاس کے کھیتوں کا تباہ کر دینا عام بات تھی۔ دیہات سے جو چاہتے لُوٹ لیا کرتے تھے۔ مگر سید صاحب کے لشکر نے پشاور پر حملہ کے وقت لانبا راستہ طے کیا۔ تو احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لوگ پکار اُٹھے:

ایں عجب لشکر ست با وجود آنکہ شش ہفت ہزار سوار و پیادہ نزول کردہ اند اما برکسے ظلمے نمودہ[1]۔

یہ عجیب لشکر ہے کہ اگرچہ چھ سات ہزار سوار و پیادے اُترے ہوئے ہیں مگر کسی پر ظلم نہیں۔

ایسے موقع پر جعلی سکّہ بنانے میں تو کوئی خرابی ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اگر کیمیا کے کسی نسخہ سے تانبا سونا بنا کر بیچا جائے تو اُس کو بھی ایک قسم کا دستِ غیب سمجھا جائے گا لیکن سیّد صاحب کی راست بازی اور دیانت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک صاحب عبدالغفار خاں پشاوری کو سکّہ بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اُس نے بار بار اجازت چاہی۔ آپ نے ہر دفعہ منع کر دیا۔ جب اصرار زیادہ کیا تو سیّد صاحب نے صاف فرما دیا۔ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو قلب سازی چھوڑ دو، ورنہ سکھوں کے علاقہ میں چلے جاؤ[2]۔

ہمدردی جب سَمّہ کے لوگوں نے غدّاری کی اور جہاں جو مجاہد تھا، اس کو شہید کرنا شروع کیا۔ تو حافظ عبدالعلی صاحب اور مولوی محمد رمضان صاحب شیوہ میں تھے۔ سیّد امیر علی صاحب بیت المال کا روپیہ لے کر پنجتار چلے گئے۔ حافظ عبدالعلی صاحب نے اس کو گاؤں سے باہر پہنچا دیا لیکن خود یہ کہہ کر لَوٹ آئے کہ مَیں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

مولوی محمد رمضان صاحب کو شیوہ کے رئیس اپنے یہاں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی گوارا نہیں کی، اور اُن کے ساتھ شہید ہوئے۔

مینئی میں جن مجاہدوں کو قاتلانہ حملہ کا ہدف بننا پڑا، اُن میں بنیر کا ایک نوجوان

---

[1] سیّد احمد شہید ص۸۸۔ [2] جماعتِ مجاہدین ص۸۹

Marfat.com

بھی تھا۔ بلوائی بار بار اُسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہماری قوم ہو۔ ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ اُس نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے، تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔

ایثار پہلے سید صاحب کی ہدایت ملاحظہ فرمایئے:

"مسلمانوں کو چاہیئے کہ لذیذ کھانوں، شیرینی یا قسم قسم کے لذیذ میووں وغیرہ کے سلسلہ میں جن کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے دوسروں کو اپنے اُوپر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ اس کے لئے جائز نہیں کہ حظوظ نفسانی میں دوسروں سے زیادہ حصہ لے جائے۔ بلکہ ایسے معاملات میں اپنے لئے کمی پسند کرنی چاہیئے۔ جب محنت و مشقت یا تکلیف کا موقع پیش آئے تو اپنے کو دوسروں سے آگے رکھے اور اُن پر تکلیف و بلا کا آنا پسند نہ کرے[1]۔

سید صاحب کی پوری زندگی اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے گذری تھی بچپن میں کام کا بڑا شوق تھا۔ صبح صبح ہر ایک کے یہاں ہو آتے کہ کوئی کام ہو تو کر دیں۔ جب تلاشِ روزگار میں گھر سے لکھنؤ جانے کے لئے نکلے تو ساتھیوں کے سامان کا بوجھ سمیٹ کر ایک گٹھر بنا اور سر پر رکھ لیا۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں اپنا کھانا ساتھیوں کو کھلاتے تھے پھر بچ جاتا تو نوش فرما لیتے۔ نواب امیر علی خاں کے لشکر میں رہے تو ساتھیوں کے کپڑے خود دھو کر لاتے۔ کوچ کرنے یا قیام کے موقع پر گھٹیا سے گھٹیا کام سید صاحب خود اپنے ذمے لیتے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کو سید صاحب نے ایک گھوڑا دے دیا تھا مگر شاہ اسمٰعیل صاحب نے اُس پر سواری کبھی گوارا نہیں کی۔ سفر میں وہ گھوڑا ساتھ جاتا تھا لیکن شاہ صاحب اس پر سوار

---

[1] مسلمان را مے باید کہ در مقامِ خواہشِ نفسانی و مشتہیات آں مثل طعام لذیذ و شیرینی و انواع فواکہ دیگراں را بر نفسِ خود تقدیم دہد و خود از انہا موخر شود و روا ندارد کہ زیادہ ازاں بر حظوظِ انسانی محظوظ گردد بلکہ دریں امر کمی بجانب خویش پسند نماید و در مقام رنج و تکلیف نفس خود را بر دیگراں مقدم سازد و آمدن بلا و تکلیف بر آنہا نہ پسندد (منظورہ صفحہ ۱۰۵۶ بحوالہ جماعت مجاہدین صفحہ ۲۷)۔

کسی دوسرے کو کرا دیتے اور خود پا پیادہ چلتے تھے۔

عفو و درگذر، بُرائی کے بدلہ میں بھلائی جنگِ سیدو کے نہایت نازک موقع پر سیّد صاحب کو زہر دینے کا واقعہ مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور قانونی غرض ہر لحاظ سے بے حد شرمناک اور نہایت سنگین ہے۔ زہر دینے والوں کو جو بھی سزا دی جاتی، بجا تھی۔ لیکن سیّد صاحب کا عفو و اغماض اور آپ کی شانِ درگذر ان سب سے بالا تھی۔ چنانچہ نذر محمد اور ولی محمد جو یار محمد خاں کے خانساماں تھے اور وہی کھانا لانے پر مامور تھے۔ جب ایک موقع پر مجاہدین نے اُن کو گرفتار کرکے سزا دینی چاہی تو چونکہ اس کا تعلق سیّد صاحب کی ذات سے تھا آپ نے حکماً رہا کرا دیا۔ وہ وطن جا رہے تھے۔ راستہ میں پٹھانوں نے دوبارہ گرفتار کر لیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک جھونپڑے میں ڈال دیا کہ اُن کا سردار آ جائے تو اِن کا سر قلم کرکے دل ٹھنڈا کریں۔

اتّفاق سے سیّد صاحب کا گذر اس طرف سے ہوا تو سیّد صاحب کو بھی خبر کر دی کہ جنھوں نے آپ کو زہر دیا تھا۔ ہم نے اُنھیں پکڑ لیا ہے اور اپنے خان کو بُلایا ہے تاکہ اُنھیں سزا دے۔ اسی اثناء میں یہ خاں صاحب بھی پہنچ گئے اور سیّد صاحب سے اصرار کیا کہ آپ تشریف لے جائیں، ہم ان کو سمجھیں گے۔ سیّد صاحب جو پہلے حکماً رہا کرا چکے تھے، اب جب حکم کا موقع نہیں تھا تو خوشامد کرکے اُن کو خان کے پنجہ سے چھڑایا اور جب رات ہوگئی تو اندھیرے میں اُن کو باہر پہنچوا دیا۔

جب امیر اور شیخ کا کردار یہ ہو کہ اپنے قاتلوں کو نہ صرف معاف کرے بلکہ گرفتار کرنے والوں کی خوشامد کرکے چھڑائے تو پھر ماتحتوں اور پیروکاروں میں یہ جذبہ کیوں نہیں کارفرما ہوگا۔ چنانچہ کبھی کبھی بشری تقاضا اُبھرتا اور کسی بات پر دو مجاہدوں میں تنازعہ ہو جاتا مگر خاتمہ اس طرح ہوتا کہ مظلوم ظالم کو بھائی کہہ کر معاف کر دیتا۔ ظالم خود پانی پانی ہو جاتا۔ ادفع بالتی ھی احسن کا تقاضا یہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔

فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃٌ کانہ ولی حمیم۔

Marfat.com

یعنی تعلیم یہ ہے کہ بُرائی کے جواب کے لئے سوچ سمجھ سے کام لے کر وہ طریقہ اختیار کرو جس سے نہ صرف یہ کہ آپ کا مظلومانہ غصّہ فرو ہو بلکہ ظالم آپ کا جاں نثار دوست بن جائے۔

مولانا حافظ عبدالوہاب صاحب کمزور آدمی تھے۔ اُن کو تقسیمِ رسد کا کام سپرد تھا۔ وہ قرآن شریف پڑھتے رہتے اور جو رسد لینے کے لئے آتا، اس کو رسد دے دیتے، اور بہت سوں کا ہجوم ہوتا تو نمبروار پہلے کو پہلے دے دیتے، بعد کے آنے والے کو بعد میں اس میں کوئی امتیاز قطعًا روا نہ رکھتے۔ ایک نو وارد مولوی امام علی عظیم آبادی رسد لینے گئے تو اُن کا نمبر بعد میں آنے والا تھا۔ اُنہوں نے پہلے لینا چاہا۔ مولانا عبدالوہاب صاحب نے فرمایا کہ باری آنے دو تب رسد دوں گا۔ مولوی امام علی تندرست و توانا تھے۔ مولوی عبدالوہاب ضعیف و نحیف۔ امام علی صاحب نے مولانا عبدالوہاب صاحب کو دھکا دیا۔ وہ آٹے پر گر پڑے۔ چند قندھاری اس جگہ کھڑے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ وہ مولوی امام علی صاحب کی طرف بڑھنے لگے تو مولانا عبدالوہاب صاحب نے روک دیا کہ امام علی میرا بھائی ہے۔ دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ صاحبان جوش میں کیوں آ گئے۔

شدہ شدہ یہ خبر سیّد صاحب تک پہنچی۔ آپ نے مولانا عبدالوہاب صاحب کو بُلا کر پوچھا۔ مولانا نے فرمایا، امام علی نیک آدمی ہیں، اتفاقاً غصّہ آ گیا تھا۔ میں نے معاف کر دیا۔ قصّہ ختم ہو گیا۔ یہ جواب جب امام علی صاحب نے سُنا تو ندامت سے پانی پانی ہو ہو گئے۔ خود سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا اقبال کیا اور درخواست کی کہ مولانا عبدالوہاب صاحب سے میرا قصور معاف کرا دیجئے۔ وان تعفوا وتصفحوا هو خير لكم۔ ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور۔

اس طرح ایک عجیب و غریب واقعہ عنایت اللہ صاحب اور ایک سائیس کا ہے جو اصل باشندہ غازی پور کا تھا مگر لاہوری کہلاتا تھا۔ قاضی مدنی صاحب بنگالی کے یہاں ملازم تھا۔ شکل و صورت اچھی نہ تھی مگر اخلاق بہت بلند۔ عنایت اللہ صاحب نے

سید صاحب کے خاص محافظین میں تھے۔ چارپائی کے قریب اکثر انہی کا پہرہ رہتا تھا۔ ایک طشت کے بلا اجازت لے جانے پر عنایت اللہ صاحب اور اس لاہوری سائیس میں جھگڑا ہو گیا۔ عنایت اللہ صاحب نے لاہوری کے دو گھونسے مار دیئے۔

لاہوری صاحب نے اس کی شکایت کی۔ یہاں تک کہ معاملہ قاضی صاحب کی عدالت تک پہنچا۔ قاضی صاحب نے مشورہ دیا کہ صلح کر کے معاملہ ختم کر دیں مگر لاہوری صاحب نے فیصلہ کا مطالبہ کیا۔ قاضی صاحب نے فیصلہ کیا کہ قانونِ شریعت کی رو سے فیصلہ یہ ہے کہ آپ بھی ان کے اتنے ہی گھونسے مار دیں۔

لاہوری صاحب اُٹھے اور فرمایا:

"جو بھائی حاضر ہیں گواہ رہیں۔ قاضی صاحب نے ہمارا عوض دلا دیا۔ لیکن ہم نے اسے رضاء الٰہی کے لئے چھوڑ دیا"

یہ الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر گھونسے مارنے کے بجائے عنایت اللہ صاحب کو گلے لگا لیا۔[1]

ایک مرتبہ امیر المومنین سید احمد صاحب جب کھانا کھانے بیٹھے، تو گوشت میں جلے ہوئے کی بُو آرہی تھی۔ کیونکہ ہنڈیا میں داغ لگ گیا تھا۔ اتّفاق سے سید صاحب کو ناگوار گذرا۔ یہاں تک کہ ہنڈیا پکانے والے "عبداللہ" کے لئے مردود کا لفظ زبان سے نکل گیا کہ اس مردود نے خبر نہ لی۔ ہنڈیا جل گئی اور گوشت کھانے کے قابل نہ رہا۔

چند ساتھی جو حاضر مجلس تھے، اس وقت تو خاموش رہے مگر تھوڑی دیر بعد آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ سید صاحب کی زبان سے یہ لفظ نکلا، مناسب نہیں۔ سید صاحب سے عرض کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میاں جی نظام الدّین چشتی، قاضی علاء الدّین، مولوی وارث علی، مولوی امام الدّین، حافظ صابر وغیرہ نے سید صاحب کو توجّہ دلائی۔ سید صاحب فوراً متاثر ہوئے۔ عبداللہ صاحب کو بُلایا اور پاس بٹھا کر اُن سے معافی مانگی۔[2]

عفّت و پاکبازی ذیل کا واقعہ ملاحظہ فرمایئے اور اپنے زمانہ کے فوجی سپاہیوں کے کیرکٹر کا جائزہ لیجئے۔

مُلّا اخوند زادہ کا بیان ہے کہ گاؤں کی عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ سید صاحب کے ساتھی خواہشاتِ نفس سے محروم ہیں یا اولیا ہیں۔

---

[1] سید احمد شہید ص۱۹۴۔ [2] ایضاً ص۲۳۶

Marfat.com

پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں، وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی غازی کی نگاہ عورت کی طرف اُٹھی ہو[1]

وقائع احمدی میں ان مجاہدین کی جو شان بیان کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"تکبر، غرور یا اپنی بڑائی کا مرض گویا ختم ہو گیا تھا۔ تعاونِ باہمی یہاں تک تھا کہ ہر ایک دوسرے کا کام کرنے میں سبقت کی کوشش کرتا۔ آٹا پیسنے، لکڑیاں کاٹنے اور چیرنے، گھاس چھیلنے، جاروب کشی اور گھوڑوں کی مالش سے لے کر کپڑے سینے اور کپڑے دھونے تک کے تمام کام باہمی تعاون سے خود قافلہ کے سپاہی ہی انجام دیتے تھے۔ بڑا اور چھوٹا یکساں تھا بلکہ سب سے بڑا آدمی سب سے چھوٹا کام کرنے میں سب سے زیادہ سبقت کرتا تھا۔

نماز پڑھنے کے لئے جو جگہ تجویز کی گئی تھی وہاں کنکریاں بہت تھیں۔ سید صاحب نے کچھ ساتھیوں کو ساتھ لیا۔ گھاس چھیل کر لائے اور اس زمین پر بچھا کر اس کو نرم اور ہموار کر دیا۔ خیموں میں دھوپ کی تمازت کی شکایت محسوس کی تو سید صاحب نے خود ہی چند ساتھیوں کے ساتھ گھاس لا کر خیموں پر پھیلا دی جس سے تمازت کم ہو گئی۔

فحش گوئی، بدکلامی، حسد، بغض وغیرہ طبیعتوں سے محو ہو گیا تھا۔ سپاہیانہ زندگی کے ساتھ یادِ خدا کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ دن کو مجاہد و شہسوار اور رات کو زاہدِ شب بیدار معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے زمین پر اُتر آئے ہیں، یا مسلمانوں کا دورِ اوّل لوٹ آیا ہے[2]"

یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے ایک ہی ماحول میں دس بارہ سال مسلسل رہنے کے بعد قافلہ کا ہر ایک فرد اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی ایک مثال بن گیا تھا۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے:

"بہ رحمت حضرت جہاں پناہ جل ذکرہٗ آں سپاہ تقویٰ دستگاہ را اخلاص

---

[1] سید احمد شہید ص۳۸ ج ۲۔ [2] سیرت سید احمد شہید طبع اوّل ص۱۷۵ و ص۱۷۶

Marfat.com

فی العمل بان مرتبہ بود کہ اگر مجاہد للّٰہی یک یک سپاہی ازاں لشکر ظفر انتباہی بہ قلم آید دفترے باید غیر متناہی کہ رقمش بانجام رسد۔[1]

(خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار لشکر کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کے اخلاص اور للّٰہیّت کی تعریف کی جائے تو انہیں پورا کرنے کے لئے لامتناہی دفتر درکار ہیں)۔

اُن کے بچے کھچے افراد سرحد سے واپس ہو کر جہاں پہنچے۔ وہاں کی سوسائٹی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کے تذکرے پرانے لوگوں کی زبان پر آج تک ہیں۔ انہیں پاکیزہ اخلاق کے اثرات تھے کہ باوجودیکہ انگریزی پروپیگنڈے کی پوری مشنری اُن کو بدنام کرنے میں مصروف رہی۔ مگر جب تقریباً تیس سال بعد ۱۸۵۷ء کا جہادِ حریّت برپا ہوا تو اُن کے ماننے والوں کے دہی دم خم تھے۔

وہابیوں کی تحریک جو ایثار و قربانی، حُسنِ انتظام اور رازداری کی بے نظیر مثال ہے جس نے ۱۸۵۵ء سے تقریباً ۱۸۷۰ء تک برطانیہ عظمیٰ کے اربابِ اقتدار کو سراسیمہ بنائے رکھا۔ اسی تقویٰ شعار لشکر کے چند بچے ہوئے سپاہیوں اور سید صاحب کے آسمان تربیت کے چند ٹوٹے ہوئے تاروں کی گردش مستانہ تھی جس کی تفصیل انشاء اللہ دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔

عارضی حکومت کے مخالفین اور وجوہاتِ مخالفت

سید صاحب کا اصل مقابلہ سامراج سے تھا۔ چنانچہ سامراجی طاقتیں سینہ اُبھار کر سامنے آگئیں۔ یہ تین حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔

(۱) سکھ (۲) شاہ پرست مسلمان (۳) انگریز

پہلی دو طاقتوں کا مقابلہ سید صاحب نے کامیابی کے ساتھ کیا۔ مگر تیسری طاقت اگر کھلے میدان میں لڑتی تو وہ بھی مغلوب ہو جاتی۔ لیکن اُس نے ایسا حربہ استعمال کیا کہ اس کا

[1] وصایا جلد دوم صفحہ ۵۹ بحوالہ جماعت مجاہدین صفحہ ۱۷

جواب سید صاحب کے پاس شکست اور شہادت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ ایک نفرت انگیز پروپیگنڈے کا حربہ تھا جس نے انہیں پٹھانوں کو سید صاحب کا دشمن بنا دیا جن کے سہارے اس علاقے میں یہ عارضی حکومت کامیاب ہو سکتی تھی۔ اب کسی قدر تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

سکھ کیا ہی اچھا ہوتا کہ سکھ انگریز کو پہچان لیتے تو وہ سید صاحب سے تعاون کر کے اپنی حکومت کو لازوال بنا لیتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا کہ سید صاحب کو ختم کرنے کے بعد دس پندرہ سال کے عرصہ ہی میں اپنی حکومت بھی کھو بیٹھے۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ

(۱) مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تمام فاتحانہ اولوالعزمیاں انگریزوں سے ہٹ کر پٹھانوں کے مقابلہ میں مرکوز ہو گئی تھیں۔ چنانچہ صرف تین سال گزرنے کے بعد ۱۸۲۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کر کے یار محمد خاں کو اپنی طرف سے باجگذار حاکم مقرر کر دیا تھا۔[۱] یوسف زئی کا علاقہ جہاں سید صاحب نے حکومت قائم کی تھی، اگرچہ آزاد تھا مگر پشاور فتح کرنے کے بعد مہاراجہ کی نظر اسی علاقہ پر جمی ہوئی تھی۔

(۲) ایک نظریاتی تصادم سید صاحب کے ساتھیوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ میں اُس وقت سے تھا جب مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خاں انگریزوں سے لڑتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرداروں سے امداد حاصل کرنے امرتسر پہنچے اور نہ صرف یہ کہ ناکام واپس ہوئے تھے[۲] بلکہ اگر "لیبل گرفن" کی روایت صحیح ہے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ ہلکر کو امرتسر سے تیس کوس پرے ہٹا دیں گے اور آئندہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔[۳]

(۳) سید صاحب کی نظر نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے مقابلہ میں پورے ایشیا کے اتحاد پر تھی، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ وحدتِ ہند تو درکنار سکھوں کی متحدہ حکومت

---

[۱] مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر سیتا رام کوہلی ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور ص ۲۴۔ [۲] ایضاً ص ۹۸ تا ۱۰۱ و سیاسی تاریخ ہند از میجر جنرل سرجان میلکم لارڈ کارنوالس کا دورِ حکومت۔ [۳] تاریخ راجگانِ پنجاب از لیبل گرفن۔

کے نظریہ سے بھی دست بردار ہو کر ستلج پار کے علاقہ پر (جس میں پٹیالہ، نابھہ، جیند، کپور تھلہ، وغیرہ کی ریاستیں تھیں) انگریزی اقتدار تسلیم کر چکے تھے۔

(۴) اگر میجر باسو کا یہ الزام صحیح ہے کہ "انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تاکہ وُہ سندھیا کا مقابلہ کر سکیں، اسی لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے ملے رہے اور اُن کے شکر گذار رہے"۔ تو سیّد صاحب اور رنجیت سنگھ کے نظریہ میں وہی تصادم تھا جو مہاراجہ سندھیا اور انگریزوں کے نظریہ میں۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سیّد صاحب نے مہاراجہ دولت راؤ کو خاص طور پر تحریک کی طرف متوجّہ کیا۔

۵۔ **مسلمان** | بدقسمتی سے سیّد صاحب اور یار محمد خاں جیسے خوانین کے نظریات میں بھی تصادم تھا۔ سیّد صاحب ملوکیّت کے دشمن، اور یار محمد خاں ان کے برعکس اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یار محمد خاں اختلاف مذہب کے باوجود سیّد صاحب کے مقابلہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے زیادہ قریب تھا۔

چنانچہ جنگ سیدو کے مقام پر جب مجاہدین کی طاقت نقطۂ عروج پر تھی، اور سردارانِ پشاور، سردارانِ سَمّہ کی فوجوں اور مجاہدین کو ملا کر ایک لاکھ کے قریب لشکر سیّد صاحب کے زیر قیادت تھا۔ خوانینِ پشاور نے اوّل سیّد صاحب کو زہر دلوایا اور جب سیّد صاحب کی بے ہوشی کے باوجود جنگ نہیں ٹلی اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کا پلّہ بھاری ہونے لگا تو سردارانِ پشاور اپنی فوج لے کر میدان جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ اب لڑائی کا تمام زور مہاجرین پر آپڑا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزاروں مہاجرین شہید ہوئے اس کے بعد بقول مصنّف سیرت سیّد احمد شہید:

> اب مسلمانوں کا مستقل دو حریفوں سے مقابلہ تھا۔ ایک سکھ دوسرے سردارانِ پشاور، خادی خاں[1] کے تیور بھی اس گاؤں[2] کے معاملہ کے بعد سے بدل گئے

---

[1] خادی خاں قلعۂ ہنڈ کا سردار تھا یہ پُرانا قلعہ دریائے "اباسین" کے پُرفضا کنارہ پر بادشاہی شان و شوکت کی یادگار تھا۔ خادی خاں پہلے اتنا معتقد ہوا کہ حضرت سیّد صاحب اور آپ کے تمام رفقاء کو قلعہ ہنڈ میں لے گیا اور

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

تھے اور انتقام کا موقع ڈھونڈتا تھا۔ اب یہ لوگ سیّد صاحب کی جماعت کے لئے دشمن اور علانیہ حریف تھے۔

(۶) ان دو حریفوں کے علاوہ تیسرا حریف بھی تھا۔ سب سے زبردست مگر سب سے ہوشیار اور سیاسی ڈپلومیسیوں کا نہ صرف ماہر استاد بلکہ موجد۔ ان دو حریفوں کی توپ و تفنگ اور لاؤ لشکر نے وہ کام نہیں کیا جو اس کے ایک نقطہ نے کیا تفصیل کیلئے آئندہ ابواب ملاحظہ ہوں۔

صاحبان انگریز کا رویّہ یہ قوم جس کی ہندوستانیوں نے یہاں تک عزت اور تعظیم کی کہ لفظ "صاحب" اُن کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ اپنی ٹھنڈی طبیعت اور مغز بیدار سے ہمیشہ اس پالیسی پر کاربند رہی ہے کہ دشمن کو شکست دینے میں طاقت اور دولت کم سے کم خرچ کی جائے۔ اس کا اعلیٰ تدبّر ہمیشہ ایسی تدبیروں میں صرف ہوتا رہا جن سے اغراض پُوری ہوں اور بدنامی قطعاً نہ ہو۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی قوموں اور نسلوں میں اختلاف و تفرقہ فطری امر ہے۔ ایسے موقع پر محبّانِ وطن[1] کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مختلف قوموں کے مزاج کو اس طرح اعتدال پر رکھا جائے کہ فرقہ داریت کا مرض اُبھرنے نہ پائے لیکن انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ فرقہ داریت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اصرار کیا کہ وہیں قیام کریں لیکن جب ایک موقع پر سیّد صاحب کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو سیّد صاحب کے درپے آزار ہوگیا۔ ۲؎ یعنی موضع مان پڑی۔ یہاں مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے دو گروہ تھے جن میں تقریباً ایک صدی سے جنگ چل رہی تھی۔ بارہا کشت و خون کی نوبت آچکی تھی اور بقول مصنّف سوانح احمدی، فریقین کے تین چار ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ جب اس علاقہ میں سیّد صاحب کے احکام نافذ ہونے لگے تو یہ معاملہ بھی سیّد صاحب کی عدالت میں پیش ہوا تحقیق و تفتیش کے بعد سیّد صاحب نے مالکانِ اراضی کے دعوے کو جائز اور صحیح قرار دیا اور فریق ثانی سے جبراً تخلیہ کرا دیا۔ خادی خاں فریق ثانی کا حامی تھا۔ اس کو اس معاملہ میں زک اُٹھانی پڑی اور جیسا کہ خود نما اغراض پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس کو نہ صرف عدالت سے بلکہ سیّد صاحب کے پورے نظام سے ہی نفرت ہوگئی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ سوانح احمدی و سیرت سیّد احمد شہید تذکرہ قیام کلکتہ۔

Marfat.com

بابر نے ہمایوں کو وصیت کی تھی۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جُل کر کام کر رہے ہیں اسی طرح ہندوستان کی مختلف المذاہب رعایا کو ملا جُلا رکھو اور اُن میں اتحادِ عمل پیدا کرو تاکہ جسمِ سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے[1]۔

اور انگریزی دَور کے حکمرانوں کا نظریہ یہ تھا:

"ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی اور حربی نظم ونسق سے، یہ اصول ہمیشہ مدّنظر رکھنا چاہیئے کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"[2]

اس تحریک کے بارہ میں انگریزوں کا جو رویّہ رہا، وہ ڈپلومیسی اور شاطرانہ تدبّر کی بہترین مثال ہے۔

جب تک اس تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف اتنا رہا کہ رنگروٹ بھرتی کئے جائیں اور سرمایہ فراہم کیا جائے، تو انگریزی حکومت کے ذمّہ داروں نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا بلکہ بعض انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ چنانچہ سیّد صاحب کے قافلہ کی دعوت کرنیوالوں میں جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام ہیں وہاں ایک انگریز کا نام بھی ہے جس نے پورے قافلہ کے لئے کشتیوں پر کھانا پہنچایا تھا۔ جب حج کو جاتے ہوئے قافلہ قصبہ ڈلمئو سے الہ آباد کی طرف گنگا کے راستہ سفر کر رہا تھا، کلکتہ میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ میں جہاں ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوتا تھا، صاحبان انگریز اور اُن کی میم صاحبان بھی شریک ہوتی تھیں[3] بلکہ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری مصنّف سوانح احمدی کا بیان تو یہ ہے:

جہاد پر جانے سے قبل سیّد صاحب نے براہِ دُور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لفٹننٹ گورنر بہادر اضلاعِ شمالی و مغربی کو

---

[1] یہ وصیت ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل رامراج کالج کولہاپور کے قلمی مسودہ سے نقل کرکے اخبار خلافت بمبئی ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ [2] حکومت خود اختیاری ص۵۱ و ۵۲۔ [3] سوانح احمدی ص۸۹۔

Marfat.com

بھی اس تیاریِ جہاد کی اطلاع دے دی تھی۔ جس کے جواب میں صاحبِ ممدوح نے تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عمل داری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں[1]۔

ڈاکٹر ہنٹر اس سے بھی آگے یہاں تک فرماتے ہیں:

ایک انگریز تاجر نے جو شمال مغربی صوبہ میں تیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا مجھے بتایا کہ اُس کے بہت سے دین دار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معیّن حصہ "ستیانہ کیمپ" کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدّت کیلئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کیلئے چلے جاتے تھے جس طرح کبھی کبھی اس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو تیل کی تجارتی کوٹھی میں کام کرتے تھے۔ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان اس عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا تھا[2]۔

ہندوستان کے مشہور مسلمان رہنما سر سید احمد خاں صاحب مرحوم جن کا مشہور اور نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اُن تلخیوں کو دُور کیا جو مسلمانوں اور انگریزوں میں ابتداء سے چلی آ رہی تھیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ مسلم اکثریت کی باغیانہ ذہنیت کو وفادار بنا دیا۔ ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو

---

[1] سوانح احمدی صفحہ ۸۹۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۳

Marfat.com

اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی - گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیئے - دہلی کے ایک مہاجن نے بہادر پور کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی، جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا - اس سوال کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کا خیال تو یہ ہے کہ :

۱۸۳۲ء تک سیّد احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکّام نے کوئی توجّہ نہ کی - انہوں نے اپنے جاں نثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا - اور ایک باقاعدہ گدّی، مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت کی قائم کر دی - اس اثناء میں ہمارے افسر، اپنے ارد گرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرتے - انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے میں ہی مصروف رہے - ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بُری طرح جھنجھوڑے گئے۔[2]

دوسرے موقع پر وہابی موومنٹ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس تحریک کے نمایاں پہلو تین ہیں - تنظیم کی اعلیٰ قابلیت[1] - رازداری[2] - وفاداری[3]۔

بہر حال ڈاکٹر ہنٹر صاحب انگریزوں کے اس رویّہ کی وجہ غفلت، لاپرواہی، ناواقفیت اور تحریک کی غیر معمولی رازداری قرار دیتے ہیں -

مگر واقعہ یہ ہے کہ نادانی اور لاپرواہی یا غفلت کی وجہ سے یہ رویّہ نہیں اختیار کیا گیا تھا بلکہ سوچی سمجھی پالیسی کی بناء پر یہ رویّہ اختیار کیا گیا تھا - کیونکہ اس طرح :

(۱) ایک مخالف عنصر انگریزی مقبوضات سے خارج ہو رہا تھا۔

---

[1] انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ دسمبر ۱۸۷۱ء بحوالہ روشن مستقبل ص۱۱۲ - [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوم از ڈاکٹر ہنٹر ص۶۷ -

(۲) اس نے جو مرکز تجویز کیا تھا وہ انگریزی مقبوضات سے بہت دُور تھا۔

(۳) یہ ممکن تھا کہ میر جعفر اور میر صادق پیدا کر دیئے جائیں جو اس طاقت کو اصل مرکز میں رہتے ہوئے مفلوج کر دیں۔

(۴) یہ بھی ممکن تھا کہ زمان شاہ کی طرح سید صاحب کی طاقت بھی اندرونی بغاوت سے ختم کر دی جائے۔

(۵) انگریزی مقبوضات تک پہنچنے کے راستے میں سکھ حکومت حائل تھی، اور جس طرح روہیلوں کو شجاع الدولہ کے ذریعہ اور سلطان ٹیپو کو نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کی امداد سے شکست دی گئی تھی، اس طاقت کو بھی سکھوں کے ذریعہ ختم کر دینا ممکن تھا۔

پس جب اتنے امکانات موجود تھے تو یہ نادانی اور ناعاقبت اندیشی نہیں، بلکہ عین تدبر تھا کہ اپنے مقبوضات میں اس تحریک کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائے، تاکہ رواداری اور فراخ حوصلگی کی نمائش بھی ہو جائے، ملک میں بدامنی بھی نہ پھیلے اور غیر معمولی طاقت صرف کئے بغیر دشمن کا خاتمہ ہو جائے۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی نے وہابیت کا الزام تراش کر وہ نقصان پہنچایا کہ نہ سکھوں کی ٹڈی دَل فوج وہ نقصان پہنچا سکی اور نہ یار محمد خاں وغیرہ پٹھانوں کی مسلح طاقت یہ کام کر سکی تھی جو اس پراپیگنڈے نے کیا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصّہ کو ایک ہی رات میں ذبح کرا دیا۔ وہابیت کی حقیقت سے نہ مہاراجہ رنجیت سنگھ واقف تھے جن کی حکومت مغربی پنجاب اور سندھ کے چند اضلاع تک محدود تھی، نہ یار محمد خاں میں یہ شعور تھا کہ وہابیت اور لفظ وہابی کے نفرت انگیز اثرات سے واقفیت صرف انگریزوں ہی کو تھی جن کے کچھ تجارتی جہازوں کو ۱۸۰۹ء میں وہابیوں نے خلیج فارس سے گذرتے ہوئے لُوٹ لیا تھا۔ پھر انگریزوں ہی کو اندازہ تھا کہ وہابیوں کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور ایران میں کتنی نفرت پھیلی ہوئی ہے۔

Marfat.com

جنگی اقدامات اور اُن کے نتائج

سید صاحب کا پہلا حملہ ۲۰ جمادی الاولیٰ[1] ۱۲۴۲ھ، ۲۱ دسمبر[2] ۱۸۲۶ء کو ہوا۔ اس میں ۳۷ مہاجر[3] شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے۔ نتیجہ کے لحاظ سے یہ حملہ کامیاب رہا۔ کیونکہ مخالف، مجاہدین کی قوت اور اُن کی بہادری اور چابک دستی سے مرعوب ہوا، اور قرب و جوار کے خوانین بھی متأثر ہوئے۔ چنانچہ قلعہ ہنڈ کا رئیس "خادی خاں" پوری عقیدتمندی سے حاضر ہوا۔ مجاہدین میں اپنا نام لکھوایا اور سید صاحب اور تمام رفقاء کو اپنے قلعہ "ہنڈ" میں لے گیا۔ بہت کافی خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم کی۔ خادی خاں کا اصرار تھا کہ حضرت سید صاحب قلعہ ہنڈ کو ہی اپنا مرکز بنائیں۔ مگر سید صاحب نے معذرت کر دی اور چند روز بعد اپنے کیمپ میں تشریف لے آئے۔

اس کے بعد جھڑپیں ہوتی رہیں جن میں اکثر و بیشتر مہاجرین کو کامیابی ہوتی رہی۔ علاقہ کے پٹھان بھی آپ کے حلقہ میں شامل ہوتے رہے یہاں تک کہ ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کو جب آپ نے باضابطہ امارت و حکومت کا اعلان کیا تو سوات، سمہ، بنیر کے خوانین (جو بقول حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب[4] فوج و لشکر اور توپ و شاہین کے مالک تھے) بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔

یار محمد خاں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا گورنر تھا، اس کے بھائی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں وغیرہ عمائدینِ پشاور نے بھی بذریعہ خط آپ کی امارت تسلیم کر لی۔

سکھ حکومت کی طرف سے پیش کش کی گئی کہ دریائے اباسین سے اُس پار کا علاقہ مہاراجہ کی طرف سے انعام تصور کریں اور آئندہ اقدام کا قصد نہ کریں[5]۔ مگر سید صاحب،

---

[1] سیرت سید احمد شہید۔ [2] روشن مستقبل۔ [3] محترم غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں سب کے نام درج کر دیئے ہیں۔ [4] سیرت سید احمد شہید۔ [5] الدر المنثور فی احوال صادق پور

Marfat.com

نہ ملک کے خواہاں تھے نہ حکومت و امارت کے متمنّی۔ جس بلند مقصد کے لئے آپ نے زندگی وقف کر رکھی تھی ایسے انعامات اُس کے لئے توہین تھے۔ آپ نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تو مہاراجہ کی طرف سے باقاعدہ حملہ کا انتظام کیا گیا۔

شیدو کا میدان رزمگاہ تھا۔ سکھوں کا لشکر جرار پورے ساز و سامان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، اور سید صاحب کے لشکر بھی مقابلہ میں خیمہ زن ہو گئے کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر سید صاحب کے زیر حکم تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ لیکن یہ جارتی جمعیت کھوکھلی تھی۔ کیونکہ :

(۱) اس مجمع میں وہ بھی تھے جن کے پندار و غرور کو محکمہ احتساب کی مساوات پسندی سے ٹھیس پہنچی تھی۔ محکمہ احتساب جو اعمال و اخلاق کا نگران تھا، چھوٹے بڑے، امیر و غریب، خان اور غیر خان کی تمیز نہ اس کو کرنی چاہیے تھی، نہ اُس نے کی تھی۔ یہ یکسانیت اُن کو ناگوار تھی جن کے دماغوں میں ذاتی برتری کا غرور بھرا ہوا تھا۔

(۲) خادی خاں جس نے بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا، وہ بھی محکمہ عدلیہ کے شکنجہ میں کسا جا چکا تھا کیونکہ موضع مانیری کے قضیہ میں خادی خاں کے تھوک کے خلاف دوسرے فریق کو ڈگری دی گئی تھی اور اُس کا اجراء بھی کر دیا گیا تھا۔

(۳) سردارانِ پشاور جو اس مجمع میں شامل تھے، اگرچہ سید صاحب کی امارت تسلیم کر چکے تھے مگر وہ رنجیت سنگھ کے زیر اثر تھے اور اپنے شاہ پرست مزاج کے باعث اُن کے جذبات اور رجحانات رنجیت سنگھ کے ہی ہمنوا اور ہمدرد تھے۔

اس اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ خاص اُس شب میں جس کی صبح کو فیصلہ کن جنگ ہونے والی تھی، سید صاحب کو زہر دے دیا گیا۔ صبح کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خیمہ میں گئے تو سید صاحب کی حالت غیر تھی، بے ہوشی کا غلبہ تھا اور قے برابر جاری تھی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا، اس خبر کو بالکل مخفی رکھا۔ خود سید صاحب نے بھی اپنے مرض کو چھپانے کی کوشش کی اور اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔

Marfat.com

میدانِ کارزار گرم تھا۔ مجاہدین کا پلّہ بھاری تھا کہ سردارانِ پشاور اور خالصہ فوج کے کمانڈر میں کچھ نامہ و پیام ہوا، اور فوراً ہی سردارانِ پشاور اپنی فوج اور سامانِ جنگ لے کر میدان سے علیحدہ ہوگئے۔ اب جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سردارانِ سمّہ اور اُن کی فوج کے دل ٹوٹ گئے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اب لڑائی کا سارا زور ہندوستانی مجاہدین پر آپڑا۔ ہندوستانی مجاہدین دل توڑ کر لڑے مگر وہ اس طرح گھِر گئے تھے کہ فتح کا امکان ختم ہوگیا تھا۔ باقی ماندہ طاقت کو اس گھیرے سے نکال لینا ہی کامیابی تھی۔ چنانچہ حلقہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اب دوسری سازش منکشف ہوئی کہ یار محمّد خاں کا پیش کردہ ہاتھی جس پر سیّد صاحب سوار ہیں، لنگڑا ہے۔ فوراً آپ کو گھوڑے پر سوار کیا گیا اور میدان سے نکال کر ایک گاؤں میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک ہفتہ کے بعد سیّد صاحب کو صحت نصیب ہوئی۔

بہرحال اس جنگ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ مجاہدین کو شکست اُٹھانی پڑی، بلکہ یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ شاہ پرستوں کا مذہب کچھ بھی ہو، اُن کا محاذ ایک ہی ہے، اور یار محمد خاں اور خادی خاں بھی وہی کرسکتے ہیں جو شیر سنگھ (ولی عہد) اور بدھ سنگھ (کمانڈر) کے رجحانات اور جذبات ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ سردارانِ پشاور پیش پیش تھے اور سکھ فوج اور اُس کے سردار اُن کی پشت پر۔ لیکن ان متحدہ طاقتوں کے مقابلہ میں فتح اور کامیابی سیّد صاحب کے قدم چومتی رہی۔

انتہا یہ کہ ۱۰ صفر ۱۲۴۵ھ (۱۱ اگست ۱۸۲۹ء) کو قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا گیا۔ خادی خاں مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ قلعہ مجاہدین کے قبضہ میں آگیا۔ خادی خاں کے بھائی امیر خاں نے اپنے بھائی کے انتقام کے لئے یار محمد خاں سے مدد چاہی۔ یار محمد خاں نے مدد کے لئے ہنڈ کی طرف فوج کشی کی۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۱۲۴۵ھ، ۱۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو مقام زیدہ میں لشکر مجاہدین سے مقابلہ ہوا۔ یار محمد خاں مقتول ہوا۔ اس کی فوج فرار ہوگئی۔ پھر امیر خاں برادر خادی خاں کا بھی انتقال ہوگیا۔

Marfat.com

لشکر مجاہدین آگے بڑھا اور اواخر ستمبر ۱۸۲۹ء میں بلا کسی مزاحمت کے پشاور میں داخل ہو گیا۔ اہلِ شہر نے پُرجوش خیر مقدم کیا۔ سید صاحب نے شہر میں داخل ہوتے ہی امن کا اعلان کر دیا۔ دوکانیں کھل گئیں۔ باشندگانِ شہر پوری طرح مطمئن ہو گئے البتہ بازاری عورتیں روپوش ہو گئیں۔ قحبہ خانے بند اور شراب کی بھٹیاں سرد پڑ گئیں۔ اعمال و اخلاق پر احتساب جاری کیا گیا اور مقدمات کے فیصلہ کے لئے عدالت قائم کر دی گئی۔ یار محمد خاں کے بھائی سلطان محمد خاں نے جب دیکھا کہ پاسہ پلٹ چکا ہے تو "اربابِ فیض اللہ خاں" اور دوسرے بااثر خوانین کو بیچ میں ڈال کر سید صاحب سے عفوِ تقصیر اور حکومتِ پشاور کی درخواست کی۔ سید صاحب کے چند زیرک ساتھیوں نے درخواست کی مخالفت کی۔ مگر سید صاحب اور آپ کے رفقاء پر ایشیائی فطرت کا غلبہ تھا ع درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست

علاوہ ازیں ارشادِ خداوندی ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ۔ جب غیر مسلموں کے لئے یہ حکم ہے تو مسلمان تو اس سیر چشمی کا بہت زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ سلطان محمد خاں کو حاکم (نائب) مقرر کیا گیا۔ مولانا سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو محکمہ انصاف کا جج بنا دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد سید صاحب اور آپ کا لشکر پشاور سے واپس ہو کر پنجتار کیمپ میں اقامت گزیں ہوا۔

فتح پشاور کے اثرات (۱) فتح پشاور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے لئے ناقابلِ برداشت حادثہ تھا۔

(۲) انگریز جو شاہ زمان کے زمانہ (۱۷۹۹ء) سے ایران اور کابل کی سیاست میں دخیل ہو چکے تھے، ۱۸۰۶ء (لارڈ منٹو کے زمانہ) میں مسٹر الفنسٹن کی زیر سرکردگی انگریزی سفارت باضابطہ کابل سے تعلق قائم کر چکی تھی، اُن کے لئے بھی یہ حادثہ رنجیت سنگھ کی نسبت کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پڑوسی ہونے کی وجہ سے خطرہ تھا تو انگریزوں کو پریشانی یہ تھی کہ فاتح پشاور سے عقیدت رکھنے

Marfat.com

والوں کا جال پورے شمالی ہند اور بنگال میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طرف شمال مغرب میں سیّد صاحب کی حکومت پشاور میں قائم ہوئی اور دوسری جانب شمال مشرق میں سیّد صاحب کے معتقدِ خاص نثار علی نے بنگال میں تحریک شروع کردی جس نے چند ماہ بعد ایک منظم بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔

(۳) ان دو عظیم الشان طاقتوں کے علاوہ سلطان محمد جس کو پشاور کی حکومت سپرد کی گئی تھی، شاہ پرستی میں اپنے مقتول بھائی سے کم نہیں تھا۔ اس نے سیّد صاحب سے خوشامد کر کے حکومت حاصل کی اور رنجیت سنگھ سے کامل وفاداری اور اطاعت ظاہر کرنے کے لئے "لیلیٰ" نام کی بیش قیمت گھوڑی جو ایک عرصہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظورِ نظر تھی، اور بار بار کی فرمائشوں کے باوجود نہیں پیش کی تھی، سلطان محمد خاں نے از خود پیش کردی۔ مزید برآں مالا مروارید بھی نذر کیا[1]۔

سکھ حکومت کے دستور کے مطابق گھوڑی پیش کرنا، اطاعت اور وفاداری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ منظورِ نظر اور پسندیدہ گھوڑی اور اس کے ساتھ مالا مروارید کی پیشکش تو وفاداری اور خوشامد کی انتہا تھی۔

اب ان تمام سامراج پرست طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے ایک چلتا ہوا لفظ "وہابی"[2] استعمال کیا گیا جو مسلمانوں میں نفرت پھیلانے کے لئے جادو کا اثر رکھتا تھا۔ سرحدی پٹھانوں میں غیر اسلامی رسومات کے خلاف سیّد صاحب کی سرگرم اصلاحی جدّوجہد اس الزام کی دلیل تھی، اور پھر منظم سازش کے ذریعہ تمام علاقہ کو پوری رازداری کے ساتھ سیّد صاحب اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔

جب مسلمان، سکھ، عیسائی (سب مل کر بین الاقوامی اتحاد کے ساتھ) فتوے صادر

---

[1] سوانح احمدی۔ [2] شیخ عبدالوہاب نجدی کے پیرو کو وہابی کہا جاتا تھا۔ اس گروہ کے کچھ لوگوں نے چونکہ مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف مدینہ طیبہ میں گستاخیاں کی تھیں، اس لئے اسلامی ممالک میں وہابیوں سے نفرت پھیلی ہوئی تھی۔

Marfat.com

کریں تو بیچارے سیّد صاحب اور اُن کے مُٹھی بھر ساتھیوں کی حقیقت ہی کیا تھی۔

مجاہدین کا قتلِ عام سلطان محمد خاں نے پہلا وار قاضی منظر علی صاحب پر کیا اور سر دربار اس الزام میں قتل کر دیا کہ اس کا بھائی یار محمد خاں قاضی صاحب کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔

سلطان محمد خاں کے محسن ارباب فیض اللہ خاں مہمند نے (جن کی کوششوں سے قصور کی معافی اور پشاور کی حکومت ملی تھی) قاضی صاحب کے قتل کے خلاف احتجاج کیا تو اُن کو بھی یہی خونین انعام عطا ہوا۔

پھر سیّد صاحب کی حکومت کے سینکڑوں[1] کارکنوں کو (عشر وصول کرنے والوں کو) جو علاقہ سمہ میں پھیلے ہوئے تھے، ایک ہی شب میں مقامی لوگوں نے ذبح کر دیا۔

شام کے وقت ان کارکنانِ حکومت نے دیکھا تھا کہ آبادیوں میں شور و غل ہے، ڈھول بجائے جا رہے ہیں اور اُونچے مکانات اور پہاڑیوں پر آگ جلائی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ پٹھانوں نے طے کیا ہے کہ رات کو خندروس کوٹ لیں تاکہ صبح ہی اسلامی حکومت کا ٹیکس ادا کر دیں۔ یہ ہندوستانی مجاہد پٹھانوں کی راہ و رسم اور ان کی اصطلاحات سے ناواقف تھے۔ یہ یہی سمجھتے تھے کہ "خندروس" جوار کو کہتے ہیں مگر جب رات کے وقت خنجرِ آبدار نے اُن کی شہ رگ کو بوسہ دیا، تب واضح ہوا کہ خندروس کوٹنے کا مطلب کیا تھا۔

سیّد صاحب کا تاثر اور تبدیلیٔ مرکز برسوں کی جانفشانی کے بعد جو چھوٹا سا باغ تیار ہوا تھا، برقِ خرمن سوز سے اس کی یہ بربادی نہ صرف سیّد صاحب کی زندگی بلکہ تاریخِ انسانیت کا ایک وحشت انگیز اور دردناک حادثہ تھا۔ ملوکانہ انداز میں اس کا جواب یہ تھا کہ علاقہ سمہ کے حریف پٹھانوں اور باقی ماندہ ہندوستانی مجاہدین کی جمعیت سے

---

[1] ان کی تعداد چار ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ بہر حال تعداد کچھ بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ منتخب بہادر تھے جو عزم کے پختہ اور نصب العین کے دھنی تھے۔ ایسا پختہ اور آزمودہ ایک بھی ہزاروں کی بھیڑ سے بھاری ہوتا ہے۔

Marfat.com

پشاور اور پورے علاقہ سمّہ پر حملہ کیا جاتا اور اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی۔ مگر سیّد صاحب کو شہید ہونے والے ساتھیوں سے زیادہ اپنے نصب العین سے محبّت تھی۔ جس کے لئے آپ اپنی زندگی وقف کئے ہوئے تھے اور شہید ہونے والوں نے بھی اپنی زندگیاں اسی کے لئے قربان کی تھیں۔ آپ نے خانہ جنگی کو کسی طرح پسند نہیں کیا۔ پنجتار وغیرہ دوسرے علاقے کے پٹھانوں نے سیّد صاحب کو انتقام پر آمادہ کرنا بھی چاہا۔ مگر سیّد صاحب آمادہ نہیں ہوئے اور آپ نے اب یہی بہتر سمجھا کہ کوئی دوسرا مرکز قائم کر کے اپنا کام شروع کیا جائے۔

رازدانوں نے بتایا ہے کہ سیّد صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ سندھ کو اپنا مرکز بنائیں گے بہرحال فتح پشاور سے تقریباً سولہ ۱۶ ماہ بعد اور عارضی حکومت قائم ہونے سے چار سال چار ماہ بعد رجب ۱۲۴۶ھ میں آپ نے اس علاقہ سے کوچ کیا۔ توپوں کو ایک محفوظ جگہ دفن کیا اور بہت سا جنگی اور استعمالی سامان وہیں لوگوں کے سپرد کر دیا۔ ساتھیوں کو عام اجازت دے دی کہ جو شخص واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ مگر سیّد صاحب کا ساتھ چھوڑنا کسی نے پسند نہ کیا۔

خالصہ فوج نے ایک طرف تو سیّد صاحب کے ہٹتے ہی پشاور اور علاقہ سمّہ پر قبضہ جما لیا اور دوسری طرف خالصہ فوجیں سیّد صاحب کا راستہ روکنے لگیں مگر اُن کو پے در پے شکست ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کا لشکر بالاکوٹ پہنچ گیا۔

برف باری نے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ یہیں ایک محفوظ میدان منتخب کیا گیا اور جھونپڑیاں ڈال دی گئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ولی عہد شیر سنگھ بھی اس علاقہ میں پہنچا ہوا تھا۔ چند میل کے فاصلہ پر اس کی تقریباً بیس ہزار فوج ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ مگر سیّد صاحب کا لشکر گاہ پہاڑیوں کے بیچ میں ایسے مقام پر تھا جہاں غنیم کا پہنچنا ناممکن تھا۔

مئی کا مہینہ آیا۔ برف باری بند اور لشکروں میں حرکت شروع ہوئی۔ شیر سنگھ نے حملہ کرنا چاہا، مگر فوج کے گذارنے کا کوئی راستہ نہیں ملا۔ وہ مجبور ہو کر واپس ہونے

Marfat.com

والا تھا کہ کچھ غداروں نے ایک نہایت مخفی راستہ کا پتہ بتا دیا۔ شیر سنگھ یا خالصہ فوج کے لئے نہیں بلکہ سامراج کے لئے فتح و کامرانی کا نشان مل گیا۔ ابھی سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کو خبر بھی نہ ہونے پائی تھی کہ راستہ کی چوکی کے محافظ دستہ کو جامِ شہادت نوش کراتے ہوئے خالصہ کی ٹڈی دَل فوج مجاہدوں کے سر پر پہنچ گئی۔ صرف ایک دلدل بیچ میں تھی جو دست بدست جنگ کے لئے آڑ تھی۔ مگر سید صاحب کی ہمتِ مردانہ نے آڑ کو پھاندا، مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور دوسرے جانباز ساتھی بھی گھوڑے پھاند کر لشکر غنیم میں گھس گئے اور دست بدست جنگ شروع کر دی لیکن غنیم کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ نہ ہمتِ مردانہ کام آسکی اور نہ اپنی فوج پر کنٹرول باقی رہ سکا۔

سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب اور سینکڑوں ساتھی شہید ہوئے۔ جو باقی رہے وہ ایسے منتشر ہوئے کہ شہیدوں کی تجہیز و تکفین بھی نہ کر سکے۔

مگر شیر سنگھ نے ان شہیدوں کا پورا احترام کیا۔ سید صاحب کی نعش کو قیمتی دوشالہ اوڑھایا گیا۔ سکھ فوج کے مسلمان سپاہیوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر فوجی اعزاز کے ساتھ آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔[1]

تاریخِ حریت کا یہ وحشت ناک حادثہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ، ۷ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔

شہادت کے بعد

حضرت مولانا عبدالحی صاحب کی وفات کے بعد سید احمد صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی شہادت سے تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا مگر بقول ڈاکٹر ہنٹر:

"یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ خود سید صاحب کی وفات کو بھی اُن کے پُرجوش حامیوں نے اپنے مذہب کی

---

[1] سوانح احمدی ص ۱۷۹ پوری تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے مہر صاحب کی کتاب سید احمد شہید۔

Marfat.com

اشاعت کے لئے ایک مقدس ذریعہ بنالیا تھا۔"[1]

چنانچہ سید صاحب کے اہل خانہ اور کچھ مجاہدین تو نواب وزیرالدولہ (والئ ریاست ٹونک) کی دعوت پر ٹونک تشریف لے آئے۔ جہاں انہوں نے باقی زندگی پوری خاموشی اور اپنے پروردگار کی عبادت میں گذاری۔ لیکن باقی مجاہدین پھر جمع ہوئے۔ اپنا نظم دوبارہ قائم کیا۔ "ستیانہ" کے سرحدی علاقہ کو اپنا مرکز بنایا اور سید صاحب کے بھانجے مولانا نصیرالدین صاحب کو امام اور امیر (لیڈر) منتخب کرکے اپنی پرانی تحریک میں نئی روح پھونک دی[2]۔ خالصہ حکومت تو چند سال بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئی۔ مگر اُس کے جانشین (انگریزوں) کے لئے یہ تحریک تقریباً نصف صدی تک وبالِ جان بنی رہی۔ تفصیلات انشاءاللہ تیسری جلد میں پیش کی جائیں گی۔

مشرقی محاذ

نثار علی عرف ٹیٹو میاں کی بغاوت

یہ مغربی محاذ کا قصہ تھا جو گذشتہ اوراق میں پیش کیا گیا۔ جس کی قیادت خود سید صاحب کر رہے تھے۔ مگر بنگال کا وہ علاقہ جہاں حضرت سید صاحب حج کو جاتے ہوئے اور حج سے واپسی پر دو ماہ قیام کرکے جذباتِ حریت کی تخم ریزی کر چکے تھے اس عرصہ میں سونا نہیں رہا۔ آپ کی تخم ریزی بارآور ہوئی۔ چنانچہ اس طرف شمال مغربی سرحد پر سید صاحب کی پیش قدمی شروع ہوئی تو ہندوستان کے دوسرے کنارہ پر نثار علی عرف ٹیٹو میاں نے ضلع کلکتہ کے شمال اور مشرق کی طرف دورہ شروع کردیا، اور

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صہ ۳۴ ۔ [2] سوانح احمدی ص۱۸۰ ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس وقت مولانا محمد قاسم (پانی پتی) کو امیر بنایا۔ مولانا نصیرالدین صاحب دہلوی (داماد حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب) کو ان کے بعد جب وہ دہلی سے واپس پہنچے تب امیر بنایا۔

Marfat.com

خاص اس زمانہ میں کہ سید صاحب نے پشاور فتح کیا، نثار علی صاحب نے بنگال میں علم جہاد بلند کر دیا۔ نثار علی صاحب اور اُن کے دستِ راست مسکین شاہ صاحب کئی ماہ تک کامیاب جہاد کرتے رہے۔ علاقہ کے تمام ہندو مسلمان کاشتکار اُن کے ساتھ ہو گئے۔ ضلع فرید پور میں انھوں نے اپنی حکومت بھی قائم کر لی۔ مگر نومبر ۱۸۳۱ء کے آخر میں انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے نثار علی شہید ہو گئے۔ مسکین شاہ گرفتار کر لئے گئے۔ جن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، اور باقی طاقت اس وقت منتشر ہو گئی۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ زمیندار طبقہ بالخصوص ہندو زمینداروں نے ساتھ نہیں دیا۔ انتہا یہ کہ ایک زمیندار نے تو ایسے لوگوں پر ایک نیا ٹیکس لگا دیا جس کا تعلق سید صاحب سے تھا۔ اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز شکل یہ تھی کہ وہ اس کو "داڑھی کا ٹیکس" کہہ کر وصول کرتا تھا[1] اس سے

[1] مسٹر جیمز او کینلی افسر تحقیقات کا بیان ہے کہ جون ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار ساکن پورنا کے مظالم نے ایک نازک حالت پیدا کر دی۔ اُس نے اپنے ہر مسلمان کاشتکار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا، ڈھائی روپیہ کا محصول لگا دیا۔ اور اشتعال میں اضافہ اس طرح کیا کہ وہ داڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا اپنے موضع میں تو اُس نے یہ محصول بلا مقابلہ وصول کر لیا۔ مگر جب اس کے کارندے قریب کے موضع سرفراز پور میں پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف ٹیٹو میاں مع اپنے معتقدین کے موجود تھے۔ انھوں نے ان محصلوں اور کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ جب کشن راؤ زمیندار کو اس کی خبر ملی تو دو تین سو آدمی جمع کر کے بھیج دیئے۔ جن کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوا، اور لوٹ لئے گئے اور مکانات اور مسجد جلا دی گئی۔ جب معاملہ کی تحقیق ہوئی تو تھانیدار صاحب نے اُلٹا مسلمانوں پر یہ الزام لگایا کہ خود انھوں نے اپنے مکانات اور مسجد جلا دی ہے۔ دونوں طرف سے دعوے ہوئے جن کے فیصلے میں تعویق ہوئی۔ بالآخر دونوں طرف سے دعوے خارج کر دیئے گئے (یعنی فریقین نے باہمی تصفیہ کر لیا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج کر دیا گیا) مگر مسلمانوں کو دارو غہ پر بہت غصہ تھا۔ اس لئے انھوں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد کشن رائے زمیندار نے اپنے مسلمان کاشتکاروں پر تھا یا لگان کی وصولی میں بڑی سختیاں کیں اور گرفتاریاں کرائیں۔ یہ لوگ اپیل کے لئے کلکتہ گئے۔ وہاں جج موجود نہ تھے (کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء جلد ۵۱ ص ۱۷۹ جولائی ۱۸۷۰ء بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۱۰)۔

Marfat.com

انگریزوں کو موقع مل گیا کہ اپنی معصومیت ظاہر کرتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ اس بغاوت کا منشار وہ زیادتیاں تھیں جو ہندو[1] زمیندار کاشتکاروں پر کیا کرتے تھے[2]۔

جب کسی عنوان سے فرقہ داریت کا نام آیا تو اگر نثار علی صاحب کے ساتھیوں نے کھانے کے لئے گائے ذبح کی، تو اس کے متعلق بھی یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اس کا منشار ہندوؤں کی توہین و تذلیل ہے[3]۔

بہرحال زمیندار طبقہ کی مخالفت نے انگریزوں کا کام بہت سہل کر دیا، اور مغرب میں سید صاحب کی شہادت کے ساتھ مشرق کی یہ تحریک بھی زمین دوز ہو گئی۔

لفظ وہابی کی حقیقت اور پروپیگنڈے کا مرکز

وہابی - یہ لفظ ہندوستانی زبان کی ڈکشنری میں اُنیسویں صدی ہی میں داخل کیا گیا - اور اس مذہبی لفظ سے وہ عظیم الشان سیاسی مقاصد حاصل کئے گئے جو لاکھوں انسانوں کی قربانی اور کروڑوں اربوں روپیہ کے خرچ کرنے سے بھی نہیں حاصل ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں - محمد بن عبدالوہاب کون تھا اور اُس کی پیروی کیوں جُرم ہوئی - اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

محمد بن عبدالوہاب[4] | نجد کا ایک عالم[5] تھا - اُن کے اخلاص میں شک کرنا مشکل ہے البتہ

---

[1] حالانکہ اس معاملہ میں ہندو اور مسلمان کا سوال نہیں تھا - چنانچہ ایک مسلمان زمیندار نے سید صاحب کے ایک معتقد کو اس بنا پر اپنی پرائیویٹ جیل میں محبوس کر دیا کہ اُس نے ایک تعزیئے کی توہین کی تھی۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۶۸ - [2] ایضاً ص۶۸ - [3] ایضاً ص۶۹ - [4] پیدائش ۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء - آبائی وطن عیینہ جو جنوبی نجد کا ایک قصبہ ہے - نجد کے جنوبی حصہ کو العارض کہتے ہیں - اس کا مشہور شہر ریاض ہے جو آج کل سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے - عارض کو جبل یمامہ بھی کہتے ہیں - اصل میں یہ ایک پہاڑی کا نام ہے اور اس کے گرد و نواح کی زمین وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے - محمد بن عبدالوہاب کی جائے پیدائش عیینہ اور تبلیغ و دعوت کا مرکز "درعیہ" دونوں اسی وادی میں واقع ہیں (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

ان کی دعوت میں شدت تھی اور اسی بناء پر جادۂ اعتدال سے کسی قدر ہٹ گئے تھے۔ نجد کا ایک امیر محمد بن سعود ان کا مرید اور اُن کی اصلاحی تحریک میں اُن کا ہمنوا بلکہ دستِ راست بن گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "عرب" بحوالہ کتاب محمد بن عبدالوہاب)۔

خاندان: علمی تھا۔ محمد کے والد ماجد عبدالوہاب دادا سلیمان، چچا ابراہیم بن سلیمان، چچازاد بھائی عبدالرحمٰن بن ابراہیم، سب عالم اور فقیہ تھے۔ فقہ حنبلی میں ان کی تصانیف بھی ہیں جو نجد میں مقبول و مشہور ہیں۔ علم کا سلسلہ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں اسی شان و شوکت سے جاری رہا اور تقریباً ڈیڑھ صدی گذرنے کے بعد آج بھی یہ خاندان علمی ہے اور اس کا علمی وقار پورے نجد پر اثر انداز ہے۔ ذہانت اور ذکاوت، جفاکشی اور ایثار، خداداد صفات تھیں۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ پورے نجد کو متاثر کر دیا تھا۔ اپنے والد ماجد سے فقہ اور حدیث و قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ تکمیل کے لئے تقریباً ۱۱۳۵ھ، ۱۷۲۲ء میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ اساتذہ میں شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن نسیف کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے جو نجد کے ایک مقام "مجمعہ" کے باشندے تھے اور عرصہ سے مدینہ طیبہ میں درس دیتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے بعد بغرض تکمیل بصرہ (عراق) گئے اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث و سنّت کا درس لیا۔ کہا جاتا ہے کہ شام بھی تشریف لے گئے، مگر مولانا مسعود عالم صاحبؒ مصنف کتاب محمد بن عبدالوہاب اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ تکمیلِ علم کے بعد دوسروں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہوئے۔ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور قوم کی خراب رسموں کے خلاف آواز اُٹھائی اپنے وطن اصلی میں پہلی بار دعوت کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً آپ درعیہ تشریف لے گئے۔ وہاں امیر درعیہ (محمد بن سعود) نے آپ کی دعوت قبول کی اور اصلاحی مقاصد کے لئے آپ کا دستِ راست بن گیا۔ اس کے نتیجہ میں محمد بن سعود کو سیاسی منافادات بھی حاصل ہوئے۔ محمد بن عبدالوہاب، محمد بن سعود اور اس کے بعد اس کی اولاد کی سرپرستی کرتے رہے۔ تقریباً ۹۱ سال عمر پاکر ۱۲۰۶ھ، ۱۷۹۲ء میں انتقال ہوا۔ جب نجدیوں کو شکست ہوئی تو اُن کے بیٹے اور پوتے جو درعیہ میں موجود تھے، سب شہید کر دیئے گئے۔ کسی طرح کچھ زندہ رہ گئے جن سے نسل اور علم کا سلسلہ چل رہا ہے۔

Marfat.com

نجد کا غیر متمدّن صوبہ طوائف الملوکی کا آماجگاہ بنا ہؤا تھا۔ ایک ایک قصبہ کا علیحدہ حکمران تھا اور بعض قصبوں میں دو دو امیر تھے۔ علّامہ محمد بن عبدالوہاب جو ہمہ گیر دعوتِ اصلاح لے کر اُٹھے تھے، اُن کی کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شیرازہ بندی ہو۔ اور ایک بااختیار حکمران پورے مُلک پر احتساب اور کنٹرول کر سکے۔ اس جذبہ نے اس اصلاحی تحریک میں سیاسی بحران بھی پیدا کر دیا۔

محمد بن سعود "درعیہ" کا امیر تھا جو نجد کے جنوبی حصّہ کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دعوتِ اصلاح کے جذبہ نے اس کی حوصلہ مند فطرت میں نئی اُمنگ پیدا کی اور اب اس کی نگاہیں آس پاس کی ریاستوں پر پڑنے لگیں۔

شیخ کے مریدوں اور معتقدوں کی بیشتر جماعت اس کے جھنڈے تلے اکٹھی ہو گئی۔ جس سے امیر ابنِ سعود کی قوّت اپنے ہمسایہ رئیسوں میں سب سے زیادہ ہو گئی۔ اقتدار کی باگ ڈور ابنِ سعود کے ہاتھ میں تھی مگر رہنمائی کی مقدّس حیثیت شیخ کو حاصل تھی۔ اتّحادِ فکر و اتّحادِ عمل کی برکتیں بہت جلد ظاہر ہونے لگیں۔ آس پاس کی تمام ریاستیں مسلک و سیاست دونوں لحاظ سے "درعیہ" کے زیرِ نگیں ہو گئیں۔ انتہا یہ کہ ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں نجد کے مرکزی شہر ریاض میں متبعینِ شیخ کا فاتحانہ داخلہ ہؤا، اور شاہی محل پر ابنِ سعود کا جھنڈ لہرانے لگا۔ اب غیر متمدن نجد کی طاقت یہانتک بڑھ گئی کہ متمدن ترکی کے صوبوں پر بھی اس کے حملے ہونے لگے۔

حجاز کا مقدّس صوبہ مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کی وجہ سے جس طرح تمام دنیائے اسلام کا رُوحانی مرکز ہے، یہ بھی اس کو رُوحانی مرکز سمجھتے تھے۔ پڑوسی صوبہ ہونے کے علاوہ اس کی روحانی مرکزیت بھی ایک وجہ تھی جس نے مطوعین[1] (مبلّغین) کو اپنی طرف متوجّہ کیا لیکن علمائے حرم اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے شریفِ مکّہ کے آستانۂ حکومت پر دستک دی اور ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۹ء میں شریف نے نجدیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ اب نجدی فریضۂ حج

---

[1] مطوع جس کی جمع مطوعین ہے، رضا کار کو کہتے ہیں، اور اس تحریک میں مبلّغین کو بھی مطوعین کہا جاتا تھا۔

Marfat.com

کی ادائیگی سے بھی محروم ہو گئے۔

نجدی مدبرین نے حجاز کا راستہ صاف کرنے کے لئے عراق کا رُخ کیا، اور عراقی قافلوں پر لوٹ مار کر کے "شریف" کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی۔ یعنی پاسبانِ حرم پر فولاد کی ضرب نامناسب تھی، اس لئے سیم و زر کی ضرب لگائی گئی۔ اس تدبیر سے شریف کو اقتصادی نقصان ضرور پہنچا۔ مگر نجدیوں کا نفع بھی نقصان سے خالی نہیں رہا۔ کیونکہ اس چھیڑ چھاڑ کی بدولت عراق سے بھی جنگ ٹھن گئی۔ لیکن نوخیز نجد، اس کے لئے تیار تھا۔ اُس نے طاقت کا جواب طاقت سے دیا اور کامیاب رہا۔

محمد بن سعود کی وفات اور عبدالعزیز کی جانشینی محمد بن سعود کا لڑکا "عبدالعزیز" باپ سے بھی زیادہ شیخ کا معتقد تھا۔ یہ شیخ کے آغوشِ تربیت ہی میں سنِ شعور کو پہنچا تھا۔ ۱۱۷۹ھ، ۱۷۶۵ء میں محمد بن سعود کی وفات کے بعد زمامِ اقتدار قابل و فاضل بیٹے عبدالعزیز کے سپرد ہوئی۔ یہ جس طرح ملکی فتوحات میں باپ سے زیادہ چابکدست رہا۔ ایسے ہی عقیدتِ شیخ میں بھی یہاں تک سرگرم رہا کہ شیخ کی ہدایت کے بغیر ایک پیسہ نہیں خرچ کرتا تھا۔ اس نے مرکزِ حجاز سے مصالحانہ اور نرم رویّہ اختیار کیا۔ شریفِ مکّہ کی خدمت میں ایک وفد بھیج کر اہلِ نجد کے لئے اجازت چاہی۔ علماءِ حرم سے ارکانِ وفد کی خوب خوب بحثیں ہوئیں مگر نتیجہ اہلِ نجد کے حق میں بہتر رہا اور نجدیوں کو داخلۂ حجاز اور ادائے حج کی اجازت مل گئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وفات تقریباً نوّے ۹۰ سال عمر پاکر ۱۲۰۶ھ، ۱۷۹۲ء میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے عالمِ آخرت کا رُخ کیا۔ لیکن دعوت و تبلیغ کے پچاس ۵۰ سال میں شیخ کا مسلک حکومتِ آلِ سعود کا مسلک بن چکا تھا۔ اور اب "حکومتِ آلِ سعود" اور "مسلکِ ابن عبدالوہاب" ایک ہی رُوح کے دو نام اور ایک ہی طاقت کے دو روپ ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز کی علمی قابلیت، بیدار مغزی اور مسلکِ شیخ سے والہانہ عقیدت نے مسلکِ شیخ کو چار چاند لگا دیئے۔

لیکن وادیِ حجاز میں باسی کڑھی کو پھر اُبال آیا۔ نجدیوں کی شدّت پسندی نے پھر علماء کو

Marfat.com

متوجہ کیا اور شریفِ حجاز نے نجدیوں کے داخلہ پر دوبارہ پابندی لگا دی۔ نجدی اقتصادی ناکہ بندی کا تجربہ پہلے کر چکے تھے۔ انہوں نے اسی سمجھے سمجھائے سبق کو دہرانا شروع کر دیا یعنی عراقی اور ایرانی قافلوں کو پریشان کرنے لگے۔ مگر اس مرتبہ یہ چنگاریاں وسط عراق اور ایران تک پہنچ گئیں۔ سنہ ۱۲۱۶ھ، سنہ ۱۸۰۲ء میں کربلا معلّٰی، نجف اشرف اور بلد الحسین وغیرہ پر نجدیوں کی یورش ہوئی۔ ان کو خُوب لُوٹا کھسوٹا، تمام خزانے اور جواہرات فوج کے سپاہیوں پر تقسیم کر دیئے۔ متبرک مزارات کی بے حرمتی کی گئی۔

نجدیوں کے جنگ جُو دستے عراق سے پلٹے تو حجاز شریف کا رُخ کیا۔ سنہ ۱۲۱۷ھ، سنہ ۱۸۰۳ء کے آخری مہینوں میں عبد العزیز کا ولی عہد، سعود بن عبد العزیز نجدیوں کا لشکرِ جرار لے کر حرمِ مکّہ کے قریب پہنچ گیا۔ شریفِ مکّہ اگرچہ "غالب" تھا، مگر نام کا غلبہ کام نہ آسکا۔ مجبوراً مکّہ معظمہ سے فرار ہو کر طائف میں محصور ہوا۔ پھر وہاں سے جدّہ پہنچ کر ترکی فوج میں پناہ لی۔

۸ محرم سنہ ۱۲۱۸ھ، ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۰۳ء کو ابنِ عبد العزیز مکّہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا۔ کعبہ مکرمہ کا تمام قیمتی سامان اور ہیرے جواہرات کا خزانہ برآمد کیا اور فوج کو تقسیم کر دیا۔ قبے مسمار کئے۔ مزارات کی بے حرمتی کی۔ مگر اہلِ شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اُن کے ساتھ طرزِ عمل شریفانہ رہا۔ چنانچہ دوسرے دن بازار کُھل گئے اور لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔

اگلے سال سنہ ۱۲۱۹ھ، سنہ ۱۸۰۴ء میں مدینہ منورہ بھی فتح کر لیا۔ یہاں بھی وہی کیا، جو مکّہ معظمہ میں کیا۔ یعنی قبہ شریف کو کھولا اور تمام سامان اور نقد و جواہر اہلِ لشکر پر تقسیم کر دیئے۔ بہت سے مزارات شہید کر دیئے۔

عبد العزیز کی وفات مگر فتح مدینہ سے چند ماہ پہلے عبد العزیز کی وفات ہو چکی تھی۔ ۱۸ رجب سنہ ۱۲۱۸ھ، ۴ نومبر سنہ ۱۸۰۳ء کو امیر عبد العزیز حسب معمول مسجد میں عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک درویش صورت نے جو عبد العزیز کا مہمان بھی تھا، آگے بڑھ کر خنجر کی ضرب ناگہانی سے امیر کا کام تمام کر دیا۔

یہ درویش صورت ایران کا ایک شیعہ تھا جس کے کئی لڑکے ہنگامۂ کربلا میں نجدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ عبدالعزیز کے تڑپتے ہوئے لاشے نے اس کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کیا۔

عبدالعزیز کی شہادت کے بعد اُن کا لڑکا "سعود" مسند نشین ہوا۔ جس کے ہاتھ پر باپ کی زندگی میں بیعت لی جا چکی تھی۔

سعود اپنے باپ دادا کا صحیح جانشین تھا۔ مذہبی مسلک پر مضبوطی سے قائم رہا اور سیاسی برتری کی کامیاب جد وجہد کرتا رہا۔ اُس کا بیٹا عبداللہ تھا، بحیثیت نائب جنگی مہمّات اس کے سپرد ہوئیں۔ یہ پورے حجاز کو زیر نگیں کرتے ہوئے خیبر تک پہنچ گیا۔ اور دوسری جانب بحرین، عمان اور راس الخیمہ تک اپنی سلطنت وسیع کرلی۔

جذبۂ نفرت کربلائے معلّی، نجف اشرف اور بلدالحسین میں جو کچھ کیا تھا اُس نے شیعہ دنیا کو نجدیوں سے متنفّر کر دیا۔ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی کارگذاریوں نے تمام دنیائے اسلام میں محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں کے خلاف غصّہ اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اسی زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ایک جھڑپ ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ خلیج فارس کے باشندوں نے جو قبیلہ "جوازم" سے تعلق رکھتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ اس علاقہ پر اب سعودی حکومت کا سکّہ چل رہا تھا۔ انگریز کی نگاہیں ایران اور عراق پر جمی ہوئی تھیں۔ نوجوان نجدی حکومت اُن کو کھٹک رہی تھی۔ اس حملہ سے اُن کو بہانہ مل گیا۔ چنانچہ حکومتِ بمبئی نے ستمبر ۱۸۰۹ء (رمضان ۱۲۲۴ھ) میں راس الخیمہ پر سخت حملہ کر دیا، اور نجدی بیڑہ کو تباہ کیا اور نومبر ۱۸۰۹ء (شوال ۱۲۲۴ھ) تک راس الخیمہ کو جلا کر راکھ کر دیا۔

حکومتِ نجد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آویزش کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ راس الخیمہ تباہ ہو گیا بلکہ بدترین نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایسا گروہ مقابلہ پر آگیا جو پروپیگنڈے کا امام

تھا۔ ایشیا کی توہین و تذلیل اس کا نصب العین تھا، اور جبل الطارق اور واشنگٹن سے لے کر ہانگ کانگ اور سنگاپور تک اُس کے ذرائع وسیع تھے۔

بابِ عالی اور حکومتِ نجد جب تک معاملہ کشیدگی حجاز و نجد تک محدود رہا، بابِ عالی[1] نے توجہ نہیں کی۔ لیکن جب عراق و شام اور یمن بھی نجدی سیلاب کی زد میں آنے لگے تو بابِ عالی متوجہ ہوا۔ محمد علی پاشا خدیو مصر، ترکی قلمرو میں سب سے زیادہ طاقت ور گورنر اور نائب السلطنت تھا۔ بابِ عالی نے خدیو مصر کو نجدیوں کی گوشمالی پر مامور کیا۔ محمد علی پاشا اپنے حلقہ اقتدار کی وسعت کا خود بھی خواہاں تھا۔ وہ فوراً تعمیلِ حکم کے لئے تیار ہو گیا۔

مصریوں کا حملہ محمد علی پاشا نے اپنے لڑکے اور نائب "طوسون" کو دس ہزار فوج دے کر حجاز روانہ کیا۔ اواخر ۱۲۲۶ھ، ۱۸۱۱ء میں وہ ساحل پر اُترا۔ اور بآسانی ینبع پر قابض ہو گیا۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف اُس نے نقل و حرکت شروع کی۔ ذی قعدہ ۱۲۲۷ھ، نومبر ۱۸۱۲ء میں مدینہ منورہ پر پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد (محرم ۱۲۲۸ھ، جنوری ۱۸۱۳ء) میں مکہ معظمہ پر دوبارہ ترکی جھنڈا لہرا دیا گیا۔

مکہ معظمہ فتح ہونے کے بعد نجدیوں کی مزاحمت پہلے سے زیادہ سخت ہو گئی، اور مصریوں کو ایک دو میدان میں شکست ہوئی تو محمد علی پاشا خود حجاز پہنچ گیا۔

سعود بن عبدالعزیز کی وفات دونوں طرف فتح و شکست کا یہ دَور جاری تھا کہ ۱۱ جمادی الاولےٰ ۱۲۲۹ھ، یکم مئی ۱۸۱۴ء کو سلطان نجد سعود بن عبدالعزیز نے زندگی کی کش مکش سے نجات پالی۔ عبداللہ پہلے سے نائب تھا، اب مالکِ سلطنت ہو گیا۔ یہ جرنیل بہتر تھا مگر حکمران بہتر نہیں تھا۔ ایسی نازک حالت میں جس تدبّر اور بیدار مغزی کی ضرورت تھی، اس سے محروم تھا۔ اُس نے مقابلہ جاری رکھا اور کہیں کہیں کامیابی بھی ہوئی، مگر صورتِ حال سے گھبرا کر صلح کی پیش کش بھی کر دی، جو قبول نہیں ہوئی۔

---

[1] ترکوں کی مرکزی حکومت کو "بابِ عالی" اور قسطنطنیہ کو "آستانہ" کہا جاتا تھا۔

Marfat.com

اس عرصہ میں "طوسون" مصر واپس آ گیا۔ ایک سال بعد اُس کا انتقال ہو گیا محمد علی پاشا نے اگلے سال دوسرے لڑکے ابراہیم پاشا کو اس مہم کے لئے نامزد کیا۔ وہ ۶ ذیقعدہ ۱۲۳۱ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۱۶ء) کو بھاری فوج لے کر ینبع پہنچا۔ نجد کی طاقت، مصر کے مقابلہ میں کمزور تھی شکست اُن کی نظروں کے سامنے تھی مگر ناکامی کے باوجود دو سال تک مزاحمت جاری رکھی بالاخر، ۷ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ، ۸ ستمبر ۱۸۱۸ء کو مرکز حکومت "درعیہ" فتح ہوا سینکڑوں آدمی قتل کیے گئے۔ محمد بن عبدالوہاب کا خاندان موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ صرف وہی بچ سکے جو درعیہ میں موجود نہیں تھے۔ عبداللہ بن سعود ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔ دو روز بعد اس کو گرفتار کر کے مصر بھیج دیا گیا۔ ۱۹ محرم ۱۲۳۴ھ کو اسکندریہ اور وہاں سے "آستانہ" بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء، ۱۸ صفر ۱۲۳۴ھ کو وہ اور اُس کے ساتھی "اباصوفیا" کے صحن میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیئے گئے[1]۔

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ کے باشندے پہلے ہی سے منتظر تھے۔ اب اُن کے مرکز کے خاتمہ کے بعد سرزمین حجاز سے اُن کا نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ کوئی نجدی تو درکنار نجد کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہا۔ اور بقول ہنٹر:

> یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصۂ شہود پر آئی تھی اسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی[2]

بہر حال یہ بات طے ہے اور اس میں نہ اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ کسی کو اختلاف ہے کہ ۱۸۱۸ء کے آخر میں نجدی حکومت کا قلع قمع ہو چکا تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں نجدیوں سے اتنی بیزاری اور نفرت تھی کہ لوگ ان کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ بھی طے ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید اس سے چار سال بعد حج کے لئے تشریف لے گئے۔ خود ہنٹر بھی تسلیم کرتا ہے کہ ۲۳-۱۸۲۲ء میں آپ نے یہ سفر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا

---

[1] نجدیوں کے متعلق یہ تمام مضمون مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی مشہور تصنیف "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" سے ماخوذ ہے۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۸۷۔

Marfat.com

کہ نجدیوں سے متعلق تمام واقعات تازہ تھے، اور اس نفرت و بیزاری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے باوجود سید صاحب پر جو الزام لگایا گیا، اس کے متعلق خود ہنٹر صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

پروپیگنڈہ ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتے ہیں:

۱۸۲۲-۲۳ء میں امام صاحب کے مکہ تشریف لے جانے پر اس عام فہم اصلاحی عقیدہ کو وسعت دی گئی، اور باقاعدہ طور پر ترتیب دیا گیا اُنہوں نے اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا اور جو اُن کے عقائد کے مطابق تھا۔[1]

مثل مشہور ہے، دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ ہنٹر صاحب اسی کے مصداق ہیں۔ جس تحریک کے متعلق خود ہنٹر صاحب کا بیان ہے کہ جس طرح معجزانہ طور پر نمودار ہوئی تھی، اسی طرح ۱۸۱۸ء میں معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی اسی کتاب میں چند صفحہ کے فرق سے اس کے متعلق یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا۔

اس کے بعد اس تحریک کی تفسیر ایسے گھناؤنے انداز میں کی گئی ہے جو ہر ایک مسلمان کو خواہ سُنّی ہو یا شیعہ، سید احمد صاحب شہید سے متنفر کر دے۔[2]

اس سے بڑھ کر ایک اور بہتان ملاحظہ ہو:

سید احمد صاحب جب مکہ ہی میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ سید احمد صاحب کے عقائد بھی اُن صحرائی بدوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اُٹھانا پڑے۔ لہٰذا مکہ معظمہ میں اُن کی علانیہ بے عزتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۸۶ ۔ [2] ایضاً ملاحظہ ہو ص ۸۲ تا ص ۸۷

مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبدالوہاب کے مرید تھے۔[1]

الزام کتنا بڑا ہے۔ عام مسلمانوں بالخصوص فرنٹیر کے ناخواندہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے زیادہ ملعون و مردود اور واجب القتل کون ہو سکتا ہے جس کی مکہ معظمہ میں اعلانیہ بے عزتی کی گئی ہو اور مکہ معظمہ سے نکال دیا گیا ہو۔ ان غریبوں میں نہ یہ صلاحیت تھی کہ کسی خبر کا سچ جھوٹ پرکھ سکیں۔ اور نہ اُن کو ایسے ذرائع مہیا تھے کہ تحقیقات کرا سکیں۔ لہٰذا جو اُن سے کہا جاتا تھا وہ صحیح تھا۔ بالخصوص جب خود اُن کے سرداروں کی طرف سے یہ بات پہنچائی گئی تو اس کی تردید کس طرح کر سکتے تھے۔

ہنٹر صاحب کی یہ کتاب اگرچہ ایک طویل عرصہ کے بعد لکھی گئی مگر اس سے یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ پروپیگنڈے کی بنیادیں دو تھیں:

(۱) سیّد صاحب کے وہی عقائد ہیں جو نجدیوں کے عقائد تھے جن کو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے علماء نے یہاں تک غلط قرار دیا کہ اوّل اُن کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا گیا پھر اُن کے خلاف باضابطہ جہاد کر کے اُن کا قتلِ عام کیا گیا۔

(۲) ہماری حکومت بھی ترکی حکومت کی طرح باضابطہ حکومت ہے۔ لہٰذا جس طرح ترکوں کے خلاف بغاوت مذہبی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔ ہماری حکومت کے خلاف بھی بغاوت ایسا ہی جرم ہے۔

دوسری بات اگرچہ کھل کر نہیں کہی گئی مگر ترکی حکومت کے بار بار تذکرہ کا مقصد یہی ہے کہ ایک باضابطہ حکومت کا احترام دماغوں پر مسلّط کیا جائے۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صد ۸۹۔

مدِّ مقابل

انگریز یا سکھ

ان تمام تفصیلات کے بعد ضرورت تو نہیں کہ ہم سیّد صاحب کے جہاد کا مدِّ مقابل تلاش کریں۔ مگر چونکہ مطبوعہ لٹریچر میں ایسا مواد موجود ہے جس سے ایک خلجان پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان پر اطمینان بخش بحث کر لی جائے۔

(۱) شمال مغربی سرحد میں آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد جو اعلامیہ شائع کیا گیا، اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

> نہ باکسے از اُمرائے مسلمین منازعت داریم، و نہ بایکے از رؤسائے مومنین مخالفت۔ باکفارِ مقابلہ داریم نہ با مدعیانِ اسلام۔ صرف با درازمویان مقاتلہ۔ نہ با کلمہ گویان و اسلام جویان۔ و نہ با سرکارِ انگریزی مخاصمت داریم۔ و نہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایائے او ہستیم بحمایتش از مظالم بریا ایم۔[1]

ترجمہ: نہ کسی مسلمان حاکم سے ہمارا جھگڑا ہے نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت نہ غیر مسلموں سے مقابلہ ہے اور نہ مدعیانِ اسلام سے۔ ہماری جنگ صرف لانبے بال والوں سے ہے، نہ کلمہ گو اور طالبانِ اسلام سے۔ اور سرکار انگریزی سے بھی ہماری مخاصمت نہیں کیونکہ ہم اس کی رعایا ہیں اور اس کی پناہ و حفاظت میں مظالم سے محفوظ ہیں۔

(۲) منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری، سوانح احمدی میں تحریر فرماتے ہیں:

> یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد

---

[1] سوانح احمدی ص ۲۳۶۔

Marfat.com

کرنے کو جاتے ہیں، انگریز جو اس ملک پر حاکم ہے، وہ دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہے۔ گھر کے گھر میں اُن سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔

سیّد صاحب نے جواب دیا، کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ سکھوں سے جہاد کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ فرائضِ مذہبی ادا کرنے سے مزاحم ہوتے ہیں۔..... اور سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدّی نہیں کرتی، نہ اُن کو ادائے عبادت سے روکتی ہے[1] الخ

دوسرے موقع پر ایک روایت یہ پیش کی ہے کہ جب سیّد صاحب رام پور میں قیام فرما تھے تو چند افغانیوں نے آکر شکایت کی کہ انھوں نے پنجاب میں افغان عورتوں کو دیکھا ہے، اُن کو کسی طرح سکھ پکڑ لائے ہیں اور گھر میں ڈال لیا ہے وہ سکھوں کے پنجہ سے رہائی کے لئے بے چین ہیں۔ سیّد صاحب نے جواب میں فرمایا "میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا"۔[2]

کسی نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سیّد صاحب نے مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کو تحقیقِ حالات کے لئے پنجاب بھیجا۔ آپ نے لاہور امرتسر وغیرہ میں بچشمِ خود حالات کا معائنہ کیا۔ الخ

مذکورہ بالا حوالوں کی بنا پر مصنّف سوانح احمدی نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیّد صاحب کی کوششوں کے مدِّ مقابل سکھ حکومت تھی۔ مصنّف روشن مستقبل مولوی سیّد طفیل احمد صاحب مرحوم (علیگ) نے بھی مصنّف سوانح احمدی کی تقلید کی اور آپ نے کسی قدر آئینی الفاظ میں فرمایا:

پنجاب میں مسلمانوں کے مذہبی اور بنیادی حق میں صریح دست اندازی

---

[1] سوانح احمدی ص ۹۱۔ [2] ایضاً ص ۳۰

ہوتی تھی جس کی مدافعت کیلئے سید صاحب نے سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا[1]۔

مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے سکھوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے سر لیپل گرفن کا قول نقل کیا ہے کہ :

ہزارہ کے گورنر سردار ہری سنگھ نالوہ کے سخت برتاؤ اور مسلمانوں سے سخت نفرت کی وجہ سے وہاں مذہبی بلوے ہوتے رہتے تھے[2]۔

ڈاکٹر ہنٹر کی روایت نقل کی ہے :

سکھوں کے ہندووانہ تعصب نے شمالی ہند کے مسلمانوں کے جوش کو بھڑکا کر آگ کا ایک شعلہ اٹھا دیا تھا[3]۔

حقیقتِ حال لیکن واقعات کا مندرجہ ذیل تسلسل ہر ایک انصاف پسند کو اس فیصلہ پر مجبور کرتا ہے کہ سکھوں سے جو کچھ تصادم ہوا وہ محض ہنگامی حالات کا تقاضا تھا۔ سید صاحب کی پوری تحریک کا اصل مدِ مقابل انگریز تھا، اور آپ کی اس تمام جدّ و جہد کا منشا صرف یہ تھا کہ وطنِ عزیز کو انگریزی اقتدار کے شکنجہ سے نجات دلائی جائے۔

واقعات یہ ہیں (۱) سید صاحب اس تحریک کے بانی نہیں ہیں بلکہ وہ اس پارٹی کی فوجی تنظیم کے کمانڈر اور امیر ہیں جو شاہ ولی اللہؒ کے اصول پر قائم ہوئی اور جو شاہ عبد العزیزؒ کی رہنمائی میں کام کرتی رہی اور اس وقت بھی اس کا اصل مرکز دہلی تھا۔

(۲) شاہ عبد العزیز صاحب سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف ۱۸۰۳ء میں اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔ جب آپ نے مذہبی الفاظ میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دیتے ہوئے انگریزی اقتدار سے استخلاصِ وطن کی جدوجہد کو ہر مسلمان کا مذہبی فرض قرار دیا تھا۔

(۳) سکھوں کے جو مظالم رام پور میں چند پٹھانوں نے بیان کئے شاہ عبد العزیز صاحب تقریباً بیس[۲۰] سال پہلے یہی مظالم انگریزوں کے بیان کر چکے ہیں، اور اسی بنا پر

---

[1] روشن مستقبل ص۱۱۱ طبع پنجم۔ [2] ایضاً ص۱۱۱ طبع پنجم۔ [3] ایضاً

انگریزی مقبوضات کو دارالحرب قرار دے چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے فتویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب جو اوراقِ سابق میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

(۴) خود سید صاحب، امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ تقریباً چھ سال تک انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اسی جذبۂ حریت اور انگریزوں کی مخالفت نے آپ کا تعلق انگریزوں کے تیسرے مخالف دولت راؤ سندھیا سے آخر تک قائم رکھا ہے اور ۱۸۱۶ء میں سید صاحب نواب امیر علی خاں سے اسی بنا پر علیحدہ ہوئے ہیں کہ نواب صاحب نے آپ کی رائے کے برخلاف انگریزوں سے صلح کر لی تھی۔ باوجودیکہ نواب امیر علی خاں، سید صاحب کے عقیدت مند رہے اور اُن کی آرزو رہی کہ سید صاحب اُن کے ساتھ رہیں مگر سید صاحب نے اُن کے ساتھ رہنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

(۵) سید صاحب نے راجہ ہندو راؤ وزیر ریاست گوالیار اور غلام حیدر خاں منصب دار ریاست گوالیار کو جو خطوط لکھے ہیں، وہ پہلے نقل کئے جا چکے ہیں۔ اُن میں سید صاحب نے خود اپنے قلم سے اپنے جہاد کا نصب العین بیان کر دیا ہے کہ:

"بیگانگاں بعید الوطن اور تاجرانِ متاع فروش کو نکال کر مناصب ریاست و سیاست اُن اہلِ وطن کے سپرد کئے جائیں جو اس کے مستحق ہیں"۔

(۶) کھلی ہوئی شہادت جس کی کوئی تردید نہیں کی جا سکتی وہ سید صاحب کے جانشینوں کا عمل ہے۔ سکھوں کی حکومت ۱۸۴۶ء میں ختم ہو چکی ہے اور ۱۸۴۹ء تک مکمل طور پر پنجاب کا الحاق ہو چکا ہے۔ اس وقت موقع تھا کہ سید صاحب کے جانشینوں کا کیمپ جو سرحد میں تھا بند کر دیا جاتا۔ مجاہدین خدا کا شکر ادا کرتے کہ اُن کا دشمن ختم ہوا اور انگریزوں کا پرچم لہرانے لگا۔ بقول منشی محمد جعفر صاحب "جب سید صاحب نے اعلان کیا تھا کہ وہ انگریزوں کی رعایا اور انگریزی حکومت کے وفادار ہیں"۔ اب اس وفادار رعایا کو وفاداری کے اظہار کا بہترین کا موقع تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ وفادار بے نقاب ہو کر سامنے آئے اور انگریزوں کی مخالفت میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے اور اس کے باوجود کہ وہ انگریزی

Marfat.com

اقتدار کو ختم کرنے سے مایوس ہو چکے ہیں، انگریزی عمل داری میں رہنا گوارا نہیں کرتے، سرحد پار اپنا محاذ قائم کرکے انگریزی حکومت کو پریشان کرتے رہنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ع

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

انگریزی فوجیں پُوری قوت سے اُن کو بار بار کچل ڈالتی ہیں مگر وہ گِر گِر کر پھر اُبھرتے ہیں اور پھر انگریزی اقتدار کے راستہ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک انگریز ہندوستان سے رخصت نہیں ہو جاتا۔ (جس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ)۔

(۷) اگر ڈاکٹر ہنٹر کا قول قابلِ اعتبار ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی یہ تصریح نظر انداز کر دی جائے۔

(سفر حج سے) پہلے جو چیز اُن کی نظر میں محض خواب و خیال تھی اب وہ اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاش کے نیچے دفن ہوتے ہوئے دیکھا۔[۱]

(۸) سکھوں کی حکومت مشرقی پنجاب میں تھی۔ بنگال میں تو آج سے نہیں تقریباً اسی[۸۰] سال سے انگریزی حکومت تھی، پھر کیا وجہ تھی کہ جیسے ہی سید صاحب نے علاقہ سرحد میں پہنچ کر علمِ جہاد بلند کیا، سید صاحب کے مریدِ خاص نثار علی نے سفید فام خود ساختہ آقاؤں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ خود ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

۱۸۳۰ء میں جب مجاہدینِ سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو ٹیٹو میاں اس قدر بے دھڑک ہو گیا کہ اُس نے اپنا نقاب اُتار پھینکا اور ان معمولی معمولی سختیوں کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اُس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے یہ کسانوں کی

---

[۱] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۸۹۔ [۲] سیرت سید احمد شہید طبع اوّل ص۱۸۰۔

پُر جوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں۔ جس کے نتیجہ پر باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں محفوظ کر لیا۔ الخ[۱]

اس موقع پر ہندو زمینداروں کی زیادتیوں کا تذکرہ برطانوی سامراج کی وہی تفرقہ انگیز پالیسی ہے جس کی بدولت اُس نے ہندوستان فتح کیا اور تقریباً ایک صدی تک حکومت کر کے مُلک کے باشندوں کو دو متحارب کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔

بہر حال مذکورہ بالا واقعات جو آفتاب نیمروز کی طرح ظاہر ہیں یہی ثابت کرتے ہیں کہ سید صاحب کے جنگ و جہاد کا اصل مقابل انگریز تھا۔ یہ بدقسمتی تھی کہ حالات نے سکھوں سے آویزش پر مجبور کر دیا اور یہ سالہا سال کی محنت اس طرح میدان میں شکست پا گئی۔

(۹) کپتان کننگھم تاریخ سکھ میں لکھتا ہے:

"سید احمد (صاحب) کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں سے اُن کی مراد صرف سکھ تھے لیکن اُن کے صحیح مقاصد پورے طور پر نہیں سمجھے گئے۔ وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے لیکن ایک وسیع اور آباد مُلک پر ایک دور و دراز مُلک کی قوم کا اقتدار اُن کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا۔[۲]

(۱۰) اس موقع پر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ایسٹ انڈیا کمپنی گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے سیاسی اقتدار حاصل کر رہی تھی مگر اُس نے ایک تجارتی لباس میں مستور رہنا ضروری سمجھ رکھا تھا۔ واقعہ بالاکوٹ سے دو سال بعد ۱۸۳۳ء میں یک لخت تجارت کا لبادہ اُتار کر وہی حکومت کی مالک بن جاتی ہے۔

---

[۱] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۶۸۔ [۲] سیرت سید احمد شہید طبع اوّل ص ۳۲۵۔

Marfat.com

انّ فی ذٰلك لعبرة لاولی الابصار[1]

ترجمہ: اس واقعہ میں اہلِ بصیرت کے لئے ایک سبق ہے

(۱۱) جس زمانہ میں سید صاحب مصروفِ جہاد تھے، اُسی زمانہ میں ایک انگریز سیاح جس کا نام "میسن" تھا، سرحد، افغانستان اور بلوچستان کے علاقوں میں پھر رہا تھا۔ اُس نے سید صاحب کا نصب العین یہ بتایا۔

"سکھوں کا استیصال اور پنجاب پر قبضہ۔ پھر ہندوستان اور چین پر تسلّط۔"

گویا اس انگریز سیاح کو سید صاحب کے مقاصد کا اندازہ اُن مسلمانوں سے بہتر تھا جو سید صاحب کے خاص معتقدین میں شمار ہوتے تھے۔[2]

اب رہیں وہ عبارتیں جو سوانح احمدی یا روشن مستقبل سے نقل کی گئی ہیں تو اُن کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سکھ تعلّقات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں چند صفحات ملاحظہ فرمایئے۔

سِکھ، مُسلم تعلّقات

تاریخ کا یہ عنوان جس قدر تلخ ہے اُتنا ہی شیریں بھی ہے۔ یہ انگریزی ڈپلومیسی کا کمال ہے کہ اُس نے اس باب کی تلخیوں کو شدّ و مد سے پیش کیا کیونکہ اس کا نتیجہ انگریزی مقاصد کے حق میں خوش گوار اور شیریں تھا۔ اور سکھ مسلم تعلّقات کے خوش گوار حصّہ کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا۔ کیا یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ نہیں ہے کہ عین معرکۂ جنگ میں یار محمد خاں اور اُس کے ساتھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ولی عہد (شیر سنگھ) اور اُس کے جرنیل بُدھ سنگھ کے ساتھ ہیں، سید صاحب کو زہر دلوا رہے ہیں، یا اُن کے

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۷۳ چنانچہ اس کے بعد ہی بہادر شاہ کا سِکّہ موقوف ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکّہ رائج ہوتا ہے۔ محمد میاں۔ [2] سید احمد شہید ص۲۵۹۔

Marfat.com

خلاف سازش کر کے مجاہدین خدا پرست کو قتل کرا رہے ہیں - اور دوسری طرف راجہ رام ہندو سید صاحب کے توپخانہ کا کمانڈر ہے اور سکھوں کی فوج پر گولہ باری کر رہا ہے۔

سکھوں کے جتھے جن کو "مثل"[1] کہا جاتا تھا، وہ جنگ جُو جتھے تھے جن پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظم طاقت بھی عرصۂ دراز کے بعد قابو پا سکی - ان جرگوں کو وہ دردناک تباہی فراموش نہیں ہوئی ہوگی جو فرخ سیر کے دورِ حکومت میں برداشت کرنی پڑی - محض قرینِ قیاس نہیں، بلکہ واقعہ یہی ہے کہ سکھوں نے اس کے انتقام میں کسر نہیں کی - مگر اس کے باوجود سکھ مسلم تعلّقات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ :

---

[1] سکھوں کے جتھے جن کے لئے فارسی بلکہ عربی لفظ "مثل" استعمال کیا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جتھے مماثلت اور مساوات کے اصول پر بنائے گئے تھے - یہ جتھے بارہ تھے - ۱ : بھنگی مثل - بانی جسا سنگھ جاٹ --- جسا سنگھ کے بعد اس کا سردار جگت سنگھ ہوا - کہا جاتا ہے کہ وہ بھنگ بہت پیتا تھا اس لئے اس مثل کو بھنگی مثل کہا جانے لگا - ۲ : رام گڑھیہ مثل - بانی خوش حال سنگھ جاٹ ساکن امرتسر - ۳ : کنہیا مثل - بانی سردار امر سنگھ ساکن موضع کاہنہ ضلع لاہور - ۴ : اہلو والیہ مثل - بانی سردار جسا سنگھ کلاں - ۵ - سکر چکیہ مثل - بانی سردار چرت سنگھ - اس کے آبا و اجداد موضع سرچک کے رہنے والے تھے جو گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں تھا - ۶ : نکئی مثل - بانی سردار ہیرا سنگھ ساکن فرید آباد تحصیل چونیاں ضلع لاہور - اس علاقہ کو پہلے ملک نکہ کہا جاتا تھا - اسی مناسبت سے اس مثل کو نکئی مثل کہتے تھے - ۷ : ڈلی والی مثل - بانی گلاب سنگھ ساکن موضع ڈلی والی متصل ڈیرہ بابا نانک - ۸ : نشان والیہ مثل - بانی سردار سنت سنگھ و سردار موہن سنگھ - یہ دونوں سردار خالصہ کے علمبردار تھے - اسی بنا پر اُن کے جتھے کو نشان (علم) والہ کہا جاتا تھا - ۹ : کروڑا سنگھ مثل - بانی کروڑا سنگھ - ۱۰ : شہید یا نہنگ مثل - اس مثل کے سردار اُن بہادروں کی اولاد تھے جنہوں نے گورو گوبند سنگھ کے جھنڈے تلے جان دی تھی - اس میں نہنگ خالصہ بھی شامل تھے جو اکثر بدن پر نیلے رنگ کے کپڑے، سر پر آہنی چکر پہنتے تھے - ۱۱ : فضیل پوریہ مثل - اس مثل کا بانی نواب کپور سنگھ ساکن موضع فضیل پور ضلع امرتسر - ۱۲ : پھلکیاں مثل - پھول نامی ایک شخص نے اس کی بنیاد ڈالی - (ماخوذ از "مہاراجہ رنجیت سنگھ" مصنفہ پروفیسر سیتا رام کوہلی صفحات ۴۰ تا ۴۶) -

Marfat.com

(۱) مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہِ کابل "زمان شاہ" نے صوبہ پنجاب کی حکومت عطا کی۔

(۲) اگر بالفرض یہ صحیح نہیں ہے تو اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور پر قبضہ کی تحریک کرنے والوں میں مسلمان بھی پیش پیش تھے۔[1] پھر مسلمانوں کی مدد سے ہی لاہور پر قبضہ آسان ہوگیا۔[2]

(۳) غالباً یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں مسلمان کافی دخیل رہے۔ چنانچہ:

الف: مہاراجہ کے معتمد خاص اور مایۂ ناز سیکرٹری اور مہاراجہ کی کیبنٹ کے خاص رکن فقیر عزیز الدین صاحب تھے۔ غیر ملکی سفارت کا نازک فرض یہی فقیر صاحب انجام دیتے تھے۔[3]

---

[1] شاہ زمان کے رخصت ہونے کے بعد لاہور پر بھنگی مثل کے سرداروں کا قبضہ ہوگیا۔ سرداران میں نا اتفاقی تھی۔ اس لئے آئے دن جنگ و جدال رہتا تھا۔ اسی بنا پر نواب قصور نظام الدین خاں نے لاہور پر حملہ کیا۔ مگر لاہور کے سرکردہ اصحاب نے رنجیت سنگھ کے پاس درخواست بھیجی کہ وہ لاہور پر حملہ کر کے قبضہ کر لیں۔ سرکردہ اصحاب یہ تھے۔ مہر محکم الدّین۔ میاں عاشق محمد۔ بھائی گوربخش سنگھ۔ حکیم حاکم رائے۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ ص۶۹)۔ [2] رنجیت سنگھ نے اپنے معتبر قاضی عبدالرحمٰن کو تحقیقِ حال کے لئے لاہور بھیجا۔ پھر فوج لے کر لاہور کے قریب پہنچا۔ اور مہر محکم الدّین وغیرہ سے سازش شروع کر دی۔ (ص۷۰۔ کتاب مذکور)۔ جب حملہ ہوا تو مہر محکم الدّین کے حکم سے شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جس سے رنجیت سنگھ کی فوجیں بلا مزاحمت شہر میں داخل ہوگئیں (ص۷۱ مہاراجہ رنجیت سنگھ)

[3] (مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی ص۳۱۷) ایک مرتبہ جب فقیر عزیز الدّین کو دوست محمد خاں والئ کابل نے نظر بند کر دیا تو مہاراجہ نے قسم کھائی کہ جب تک ایک عزیز الدّین کے بدلہ میں ہزار افغانوں کا خون نہ گراؤں گا، لاہور واپس نہ جاؤں گا۔ مگر دوست محمد خاں نے جلد ہی فقیر کو واپس کر دیا جس سے یہ قصّہ رفع دفع ہوگیا (مہاراجہ رنجیت سنگھ ص۲۸۳)۔

Marfat.com

ب : دوسرے معتمدِ خاص جن کی خفیہ رپورٹ پر مہاراجہ پورا اعتماد کرتے تھے، قاضی عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ حملہ سے پہلے لاہور کی تحقیق حال کے لئے مہاراجہ نے آپ ہی کو بھیجا تھا۔[1]

ج : فتح کشمیر کے سلسلہ میں مہاراجہ کے لئے جس نے بہت مفید خدمات انجام دیں وہ سلطان خاں والیٔ بھمبر تھے۔[2]

د : یار محمد خاں اور اس کے بھائی دوست محمد خاں کا ذکر بار بار آچکا ہے یہ مہاراجہ کی طرف سے پشاور کے گورنر تھے۔ ان کے علاوہ ملتان کے گورنر نواب سرفراز خاں تھے۔ قصور کے گورنر قطب الدّین خاں، منکیرہ کے حاکمِ اعلیٰ حافظ احمد خاں، اور گجرات فتح ہوا تو اس کی نظامت فقیر نورالدّین کے سپرد ہوئی۔[3]

ہ : ابتدا میں مہاراجہ کے توپخانہ کا افسرِ اعلیٰ میاں غوث خاں تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا سلطان محمود خاں بڑھتے بڑھتے اپنے باپ کے عہدہ پر پہنچ گیا۔[4]

و : شیخ عباداللہ اور روشن خاں دو دو ہزار پیدل سپاہیوں کی پلٹنوں کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ جب ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ نے خطابات تقسیم کئے تو اُن کو "کمیدان" کے خطاب دیئے گئے۔[5]

ز : فتح لاہور کے بعد شہری نظم قائم کیا گیا تو نظام الدّین صاحب "قاضی" (جج) اور محمد شاہ پور اور سعد اللہ صاحب چشتی مسلمانوں کے مفتی مقرر کئے گئے۔[6] شفاخانوں کے افسرِ اعلیٰ حکیم نورالدّین قرار دیئے گئے۔[7]

ح : جب ٹکسال قائم ہوئی تو شاید کسی مسلمان ہی کی طباعی تھی کہ سکّہ کیلئے یہ شعر موزوں کیا۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ ص۶۹-۷۰۔ [2] ایضاً ص۲۲۶ [3] ایضاً ص۱۴۹۔ [4] مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی ص۳۱۷۔ [5] ایضاً ص۳۱۷۔ [6] ایضاً ص۷۸۔ [7] ایضاً ص۷۹۔

Marfat.com

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ[1]

ط : توپیں عام طور پر مسلمان ہی بناتے تھے۔ منشی عبدالکریم صاحب مصنّف تاریخ پنجاب نے ۳۸ توپوں کا تذکرہ کیا ہے جو مسلمانوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ ایک توپ پر یہ شعر درج تھے۔

جمعدار این توپ شد رائے سنگھ	کہ در جانفشانیست اولے ورنگ
بموجب صلاح لالہ مہسنگھ بار	غلام نبی گفت تاریخ وار

ایک توپ پر یہ عبارت کندہ تھی :

"ہذا الضرب موسومہ "مجنون" حسب الامر اشرف، اقدس و اعلیٰ حضور پر نُور در سمبت ۱۸۹۷ باہتمام صاحب ارسطو فطرت، فلاطون زماں موشیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بجُنِ خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح ریختہ شد۔[2]

(۴) ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹ کی شہادت یہ ہے کہ :
سکھوں کے پچاس سالہ دَورِ حکومت میں اگرچہ حکومت سکھوں کی رہی، مگر زمینداری مسلمانوں کی تھی۔ ہندو اُن کے یہاں کارندوں کی طرح کام کرتے تھے۔[3]

(۵) تعلیمی میدان پر بھی مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ ہندو اور سکھ بچوں کے سرپرست مسلمان اُستادوں پر ہی اعتماد کرتے تھے۔[4]

(۶) ۱۸۴۶ء میں جب سکھ حکومت کا انگریزوں سے معاہدہ ہوا تو شرائط صلح کے طے کرنے اور سکھ حکومت کی طرف سے عہد ناموں پر دستخط کرنے والوں میں فقیر نورالدّین

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ ص۸۷۔ [2] تاریخ پنجاب از منشی عبدالکریم صاحب از ص۱۱۲ تا ص۴۵۔ [3] رپورٹ مرتب کردہ ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ ۱۹۳۴ء ص۴۸۔ [4] حکومت خود اختیاری از سیّد طفیل احمد صاحب۔

Marfat.com

کے دستخط، ایک دستاویز موجود ہیں اور بعض موقعوں پر فقیر نورالدین کے ساتھ فقیر تاج الدین فقیر چراغ الدین اور سلطان محمد خاں بھی سکھ حکومت کے نمائندوں میں شامل نظر آتے ہیں۔[1]

خلاصہ سکھ مسلم تعلقات اور انگریزوں کے مسلم کُش کارناموں کا موازنہ موضوع بحث سے خارج ہے اور اس کا معمولی جائزہ بھی اتنا طویل ہے کہ یہ اوراق اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس کے دامن سمیٹئے اور آپ سوانح احمدی یا روشن مستقبل کے اُن اقتباسات پر ایک نظر ڈال لیجئے جو اس بحث کے آغاز میں نقل کئے جا چکے ہیں۔ آپ خود اُن کو بے معنی قرار دیں گے اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ سید صاحب کے جہادِ عظیم کی یہ تاویل ایک عرصہ کے بعد صرف اس لئے کی گئی ہے کہ سیّد صاحب سے تعلق رکھنے والے انگریزی مظالم کی دار و گیر سے نجات پا سکیں۔ اصل واقعہ یہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیّد احمد صاحب شہید، مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور اُن کے ساتھیوں کی شاندار تاریخ پر پردہ ڈالنے کی کوشش غیروں کے سوا خود اپنوں نے بھی کی ہے۔

غیروں کا عمل ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو جو گرویدگی حضرت سیّد صاحب اور اُن کے قافلہ سے تھی، اُس کو ختم کرنے اور مسلمانوں میں جذبۂ وفاداری پیدا کرنے کے لئے انگریزی سامراج کی مشنری نے وہابیت کا الزام لگایا۔

پیرانِ خام اور نادان مولویوں کا وہ طبقہ جس کو سیّد صاحب کی اصلاحات سے اقتصادی نقصان پہنچ رہا تھا، اُس نے انگریزی پروپیگنڈے کی ہمنوائی کی اور جب تک انگریزی اقتدار کا آفتاب عروج پر رہا، سیّد صاحب اور اُن کے رفقاء کی لادینیت اور وہابیت کا وہ ہنگامہ برپا کیا گیا کہ صفائی پیش کرنے والوں کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی۔

اپنوں کا کام دوسری طرف سیّد صاحب کے وہ ماننے والے جن کو وہابی کہا جاتا تھا، جب تقریباً نصف صدی تک انگریزی اقتدار سے ٹکراتے رہنے کے بعد چکنا چور ہو گئے،

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخِ پنجاب از منشی عبدالکریم صاحب۔

Marfat.com

اور مجبوراً ان کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی تو عوام کے ہنگامہ کا جواب تو انہوں نے مجالسِ مناظرہ کی ہنگامہ آرائی اور رسالوں اور پمفلٹوں کی اشاعت سے دے دیا۔ مگر انگریز کے شکنجۂ انتقام سے بچنے کے لئے لامحالہ اُن کو یہ ثابت کرنا پڑا کہ سیّد صاحب اور آپ کے ساتھی، انگریزی حکومت کے وفادار تھے، اور اُن کی مجاہدانہ سرگرمیاں صرف سکھ حکومت کے خلاف تھیں۔

ان حضرات نے سیّد صاحب کا ذکرِ خیر ضروری سمجھا۔ اس کے باقی رکھنے کے لئے سوانح اور تذکرے لکھے گئے۔ مگر پوری احتیاط سے وہ تمام حصّہ خارج کر دیا جس سے انگریزوں کی مخالفت یا مرہٹوں سے تعلّقات کا پتہ چلتا تھا۔ چنانچہ مصنف سوانح احمدی سیّد صاحب کے مکتوبات نقل کرنے سے پہلے تحریر فرماتے ہیں:

"مکتوبات کے اُس مُٹھے میں سے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے بہت سے خطبے (تقریریں) روزمرہ کی کارروائی کی رپورٹیں، نیز روسار اور خوانین کے بہت سے خطوط مَیں نے خارج کر دیئے ہیں۔ اس تمام مجموعے میں سے مَیں نے صرف ساٹھ مکتوب لئے ہیں[۱] الخ

دوسرے موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

"مختلف مؤلفوں کے لکھے ہوئے تقریباً چار ہزار صفحات میرے سامنے میز پر موجود ہیں، اُردو زبان کے بھبکے میں رکھ کر سب تازی اور شیرازی پھولوں کا عطر کھینچ لیا ہے[۲] الخ

اب اس بھبکے میں سے نکلے ہوئے خطوط اور بیانات میں برطانوی سامراج عداوت کی بُو کیسے آسکتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے سینٹ کی آمیزش کر دی جائے، جس سے وفاداری کی مہک آتی ہو۔ چنانچہ اعلام نامہ کا یہ فقرہ جو سوانح احمدی میں جلی قلم سے لکھا گیا ہے:

---

[۱] ص۲۳۷ حصّہ پنجم سوانح احمدی۔ [۲] ایضاً ص۱۸۲ حصّہ چہارم کی آخری سطور۔

Marfat.com

"نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم و نہ ہیچ راہ تنازعت کہ از رعایا راو ہستیم و حمایتش از مظالم برایاع۔"

اس کا انداز باقی تمام فقروں سے جدا ہے۔ فارسی زبان سے معمولی مناسبت رکھنے والا بھی اس جداگانہ انداز سے اسی فیصلہ پر مجبور ہوگا کہ یہ فقرہ بڑھایا ہوا ہے۔[1]

دہلی کا مرکز اور اس عرصہ میں اس کی خدمات

(۱) رضاکاروں کی فراہمی اور مالی امداد اس مرکز کے ذمہ تھی۔ یہ مرکز اس عرصہ میں یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ چنانچہ قافلہ کے ارکان جو سید صاحب کے ساتھ رہے تھے تقریباً آٹھ سو تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں لیکن سرحد پر سید صاحب کی فوج میں صرف ہندوستانیوں کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی۔ علاقہ سمہ اور پشاور کی خفیہ سازش میں جو تقریباً چار ہزار کارکن شہید کئے گئے وہ ہندوستانی ہی تھے۔ بہرحال یہ افزوں تعداد مرکز دہلی کی جدّ و جہد کا نتیجہ تھا۔

(۲) مالی امداد کا ثبوت اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں گذرا کہ دہلی کے ایک مہاجن نے سندھی کی رقم روک لی تھی۔ اس کا مقدمہ دائر کیا گیا تو انگریزی جج نے وہ رقم واپس کرائی اور ڈگری شاہ محمد اسحاق صاحب کے حق میں دی۔[2]

(۳) فضا کو ہموار رکھنا ایک بہت بڑی خدمت تھی جو "مرکز دہلی" کے سپرد تھی۔ چنانچہ اس عرصہ میں مولانا محبوب علی صاحب دہلوی جب سید صاحب سے چند جزوی باتوں پر خفا ہو کر دہلی پہنچے اور یہاں خفگی کا اظہار شروع کیا تو بقول مصنف سوانح احمدی:

---

[1] اس کتاب کی تسوید کے بعد جناب مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید" سامنے آئی۔ اس میں موصوف نے بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان عبارتوں میں تحریف کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ عبارت بلکہ اور متعدد عبارتیں بھی پیش کی ہیں جن میں تحریف کی گئی ہے۔ جہاں نصاریٰ کا لفظ تھا وہاں سکھ یا درازمو وغیرہ کا لفظ رکھ دیا گیا ہے (معاذ اللہ) ملاحظہ ہو سید احمد شہید از ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۱ ۔ [2] سوانح احمدی ص ۸۹

ع حصہ چہارم سوانح احمدی ص ۲۳۶ ۔

"مولوی محبوب علی صاحب کے اغوا سے جو صدمہ کاروبارِ جہاد کو پہنچا ایسا صدمہ آج تک اس لشکر کو کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے بھی نہیں پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی صاحب کے فتنہ کے بعد مدّت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا۔ بہت سے خطوط مولوی محبوب علی صاحب کی تکذیب میں لشکر مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مولانا محمد اسحاق صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب معاونینِ جہاد کی کوشش سے یہ فتنۂ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی"[1]

مولانا محبوب علی صاحب کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جب انگریزوں نے مولانا کی اس حرکت کو اپنے حق میں مفید سمجھ کر نو گاؤں کی جاگیر دینا چاہی تو مولانا نے صاف انکار کر دیا، کہ جو کچھ میں نے کیا وہ تمہاری وجہ سے یا تمہارے لئے نہیں کیا۔ بلکہ میں نے اپنی آزادانہ رائے سے ایک بات کو حق سمجھا اُس پر عمل کیا۔[2]

(۴) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے دستور کے مطابق مدرسہ کی خدمت کر کے دماغی تربیت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ وہ مسلمان جنھوں نے تقریباً پچیس برس بعد جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں کام کیا، اُن کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی درس گاہ سے تھا۔

(۵) واقعہ بالاکوٹ کے بعد جب یہاں نگرانی بڑھتی رہی اور کام کرنا مشکل ہو گیا تو آپ اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحب کے ساتھ ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں (یعنی واقعہ بالاکوٹ سے گیارہ سال بعد) مکہ معظمہ تشریف لے گئے تاکہ بیرونی طاقتوں کے ذریعہ ہندوستان کی اندرونی تحریکِ آزادی کو امداد پہنچائیں اور یہاں کام کرنے کیلئے اپنے خاص شاگرد مولانا

---

[1] سوانح احمدی ص۱۴۱۔ سیرت سید احمد شہید طبع اوّل ص۱۸۰ و ص۱۸۱۔ [2] سیرت سید احمد شہید طبع اوّل ص۱۸۰۔

Marfat.com

مملوک العلی صاحب کی زیر صدارت ایک بورڈ بنا دیا۔[ع]

مولانا مملوک العلی صاحب پرنسپل عربک کالج دہلی حکومت کے ملازم تھے۔ وہ سرکار کے وفادار سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی قیادت میں جو تنظیم ہو رہی تھی وہ شک و شبہ سے محفوظ تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے مجاہدین زیادہ تر مولانا مملوک العلی صاحب کے شاگرد ہی تھے دوسرے خاص شاگرد جن کو مولانا محمد اسحاق صاحب نے اپنا جانشین بنا کر مدرسہ شاہ عبد العزیز اُن کے حوالہ کیا، وہ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب تھے جن کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی جنھوں نے بذاتِ خود ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصّہ لیا، اور جب تحریک کو شکست ہو گئی تو مکہ معظمہ پہنچ کر زندگی بسر کرنی پڑی۔

مختصر یہ کہ جس بورڈ نے شاہ اسحاق صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد دہلی میں نہایت رازداری کے ساتھ کام سنبھالا۔ اس کے صدر مولانا مملوک علی صاحب تھے اور خصوصی رکن مولانا شاہ عبد الغنی صاحب اور مولانا قطب الدّین دہلوی[لہ] تھے۔

مزید تفصیل انشاء اللہ دوسری جلدوں میں آئے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

۶ رجب ۱۳۷۶ھ، ۷ فروری ۱۹۵۷ء

۱/۲ ۱۲ بجے شب۔ دہلی

اس کے بعد کی جلد میں اس تحریک کے دوسرے دَور یعنی علماء صادق پور کی قربانیاں اور اُن کی تحریک کے عجیب و غریب حالات ملاحظہ فرمائیے

لہ نواب صدیق حسن صاحب نواب ریاست بھوپال کے والد ماجد۔

ع شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک صہ ۱۸۱

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ

اس جلد میں جس کے ۲۵۱ صفحات آپ مطالعہ فرما چکے ہیں صرف تحریکات، بنیادی نظریات اور اُن کے متعلق مجاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔ افراد و مجاہدین کے شخصی حالات نہیں لکھے۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبد العزیز اور حضرت سید احمد شہید قدس اللہ اسرارہم جو تحریک کے بانی، رہنما اور امیر و امام تھے، اُن کے بھی وہی حالات لکھے ہیں جن کا تذکرہ تحریک کے سلسلہ میں ضروری تھا۔ جہاں تک مجاہدین کے شخصی حالات کا تعلق ہے، جناب غلام رسول صاحب مہر اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ چنانچہ آپ کی دو تصنیفیں "جماعت مجاہدین" اور "سرگذشت مجاہدین" اس سلسلہ میں شائع ہو چکی ہیں اس کے بعد کسی اور تصنیف کی ضرورت تو باقی نہیں رہی۔ تاہم اگر توفیق میسر ہوئی تو ارادہ ہے، کہ شاندار ماضی کی ایک مستقل جلد میں ان بزرگوں کے شخصی حالات درج کئے جائیں گے (والامر بید اللہ)

البتہ چند حضرات جن کے نام مولانا ابوالحسن علی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف سیرت سید احمد شہید جلد اوّل میں تحریر فرمائے ہیں اور عجیب اتفاق ہے کہ مہر صاحب جماعت مجاہدین میں اُن کا تذکرہ نہیں کر سکے، اور اگر کسی کا ذکر آگیا ہے تو وہ تشنہ ہے۔ ان کے متعلق جو انکشافات فراہم ہو چکے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں پیش کر دیئے جائیں۔ ان کا تذکرہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ تحریک کے بعض پہلوؤں پر اُن سے روشنی پڑتی ہے۔

مناسب ہونے کا ایک سبب ایسا بھی ہے جس کو خود غرضی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی چند بزرگ ایسے ہیں جن سے کاتبِ حروف خاندانی وابستگی رکھتا ہے۔ ان انکشافات کا ذریعہ چار حضرات ہیں:

(۱) ہندوستان کے مشہور رہنما ڈاکٹر سید محمود صاحب جن کا تذکرہ کتاب میں

متعدّد جگہ آچکا ہے۔

(۲) یوسف پور محمد آباد ضلع غازی پور کے ایک بزرگ مولانا حکیم محمد الحسن صاحب انصاری، جن کا تعلق اس معزز خاندان سے ہے جو تحریکِ آزادی میں آخر تک پیش پیش رہا۔ جس کے ممتاز اور مشہور افراد حکیم نابینا صاحب انصاری، حکیم عبد الرزاق صاحب انصاری ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری عرف ڈاکٹر انصاری، میجر عثمان اور پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کے خاص دوست ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری ہیں۔

(۳) سیّد محسن صاحب جو غازی پور کے ایک علم دوست بزرگ ہیں۔

(۴) میرے خاندانی عزیز سیّد محبوب حسن صاحب رضوی انچارج شعبۂ مخطوطات ومحفوظات (محافظ خانہ) دار العلوم دیوبند ومصنف تاریخ دیوبند وغیرہ۔

قاضی فرزند علی صاحب جن کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ جن سے سیّد صاحب کو بھی اس درجہ تعلق خاطر تھا کہ جب محمد آباد پہنچے تو قالب محمد آباد میں تھا اور قلب کسی اور طرف کھنچ رہا تھا۔ اسی اضطراب میں "بوئے دوست مے آید" فرماتے ہوئے پا پیادہ یوسف پور پہنچ گئے۔ جہاں قاضی صاحب علالت کی وجہ سے قیام فرما تھے۔ یہ قاضی صاحب جن کی عدیم المثال قربانی یہ تھی کہ عمدہ گھوڑے، اسلحہ، قرآن شریف کے متعدد نسخوں اور ایک لاکھ روپیہ نقد پر بھی جذبۂ ایثار مطمئن نہ ہوا تو اپنے فرزند ارجمند "امجد" کو راہِ خدا میں شہادت کے لئے پیش کر دیا۔ جو زندگی میں زندہ شہید کہلائے اور آخر کار جامِ شہادت نوش فرما کر زندہ جاوید ہو گئے۔ ان کے متعلق اُن کے پوتے ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کی ایک تحریر[1] کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

قاضی فرزند علی صاحب یوسف پور کے رہنے والے نہ تھے بلکہ قصبہ سیّد پور بھتیری کے باشندے تھے۔ جس کا تعلق پہلے سرکار جون پور سے تھا۔ پھر غازی پور میں شامل ہو گیا۔ یوسف پور اُن کی سسرال تھی اور جب

---

[1] یہ احقر کے نام ڈاکٹر صاحب کا ایک خطبہ مؤرخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۴ء۔

سید صاحب محمد آباد پہنچے تو قاضی صاحب اپنی سسرال میں مقیم تھے علالت کی وجہ سے سید صاحب تک نہ پہنچ سکے تھے۔ مَیں اپنے بزرگوں سے یہ بھی سنتا رہا ہوں کہ سید صاحب، مولانا اسمٰعیل صاحب وغیرہ قاضی صاحب کے پاس سید پور بہتیری بھی تشریف لائے تھے۔

ممکن ہے یوسف پور میں ملاقات کے بعد قاضی صاحب، سید صاحب اور مولانا شہید کو جس طرح غازی پور لے گئے اپنے وطن اصلی یعنی بہتیری بھی لے آئے ہوں۔

قاضی صاحب کا خاندان یہ مشائخِ طریقت کا ایک خانوادہ تھا جو دولتِ علم کا سرمایہ دار رہا۔ اس کے مورث بندگی[1] حضرت شاہ جمال صاحب اور بندگی حضرت شاہ کمال صاحب تھے۔

اکبر بادشاہ جب بنگالہ کی مہم پر گنگا کے راستہ جارہا تھا۔ جب اس کی کشتیوں کا قافلہ سید پور کے قریب لنگر انداز ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ دو تین میل کے فاصلہ پر ایک خانقاہ ہے جس میں ایک بلند پایہ بزرگ اقامت گزیں ہیں۔ اکبر نے اُن سے ملاقات کے لئے حاضر ہونا چاہا۔ خانقاہ نشین بزرگ نے ملاقات سے معذرت کر دی البتّہ چند بیر بادشاہ کے لئے بھیج دیئے۔ بادشاہ نے خلوت گزیں بزرگ کی اس توجّہ کو فالِ نیک سمجھا کہ یہ سفر بار آور ہوگا

---

[1] یہ لفظ ہمارے خاندان میں بھی حضرت سید ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے بولا جایا کرتا تھا جو سب سے پہلے سرزمین دیوبند میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ بندگی فارسی کے مشہور لفظ "بندہ" سے ماخوذ ہے۔ بندہ غلام کو بھی کہتے ہیں اور فرماں بردار اور اطاعت گزار کو بھی۔ مثلاً بندگانِ عالی متعالی۔ بندگی کے معنی غلامی، اطاعت اور عبادت۔ ہمارے اضلاع سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ وغیرہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کو سلام کے بجائے "بندگی" بولا کرتے تھے جو اب تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ بزرگوں کیلئے "بندگی" کا لفظ غالباً مستحق تعظیم اور مطاع یعنی واجب الاطاعت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے جواز کی توجیہ اور تاویل ہو سکتی ہے مگر احتیاط یہی ہے کہ یہ لفظ اس موقع پر استعمال نہ کیا جائے کیونکہ بندگی صرف اللہ کے لئے ہے۔ محمدؐ میاں

Marfat.com

بہر حال جب اکبر بنگال و بہار کی مہم سر کرکے واپس ہوا تو بطور مدد معاش خانقاہ کے لئے جاگیر دینی چاہی۔ شاہ صاحب نے جاگیر سے بھی معذرت کر دی۔ مگر آپ کی اولاد کی مرضی پاکر بادشاہ نے چند گاؤں ان کی اولاد کو دے دیئے۔ جو اس خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلے آ رہے تھے۔ خاتمہ زمینداری کا قانون بننے کے بعد اُن کا سلسلہ ختم ہوا۔ جب شاہ صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ افسوس سلسلۂ فقیری ختم ہوا۔ اب اس خاندان میں دنیا آگئی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد اس خاندان کے ایک بزرگ "قاضی احمد علی صاحب" سرکار جونپور میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس خاندان کے افراد نے بڑی جائداد پیدا کی اور امیر کبیر ہوگئے۔

قاضی صاحب کے اوصاف قاضی فرزند علی صاحب بڑے دبدبہ کے بزرگ تھے۔ اور بڑے فیاض اور باخدا آدمی تھے۔ اُن کے دسترخوان پر سو پچاس آدمی ہمیشہ موجود رہتے۔ بڑے تزک اور احتشام سے ایک گروہ لے کر حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں سے زرِ کثیر صرف کرکے عجیب و غریب تبرکات ساتھ لائے جو آج تک خاندان میں موجود ہیں مثلاً موئے مبارک اور ایک قرآن شریف جو ہرن کی جھلی پر لکھا ہوا ہے۔ یہ دو تین ہاتھ لانبا اور ایک بالشت چوڑا ہے۔ ایک کھڑاؤں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے۔ ایسے ہی ایک پیراہن ہے جس پر خطِ کوفی میں چند آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں۔

قاضی صاحب کا ترکہ قاضی صاحب نے بہت بڑی املاک ترکہ میں چھوڑی جس کا بڑا حصّہ بنارس کے ایک مہاجن نے دھوکہ سے بالا بالا نیلام کرا لیا۔ اُس وقت مسلمان شرفاء انگریزوں کی عدالت میں نہیں جاتے تھے، یہ بات اپنی شرافت سے بعید سمجھتے تھے۔

جب جائداد نیلام ہوئی تو میرے والد کم عمر تھے۔ بالغ ہونے پر لوگوں نے کہا کہ تم اپنے حصّہ کے متعلق عدالت سے رجوع کرو۔ والد صاحب نے فرمایا۔

یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ انگریزوں کی عدالت میں حاضری دوں[1]۔

---

[1] اس قسم کا واقعہ احقر کے خاندان کے ایک بزرگ کے متعلق بھی مشہور ہے۔

Marfat.com

قصبہ سید پور بھتری یہ قصبہ بہت پرانا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑی لاٹ ہے جس پر پالی میں عبارت کندہ ہے۔ سکندر گپت نے اس جگہ ہن کو شکست دی تھی۔ ہندوستان میں یہ شاید پہلی جگہ ہے جہاں باہر سے آنے والے شکست کھا کر فرار ہوئے۔ اونچے اونچے ٹیلے ہیں۔ عید گاہ ایک بہت اونچے ٹیلے پر ہے۔ یہاں گنج شہیداں مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بڑی لڑائی ہوئی ہوگی۔ ایک جامع مسجد ہے۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ نے یا اکبر بادشاہ نے بنوائی تھی۔ عید گاہ ایک ندی کے کنارہ پر ہے۔ اس ندی پر فیروز شاہ کا بنوایا ہوا پُل ہے۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں پانی برسنے پر چاندی کے چھوٹے چھوٹے سکّے ملا کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں بھتری میں قد آدم زمین بغیر اجازت نہیں کھود سکتے تھے۔ ممانعت تھی، کیونکہ خزانے اکثر برآمد ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں نے یہاں سے بہت سے دفینے نکالے ہیں۔

مشہور ہے کہ قاضی فرزند علی صاحب یا قاضی احمد علی صاحب کے زمانہ میں ایک کنویں میں سے ایک سونے کی تھالی نکلی تھی۔ اس پر پتھر کی کچھ مورتیاں جڑی ہوئی تھیں یہ پتھر آفتاب کے طلوع اور غروب سے رنگ بدلتا رہتا تھا۔ راجہ بنارس نے اس کو بہت کچھ دے کر حاصل کرنا چاہا۔ لیکن قاضی صاحب موصوف نے قبول نہیں کیا کہ مورتیوں کی بیع جائز نہیں۔

میرے والد صاحب کے وقت میں ایک چاندی کی تختی نکلی تھی جس پر کچھ عبارت کندہ تھی۔ مشہور ہے کہ اس کو لندن بھیج دیا گیا تھا۔ پندرہ برس ہوئے ایک شخص نے خواب میں کسی بزرگ کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں۔ مجھے نکال لو، میں فلاں جگہ مٹی کے بوجھ میں دبا ہوا ہوں۔ اُس جگہ جہاں پتہ بتایا گیا تھا، ایک ٹیلہ تھا۔ ٹیلہ کھودا گیا تو اندر سے ایک پختہ قبر برآمد ہوئی۔ اس وقت سے یہ "شہید مرد کی قبر" مشہور ہے۔

قاضی فرزند علی صاحب کا مزار غازی پور میں اُن کے عالی شان محل میں رہا ہے۔ یہ

Marfat.com

محل اب شکستہ ہو گیا ہے۔ صرف چہار دیواری اور چند بُرجیاں باقی ہیں۔ یہ کسی ہندو کے قبضہ میں ہے۔ اس عمارت کی زمین بہت زیادہ ہے[1]۔

شاہ منصور عالم صاحب غازی پور کے ایک ذی علم رئیس تھے اُن کے جدّ امجد اور خاندان کے مورثِ اعلیٰ شاہ جنید صاحب مرحوم تھے۔ جن کی درگاہ غازی پور اسٹیشن کے قریب ہے۔ اب بھی یہ خاندان ذی مرتبہ اور خوش حال ہے۔ (سید محسن صاحب)۔

شاہ منصور عالم صاحب محلہ میاں پورہ کے باشندہ تھے۔ اس خاندان کے لوگ اور یہ محلّہ اب بھی باقی ہے۔ اسد منزل میں شاہ ابوالفیض صاحب کانگریسی نوجوان اسی خاندان سے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ (مولانا حکیم احسن صاحب)۔

غالباً اسی وجہ سے ڈاکٹر شوکت صاحب کو شاہ شوکت اللہ انصاری بھی کہا کرتے ہیں۔ (محمّد میاں)

مولانا محمد فصیح صاحب حضرت سیّد صاحب کے خلفاء میں مولانا محمد فصیح صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ یہ بزرگ شخصیت محلّہ روئی منڈی میں تھی۔ ان کے اخلاف نے برٹش حکومت میں بہت شہرت حاصل کی شمس العلماء مولوی ابوالخیر صاحب اس حکومت کے مشہور خیر خواہ تھے۔ مولوی ابواللیث صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ بقیدِ حیات ہیں۔ مولانا محمد فصیح صاحب کا اب تک سالانہ عرس ہوتا ہے (مولانا حکیم احسن صاحب)۔

مولانا محمد فصیح صاحب ضلع غازی پور اور اس سے متصل ضلع شاہ آباد آرہ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہ حنفی مسلک تھے۔ تحریکِ وہابیت کے بانی مولانا ولایت علی صاحب (صادق پوری) جن کے عظیم الشان کارناموں کا تذکرہ اس سلسلہ کی تیسری جلد میں آئے گا۔ (انشاء اللہ) اُن سے مناظرہ کی نوبت بھی آئی (ملاحظہ ہو سوانح احمدی مصنفہ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری)۔ مولانا محمد فصیح صاحب کے صاحبزادے مولانا نعمت اللہ صاحب تھے۔

---

[1] مکتوب ڈاکٹر سید محمود صاحب مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۴ء از حق منزل۔ چھپرہ۔ صوبہ بہار۔

Marfat.com

آپ کا قائم کیا ہوا "مدرسہ حنفیہ" آرہ (شاہ آباد) میں اب تک ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد احقر کی تدریسی زندگی کا آغاز اسی مدرسہ سے ہوا تھا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے جب استاذ الحدیث علامہ مولانا انور شاہ کشمیری ایک جلسہ میں شرکت کے لئے بہار تشریف لے گئے تھے تو مدرسہ حنفیہ کے اربابِ حل وعقد نے آپ سے ایسے شخص کی فرمائش کی تھی جو مدرسہ حنفیہ میں ادبیات کا درس دے سکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت الاستاذ مولانا الحافظ الحاج محمد اعزاز علی رحمہ اللہ کے مشورہ سے اس ناکارہ کو اس خدمت کے لئے مامور فرمایا[1]۔ چنانچہ تقریباً تین سال یہاں قیام رہا۔ پھر احقر کو انہیں بزرگوں نے جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد منتقل فرما دیا۔

عمر کا بہترین حصہ اسی مدرسہ شاہی کی خدمت میں صرف ہوا اور اسی مدرسہ کی سیر چشمی اور حریت نوازی کا طفیل تھا کہ احقر کو ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سیاسی تحریکات میں حصہ لے کر جنگ آزادی میں اپنی امنگیں نکالنے کا موقع میسر آیا۔

شیخ غلام ضامن صاحب غازی پور کے ایک سربرآوردہ زمیندار تھے بہت علم دوست۔ اُن کے خاندان میں اب یہاں کوئی نہیں رہ گیا۔ اُن کے پڑپوتے مولوی صدرالدین صاحب کا کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ (سید محسن صاحب)

قاضی محمد محسن صاحب موضع پچوکیا کے مشہور رئیس تھے۔ غازی پور میں بھی اُن کا مکان تھا، اور اسی مناسبت سے اس محلہ کو قاضی ٹولہ کہتے ہیں۔ اب اس خاندان میں یہاں کوئی نہیں رہ گیا۔

---

[1] ایک سبق آموز لطیفہ: مدرسہ حنفیہ کے مہتمم ایک وکیل صاحب تھے۔ اُن کا اسمِ گرامی محمد صفی صاحب تھا نہایت شریف، کم سخن اور بہت سنجیدہ۔ اُن کے ایک فرزند کا نام محمد فصیح تھا۔ وکیل صاحب کی ارادتمندی قابلِ قدر اور سبق آموز ہے کہ وہ حضرت مولانا محمد فصیح کے احترام میں اپنے لڑکے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ اس اسمِ گرامی کی مناسبت سے اس کو مولانا کہا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ صاحبزادے مولانا نہیں تھے بلکہ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔

Marfat.com

اب سید محبوب حسن صاحب رضوی کے مکتوبِ گرامی کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) سید مقبول احمد صاحب۔ ان کا صحیح نام حافظ سید مقبول عالم ہے۔ ابن حافظ سید محمد عالم۔ ہمارے خاندان میں حضرت سید محمد جمیل کی اولاد میں ہیں سید محمد جمیل حضرت الحاج سید محمد ابراہیم قدس اللہ سرہ العزیز کے پوتے ہیں۔

(۲) مولانا شمس الدین صاحب۔ یہ قصبہ دیوبند کے مشہور واعظ مولانا عبدالخالق صاحب کے والد ماجد تھے۔ اُن کی اولاد میں مولانا عبدالشکور صاحب مدظلہ العالی ہیں۔ جو عرصہ تک مدرسہ حسین بخش دہلی میں صدر مدرس رہے اور اب تقریباً دس سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ مولانا عبدالخالق صاحب کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ دیوبند کی عظیم الشان جامع مسجد کے لئے جس نے گاؤں گاؤں اور

لہ یہی وہ بزرگ ہیں جو جہانگیر بادشاہ کے دور میں دیوبند آکر قیام فرما ہوئے۔ قصبہ دیوبند کی آبادی سے باہر شمال کی جانب محلہ پیرزادگان ہے۔ یہیں اُن کا اور اُن کے فرزند سید محمد اسمٰعیل صاحب کا پختہ مزار ہے۔ یہ جگہ اُس زمانہ میں غیر آباد تھی۔ خاندانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں جنگل تھا۔ سید محمد ابراہیم صاحب اسی ویرانہ جنگل میں فروکش ہوئے تھے۔ اس سے مشرق کی جانب تقریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہندوؤں کی ایک مشہور تیرتھ ہے۔ جہاں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کو دیبی کنڈ کہا جاتا ہے۔ اس کے کنارے پر مندر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے قریب ایک بزرگ شاہ عباس صاحبؒ کا مزار ہے۔ عرف عام میں اس کو جنگل بانس کہا جاتا ہے۔ اہل علم بزرگوں سے سُنا ہے کہ شاہ عباس صاحبؒ علامہ ابن جوزیؒ (اُستاذ حضرت شیخ سعدیؒ) کے شاگرد تھے، حضرت شیخ سعدیؒ کے ہم سبق۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ شیخ سعدیؒ جب ہندوستان تشریف لائے تو اپنے انہیں دوست سے ملاقات کے لئے دیوبند بھی تشریف لائے تھے یہ محلہ پیرزادگان عرصہ سے قصبہ دیوبند کا محلہ مانا جاتا ہے۔ لیکن کاغذات پٹواری کے اندراجات کے لحاظ سے یہ ایک مستقل موضع ہے جس کا نام نُور پور ہے ملحق دیوبند۔

Marfat.com

قصبہ قصبہ گشت کرکے چندہ کیا، وہ یہی بزرگ ہیں۔ مولانا شمس الدّین صاحب ابتدار میں رسومات کے پابند تھے۔ حضرت سیّد صاحب کی تشریف آوری کی خبر سُنی تو آپ کی ہجو میں ایک نظم لکھی جو دیوبند میں بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھ گئی۔ جب سیّد صاحبؒ تشریف لائے اور انہیں کے محلّہ کے قریب قاضی کی مسجد میں فروکش ہوئے تو مولانا شمس الدّین صاحب بھی ایک روز دیکھنے کے لئے آگئے اور مجلس میں ایک کنارہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت سیّد صاحب اُن کی طرف متوجّہ ہوئے اور اُن کی اس نظم کا تذکرہ ایسے انداز سے فرمایا کہ مولانا شمس الدّین صاحب تڑپ کر اُٹھے اور سیّد صاحب کے قدموں میں جا پڑے۔ سیّد صاحب نے اُن کو سنبھالا۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ مولانا شمس الدّین صاحب تائب ہوئے۔ پھر بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

(۳) شیخ رجب علی صاحب بن شیخ خودمند۔ دیوان لطف اللہ عثمانی جو اُمرائے شاہجہانی میں سے تھے، اُن کی اولاد میں ہیں۔ یہ محلّہ دیوان کے رہنے والے تھے۔ یہ مولانا محمد مبین صاحب خطیب عیدگاہ دیوبند کے دادا ہوتے ہیں۔

(۴) منوّر علی صاحب۔ مجھے جو نام معلوم ہو سکا، اس کی ولدیت رجب علی کے بجائے سیّد فضل علی ہے۔ یہ میرے دادا سیّد نوازش علی مرحوم کے چچا ہوتے ہیں۔ قاضی مسجد کے متصل ہی (جہاں حضرت سیّد صاحب فروکش ہوئے تھے) اُن کا مکان ہے۔ سلسلۂ اولاد منقطع ہے۔

(۵) مولوی بشیر اللہ صاحب۔ بن شیخ عزیب اللہ عثمانی۔ حکیم صفت احمد صاحب کے پڑدادا ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیوان لُطف اللہ صاحب کی اولاد سے ہیں۔

(۶) مولوی فرید الدین صاحب۔ بن شیخ محمود بخش۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ صاحب، کی اولاد میں سے ہیں۔ دار العلوم کے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے والد ماجد تھے۔ دار العلوم کے شمالی دروازے کے میدان میں اُن کی قبر ہے۔ مشہور ہے کہ رات میں اکثر لوگوں نے قبر سے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سُنی ہے۔ علماء نے بنا راسے

Marfat.com

تحصیل علم کی تھی - قصبہ راجو پور میں پڑھانے کا مشغلہ تھا - اپنے زمانہ کے زبردست بزرگ سمجھے جاتے تھے -

مولانا فرید الدین کے چار بھائی اور تھے - محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی اور سید احمد - مولوی سید جعفر علی صاحب بستوی نے شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں - ایک شیخ بلند بخت اور دوسرے سلو خاں - میرا خیال ہے کہ سلو خاں اصل میں سید احمد ہیں - سلو بچپن کا نام ہے جو بعد میں بربنا تہوّر و جوانمردی سلو خاں زبان زد ہوگیا - یہ میرا ننھیالی خاندان ہے - مؤخر الذکر تینوں حضرات بالاکوٹ میں شہید ہوئے ہیں - بلند بخت شادی شدہ تھے اور مقصود علی اور سید احمد کنوارے - ان تینوں بھائیوں کے بارے میں یہ روایت خاندان میں مشہور ہے کہ جب مولانا فرید الدین صاحبؒ کا انتقال ہوا تو یہ تینوں شہید بھائی اُن کے جنازے میں شریک دیکھے گئے - اس کے بعد غائب ہوگئے - حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے جب اُن لوگوں کا حلیہ بیان کیا گیا تو فرمایا "یہ تینوں میرے شہید چچا تھے"

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر تینوں شہید بھائی اپنے والد شیخ محمود بخش صاحب سے بھی ملے تھے - حال یہ تھا کہ بدن زخموں سے چُور اور خون جاری تھا گویا کہ ابھی زخمی ہوئے ہیں - واللہ اعلم بحقیقۃ الحال -

اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز یہ واقعہ سُننے میں آیا ہے کہ شیخ بلند بخت شہادت کے بعد اکثر اپنی بیوی کے پاس آتے اور شب بھر قیام کرتے - گھر والوں نے جب رات کی تنہائی میں اُن کی اہلیہ سے کسی اجنبی مرد کو باتیں کرتے سُنا تو اُن کو متہم کرنا شروع کیا - اس بات سے مجبور ہو کر اُن کو اصل واقعہ بتانا پڑا جس کے اظہار کی شوہر کی طرف سے سخت ممانعت تھی - واقعہ کا علم ہو جانے کے بعد کہتے ہیں کہ شیخ بلند بخت صاحب نے آنا موقوف کر دیا -

(۷) شیخ حفیظ اللہ - دیوبند کے مشہور بزرگ شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر

Marfat.com

محلہ ابو البرکات موسوم ہے) کی اولاد میں تھے۔ سید صاحب کی معیت میں شریک جہاد رہے مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ کے بارے میں شیخ حفیظ اللہ صاحب کی متعدد روایتیں "سید احمد شہید" میں نقل کی ہیں۔

دیو بند میں غازی کے لقب سے ملقب تھے۔ بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد ایک مرتبہ دیو بند سے گذر رہے تھے۔ آموں کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے سڑک سے گذرتے ہوئے دیکھا، تو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اصرار کیا کہ گھر چلئے، بیوی بچے آپ کی جدائی سے مغموم اور پریشان ہیں۔ غازی حفیظ اللہ صاحب پر وارفتگی کا عالم طاری تھا، بولے۔ ہمارا تو ایک ہی محبوب تھا (سید صاحبؒ)۔ وہی ہم سے بچھڑ گیا ہم اسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر لوگ باصرار گھر لے آئے۔ جب ٹونک میں سید صاحبؒ کے رفقاء جمع ہوئے تو یہ بھی ٹونک تشریف لے گئے۔

سید محبوب حسن رضوی

۱۷ر جولائی ۱۹۵۵ء

وقائع احمدی کے قلمی نسخے کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ غلام حسین صاحب | کلکتہ کے ایک تاجر تھے جن کو انگریزوں نے فخر التجار کا خطاب دے رکھا تھا۔ اوّل اوّل سید صاحب سے الگ رہے اور پھر حاضر خدمت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی اہلیہ محترمہ نے حاضری پر مجبور کیا۔ بہر حال اُن کے فخر التجار ہونے کی شان ملاحظہ فرمائیے۔

گوداموں کا کرایہ ماہانہ پانچ ہزار روپیہ دیتے تھے۔ مصر، یمن، عرب، شام وغیرہ بہت سے ممالک میں ان کی کوٹھیاں یعنی برانچ آفس تھے۔ انگریزی، فرانسیسی، چینی، ترکی، کوکنی، فارسی، عربی وغیرہ تیرہ ۱۳ زبانوں میں اُن کے یہاں سے خط و کتابت ہوتی تھی۔ ہر ایک ملک کی کچہری (دفتر) جدا جدا تھی۔ (وقائع احمدی)

مرزا بلاقی اور مرزا حاجی | قیام بنارس کے سلسلہ میں اُن کے نام آئے ہیں۔ تمام

Marfat.com

سوانح نگار اُن کو شاہزادے لکھتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ بظاہر اُن کا تعلق اودھ کے شاہی خاندان سے تھا اور یہاں جلاوطن کی حیثیت سے نظر بندی کی زندگی گذار رہے تھے۔ وقائع احمدی میں اُن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

مرزا بلاقی اور مرزا حاجی جو بنارس میں شاہزادے تھے انہوں نے تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی۔ آپ نے منظور فرمائی۔ یہ کشتی پر سوار ہو کر رات کو حضرت کی کشتی کے پاس پہنچے۔ سیّد صاحب نے کشتی پر پہنچ کر اُن سے تقریباً دو گھنٹہ گفتگو کی۔
(ص ۶۶۳ وقائع احمدی قلمی)

دوسرے موقع پر تحریر ہے:

شاہزادے محمود بخت عرف مرزا بلاقی مقیم تیلیا نالہ، اپنے مکان میں لے گئے (بظاہر کشتی پر ملاقات کے بعد) مرزا بلاقی، اُن کی اہلیہ اور والدہ نے اور تمام نوکروں چاکروں نے بیعت کی۔ والدہ صاحبہ صاحبِ کشف و کرامات اور صاحبِ مراقبہ ہو گئیں۔ مرزا بلاقی نے دو وقت، اُن کی والدہ نے ایک وقت ' بیوی نے ایک وقت دعوت کی۔ پہلے پُر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ پھر حضرت کی فرمائش پر سادہ کھانا، پلاؤ اور قورمہ روٹی پر کفایت کی گئی۔ سیّد صاحب مرزا بلاقی کے مکان پر کئی بار تشریف لے گئے۔

قافلہ کا ہر شخص حافظ قرآن تھا

سلوک میں تلاوتِ قرآن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذکر و اذکار سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ اگرچہ جلد حاصل ہو جاتی ہے مگر اتنی پختہ نہیں ہوتی۔ ہر وقت اُس کے زوال کا خطرہ رہتا ہے مگر کلام اللہ شریف کے وِرد سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ پختہ ہوتی ہے، اگرچہ دیر میں حاصل ہوتی ہے۔

حضرت سیّد صاحب کے یہاں ذکر و مراقبہ کے مشاغل بھی جاری رہا کرتے تھے مگر سُلوک بالقرآن یعنی کلام اللہ شریف سے انتہائی شغف اور اس کی تلاوت کا بے پناہ شوق، یہ بھی آپ کے طریقۂ ارشاد و سُلوک کا اہم جزو تھا۔ جس کی

Marfat.com

شہادت مندرجہ ذیل واقعہ سے مہیا ہوتی ہے۔

مکہ معظمہ میں جائزہ لیا گیا تو ہر ایک مرد اور عورت حافظ قرآن تھے حتیٰ کہ دس سالہ بچے بھی حافظ قرآن تھے۔ ایک مرتبہ مکہ معظمہ کے ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی تو حفظِ قرآن کا تذکرہ آیا۔ سیّد صاحب کے رفقاء میں سے کسی صاحب نے فرمایا:

کیا کوئی مسلمان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو حافظ قرآن نہ ہو۔ اس پر گفتگو کرنے والے کو تعجب ہوا۔ اُنہوں نے کہا۔ آپ کے ساتھیوں میں سب حافظ ہیں؟ جواب اثبات میں دیا گیا۔ پھر تحقیق کی گئی تو نہ صرف ہر ایک مرد بلکہ معلوم ہوا کہ عورتیں، حتیٰ کہ دس سالہ بچے بھی حافظ قرآن ہیں۔ (وقائع احمدی ص۸۴۵)

فوج میں گروپ بندی پہلے فوج میں پچیس پچیس کے گروپ بنا دیے گئے تھے۔ آٹا پیسنا، کھانا پکانا، لکڑیاں لانا۔ سب انہیں کے سپرد تھا جس کو وہ باری باری انجام دیتے تھے۔ حجامت بھی خود آپس میں ہی بنا لیتے تھے۔ (وقائع احمدی ص۱۲۲۵)۔

تعاون اور ہمدردی کی رُوح یہاں تک ترقی پا چکی تھی کہ کوئی ایک شخص محنت کا کوئی کام شروع کرتا تو دوسرے بغیر کہے اُس میں شریک ہو جاتے تھے۔ جن کاموں میں باری مقرر تھی اُن میں بھی یہی رُوح کارفرما تھی۔ جو اپنی باری سے فارغ ہو چکا تھا۔ اگر موقع پاتا تو وہ باری والے کا شریک ہو جاتا۔ (ص۱۲۵۸ وقائع احمدی)۔

هذا۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین

محمد میاں

۳ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ ۔ ۴ جولائی ۱۹۵۷ء

Marfat.com

فہرستیں

اس کتاب میں فہرست مضامین سے زیادہ اسماء الرجال یعنی ان شخصیتوں کے ناموں کی فہرست کو اہمیت حاصل ہے جنھوں نے تحریکات میں حصہ لیا یا جن کا تعلق (مخالفانہ یا موافقانہ) ان تحریکات سے رہا۔

لیکن تین سو صفحات میں پھیلے ہوئے ناموں کی ایسی فہرست کہ نام کے ساتھ اُن تمام صفحات کے حوالے بھی آ جائیں جن میں وہ نام آ رہا ہے ایک پیچیدہ کام تھا۔ جو اگر میری فرصت پر موقوف رہتا تو کتاب کی اشاعت میں اور چند ماہ کی تاخیر ہو جاتی۔ مگر مجھے مسرّت ہے کہ اس پیچیدہ کام کو جس کے لئے بے حد دیدہ ریزی کی ضرورت تھی عزیز القدر حافظ خالد میاں سلمہٗ نے حسن و خوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ آپ جب اس فہرست سے کام لیں تو درخواست یہ ہے کہ عزیز موصوف کے لئے دل سے دعا بھی فرمائیں۔

ناکارہ : محمد میاں عفی عنہ

۲۷ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء

Marfat.com

اَسماءُ الرِّجال

اُن شخصیتوں کے نام جن کا کسی بھی مناسبت سے اس کتاب میں ذکر آیا ہے اور حوالہ صفحات

○

ضروری گذارش ① اصل نام (یا مشہور کنیت) حروف ہجا کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ خطابات یا تعظیمی الفاظ نام کے بعد لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً مولانا الحاج سید ابوالحسن علی ندوی مصنّف سیرت سیّد احمد شہید۔ ابوالحسن علی کے نام و کنیت کے ساتھ مشہور ہیں تو ان کا نام الف کے باب اور با کی ترتیب میں لایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۴ اور تعظیم و تعارف کے تمام الفاظ بعد میں لائے گئے ہیں۔

② اکثر ناموں میں اسم مبارک "محمد" تبرکاً بڑھا دیا جاتا ہے، اصل نام کا جزء نہیں ہوتا ایسے موقع پر اصل نام ترتیب میں لایا گیا ہے۔ لفظ محمدؐ بعد میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کا اصل نام "اسمٰعیل" فہرست میں باب الف، ترتیب "س" میں لایا گیا ہے۔ باقی تمام الفاظ بعد میں لکھے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۲۷۔

١ ابنِ سعود۔ امیر۔ ٢٢٨، ٢٢٩

٢ ابوبکر، شیخ۔ ١٠٥۔

٣ ابوالحسن نصیرآبادی، مولانا۔ ١١٩۔

۴ ابوالحسن علی ندوی، الحاج مولانا مصنف سیرت سیّد احمد شہید۔ ٢٥٢

۵ ابوالخیر، شمس العلماء مولوی۔ ٢٥٧

٦ ابوسعیدؒ مولانا، مولانا شاہ ابوسعیدؒ۔ ٢٩، ٣٠۔

٧ ابوسعید، شاہ۔ دہلوی۔ ٩٣

٨ ابوعلی بخش۔ ١٠٥

٩ ابوالفیض، شاہ۔ ٢٥٧۔

١٠ ابوالقاسم تھانیدار، مولوی۔ ١٠۴

١١ ابواللیث، حضرت مولانا شاہ ابواللیثؒ۔ ٢٩، ٧٢، ١٦٥۔

١٢ ابواللیث۔ مولوی۔ ٢٥٧

١٣ ابوالمعالی، شاہ ابوالمعالیؒ۔ ١٤٩، ١٠٧

Marfat.com

۱۴ اپّا صاحب - ۸۷، ۹۳ -
۱۵ اجمل، حضرت مولانا شاہ اجملؒ - ۱۱۱، ۱۳۹ -
۱۶ احمد خاں بنگش - ۵۶، ۷۱، ۷۹ -
۱۷ احمد خاں، حافظ (حاکم منکرہ) - ۲۴۵ -
۱۸ احمد الدّین، حافظ - ۱۰۶
۱۹ احمد شاہ ابدالی - ۳، ۳۴، ۳۷، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۳ -
۲۰ احمد علی، قاضی بجون پور - ۲۵۵ -
۲۱ احمد علی، والی رام پور، نواب - ۱۱۰ -
۲۲ احمد اللہ، مولوی - ۱۰۴ -
۲۳ احمدی، مولانا - ۱۵۵ -
۲۴ اسحاق، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ - ۴۴، ۹۰، ۱۷۹، ۱۹۲، ۲۴۹، ۲۵۱ -
۲۵ اسحاق، سیّد محمد - ۳۰، ۹۴، ۱۰۹، ۱۶۹ -
۲۶ اسد علی بیگ، مرزا - ۱۲۳ -
۲۷ اسمٰعیل شہید، حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ - ۴۴، ۸۹، ۹۱، ۹۳، ۹۸، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۸۷، ۲۰۳، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۳، ۲۳۷، ۲۴۷
۲۸ اشرف، مولانا محمد - ۱۱۹ -
۲۹ آصف جاہ، نظام الملک - ۳۳، ۵۴ -
۳۰ آصف خاں، رسالدار - ۱۴۹ -
۳۱ اعزاز علی، استاذ العلماء الحاج مولانا - ۱۵۸ -
۳۲ آغا میر، نائب السلطنت معتمد الدولہ - ۱۱۳، ۱۱۴ -
۳۳ افضل علی، خواجہ - ۱۵۳ -
۳۴ اکبر، جلال الدّین محمدؐ - ۲۵۵ -
۳۵ اکرام الحق - ۱۵۳ -
۳۶ اکرام الدّین، دہلوی، حافظ - ۱۴۹ -
۳۷ اللہ بخش - ۱۰۲ -
۳۸ اللہ بخش - ۱۸۷ -
۳۹ اللہ رکھ، میاں - ۱۵۰
۴۰ الٰہی بخش - ۱۰۷ -
۴۱ الٰہی بخش صادق پوری، مولانا - ۱۵۲ -
۴۲ الٰہی بخش، مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی - ۴۴، ۱۰۴ -
۴۳ امام بخش - ۱۰۶ -
۴۴ امام بخش سوداگر، شیخ - ۱۲۳ -
۴۵ امام بخش، شیخ - ۱۵۳ -
۴۶ امام خاں، جمعدار - ۱۰۴ -
۴۷ امام الدّین، مولوی - ۱۰۷ -
۴۸ امام الدّین (مبلغ) - ۱۵۴ -
۴۹ امام علی، عظیم آبادی - ۲۰۵ -
۵۰ امان اللہ خاں - ۱۰۱
۵۱ امان اللہ، نشان بردار، حافظ - ۱۰۵
۵۲ امجد خاں - ۱۸۷

Marfat.com

۵۳ امجد، سید محمد - ۱۵۵، ۲۵۳ -

۵۴ امیر خاں - ۸۸ -

۵۵ امیر علی خاں سنبھلی، نواب - ۷۶، ۷۷، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۳، ۱۲۱، ۱۴۴، ۱۵۳، ۱۶۷، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۳۹ -

۵۶ امیر علی، سید - ۲۰۲ -

۵۷ امیر، محمد - ۱۵۲ -

۵۸ امین الدین احمد، شیخ - ۱۴۰، ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۷۵، ۱۸۱ -

۵۹ امین کشمیری، مولانا محمد امین - ۲۹ -

۶۰ انس، مولانا محمد - ۱۵۴ -

۶۱ انصاری، بڑوانی، منشی محمدی - ۱۰۴، ۱۵۳

۶۲ انصاری، مولانا حکیم محمد احسن - ۲۵۳ -

۶۳ انور شاہ کشمیری، حضرت علامہ مولانا - ۲۵۸ -

۶۴ اودت نرائن، مہاراجہ بنارس - ۱۱۳

۶۵ اورنگ زیب، سلطان محی الدین عالمگیر - ۱ -

۶۶ اولاد حسین قنوجی، مولانا سید - ۱۹۱ -

۶۷ اہل اللہ، شاہ اہل اللہ - ۹۳

۶۸ اینگلس، فریڈرخ - ۶، ۳۳ -

ب

۶۹ بابر، ظہیر الدین محمد - ۱۱۲ -

۷۰ باجی راؤ پیشوا - ۳۲، ۸۲، ۸۷، ۹۳ -

۷۱ باقر علی شیخ - ۱۸۶

۷۲ باقر علی عظیم آبادی - ۲۰۰ -

۷۳ ببر خاں - ۱۰۵ -

۷۴ بدر الدین - ۱۲۲ -

۷۵ بدھ سنگھ - ۲۱۸، ۲۴۲ -

۷۶ بدھن، شیخ - ۱۵۴، ۱۸۷ -

۷۷ برکت علی، شیخ - ۱۴۹ -

۷۸ بستی میاں - ۱۴۹ -

۷۹ بشیر الدین، مولوی - ۱۰۶، ۲۶۰ -

۸۰ بلاقی مرزا، شاہزادہ محمود بخت عرف - ۱۵۰، ۱۵۵ -

۸۱ بلند بخت دیوبندی، شیخ - ۱۰۵، ۲۶۱ -

۸۲ بلونت سنگھ، راجہ - ۶۶، ۶۷ -

۸۳ بھولا چابک سوار، میاں - ۱۵۰ -

۸۴ بینی بہادر، راجہ - ۶۶، ۶۷ -

پ

۸۵ پائندہ خاں، سردار - ۲۰۱ -

۸۶ پیر محمد خاں - ۲۱۶

۸۷ پیر محمد، میاں - ۱۹۲ -

Marfat.com

ت

۸۸ تاج الدین حسین خاں - ۱۲۰، ۱۲۳ -
۸۹ تقی، محمد - ۱۴۹ -
۹۰ تیغ علی خاں - ۱۵۲ -

ٹ

۹۱ ٹیپو سلطان - ۲، ۲۹، ۴۲، ۴۷، ۷۴، ۸۴، ۸۶، ۱۴۳ -
۹۲ ٹڈو میاں، نثار علی عرف۔ دیکھئے نثار علی۔

ج

۹۳ جان جاناں، حضرت مرزا مظہر - ۷۰
۹۴ جعفر، منشی محمد جعفر تھانیسری مصنف تواریخ عجیب -
۹۵ جلال الدین - ۱۸۷ -
۹۶ جمال، بندگی حضرت شاہ - ۲۵۴ -
۹۷ جمال، میاں - ۱۰۶ -

چ

۹۸ چاند، شیخ - ۱۰۶ -
۹۹ چیتو پنڈاری، سردار - ۸۷ -

ح

۱۰۰ حاجی، شاہزادہ مرزا - ۱۵۰ -
۱۰۱ حسن بیگ، مرزا - ۱۲۳ -
۱۰۲ حسن علی، شیخ - ۱۴۹ -
۱۰۳ حسن علی صغیر محدث، مولانا مرزا - ۳۱ -
۱۰۴ حسن علی، منشی - ۱۵۳ -
۱۰۵ حسین، حافظ محمد - ۱۰۶ -
۱۰۶ حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید - ۹۳ -
۱۰۷ حسین احمد ملیح آبادی، مولانا - ۳۱، ۴۵، ۹۰ -
۱۰۸ حفیظ اللہ دیوبندی، شیخ - ۹۵، ۱۰۶، ۲۶۱، ۲۶۲ -
۱۰۹ حمید الدین، سید - ۱۹۱ -
۱۱۰ حیات بخش، قاضی - ۱۰۴ -
۱۱۱ حیات خاں، محمد - ۸۷ -
۱۱۲ حیات محمد - ۱۵۴ -
۱۱۳ حیات النساء بیگم - ۱۵۰ -
۱۱۴ حیدر علی - ۴۲، ۸۶، ۱۴۳ -

خ

۱۱۵ خادی خاں - ۲۱۶، ۲۱۷ -
۱۱۶ خدا بخش رئیس، مولوی - ۱۰۵
۱۱۷ خواجہ محمد حسن پوری، منشی - ۱۰۵

Marfat.com

۱۱۸ خواجہ محمد خانساماں - ۱۰۵ -

د

۱۱۹ داراب خاں - ۱۰۵
۱۲۰ دلیر خاں - ۶۶ -
۱۲۱ دوست محمد خاں - ۲۴۵ -
۱۲۲ دوندے خاں، نواب - ۸۷ -
۱۲۳ دھوکل سنگھ تحصیلدار - ۹۶ -
۱۲۴ دین محمدؐ، میاں - ۱۵۰، ۱۹۲ -

ذ

۱۲۵ ذوالفقار علی، حضرت مولانا - ۱۰۸، ۱۷۵

ر

۱۲۶ راحم، داروغہ محمدؐ - ۱۰۴ -
۱۲۷ رجب علی، شیخ - ۲۷۷ -
۱۲۸ رحمت خاں روہیلہ، حافظ - ۳۷،
۷۱، ۷۳ -
۱۲۹ رحیم خاں افغان - ۱۵۳ -
۱۳۰ رستم علی - ۱۵۱ -
۱۳۱ رستم علی جلگانوی، سیّد - ۱۹۹ -
۱۳۲ رشید الدّین دہلوی، حضرت مولانا - ۴۴، ۱۰۷
۱۳۳ رفیع الدّین، حضرت مولانا شاہ - ۴۴ -
۱۳۴ رگھوناتھ راؤ - ۱۵۹ -
۱۳۵ رمضان، شاہ مولوی - ۱۰۷
۱۳۶ رمضان، شیخ - ۱۰۲
۱۳۷ رمضان، شیخ - ۱۰۴
۱۳۸ رمضان، مولوی محمد - ۲۰۲ -
۱۳۹ رمضانی، شیخ - ۱۵۳ -
۱۴۰ رنجیت خاں، میواتی - ۱۴۹
۱۴۱ رنجیت سنگھ، مہاراجہ - ۷۶، ۸۵،
۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷،
۲۱۹، ۲۲۰ -
۱۴۲ روشن خاں - ۲۳۵ -
۱۴۳ رؤف الدّین - ۱۵۳ -

ز

۱۴۴ زماں شاہ - ۲۴۴ -
۱۴۵ زین العابدین حاجی - ۱۱۰ -
۱۴۶ زین العابدین، سیّد - ۱۳۷
۱۴۷ زین عرب، سیّد - ۸۷ -

س

۱۴۸ سارنگ، شیخ - ۱۵۹ -
۱۴۹ سبحان خان - ۱۰۱
۱۵۰ سبحان علی خاں، علّامہ - ۱۱۹، ۱۲۳ -
۱۵۱ سراج الدّولہ - ۴، ۳۷، ۳۸ -
۱۵۲ سردار خاں - ۱۵۲
۱۵۳ سرفراز خاں، نواب (گورنر ملتان) - ۲۴۵

Marfat.com

۱۵۴ سعادت علی خاں، خلف شجاع الدولہ - ۱۱۵

۱۵۵ سعادت علی خاں، نواب برہان الملک ۳۲

۱۵۶ سعد الدین میاں - ۱۰۶

۱۵۷ سعد اللہ چشتی - ۲۴۵ -

۱۵۸ سعود بن عبد العزیز - ۲۳۰، ۲۳۲ -

۱۵۹ سعید الدین، ناخدا - ۱۵۳ -

۱۶۰ سلامت علی خاں حکیم - ۱۵۰

۱۶۱ سلطان خاں والیٔ بھمبر - ۲۴۵ -

۱۶۲ سلطان محمد خاں - ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۴۷ -

۱۶۳ سلّو خاں سالدار (سید احمد) ۱۰۵، ۲۶۱ -

۱۶۴ سندھیا، دولت راؤ - ۸۴، ۸۸، ۹۳، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۹۳، ۲۳۹ -

۱۶۵ سندھیا، مادھوجی راؤ - ۲۲، ۷۶، ۷۷، ۸۲

۱۶۶ سندھیا، ہندو راؤ - ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۳، ۲۳۹

۱۶۷ سوہن، شیخ - ۱۵۳

۱۶۸ سید احمد خاں، سر ۲۱۳ -

۱۶۹ سید احمد شہید، حضرت - ۲۹، ۳۱، ۴۴، ۸۳، ۸۶، ۸۹، ۹۱، ۹۳، ۹۵، ۹۶، ۹۸ تا ۱۰۳، ۱۰۵ تا ۱۱۰، ۱۱۲ تا ۱۱۴، ۱۲۱، ۱۲۳ تا ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۸ تا ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۴۵ تا ۱۴۹، ۱۵۱ تا ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۲ تا ۱۹۳ ہر صفحہ پر - ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۶ تا ۲۱۲ ہر صفحہ پر - ۲۱۴ تا ۲۲۶ ہر صفحہ پر - ۲۳۳ تا ۲۴۲ ہر صفحہ پر - ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹ -

۱۷۰ سید حمزہ - ۱۴۱ -

ش

۱۷۱ شاہ پور، محمد - ۲۴۵ -

۱۷۲ شاہ جہاں ثانی، محی السنۃ - ۶۳ -

۱۷۳ شاہ عالم، عالی گوہر - ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۷۰، ۷۱، ۷۷ -

۱۷۴ شاہ محمد، شیخ - ۱۵۰ -

۱۷۵ شاہ محمد، منشی - ۵۳ -

۱۷۶ شجاع الدولہ - ۶۴، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۴، ۷۷ -

۱۷۷ شریف الدین، مولانا مفتی - ۱۰۷ -

۱۷۸ شریعت اللہ، حضرت مولانا شریعت اللہ - ۱۳۱ -

۱۷۹ شمس الدین، مولانا - ۱۰۶، ۲۵۹، ۲۶۰ -

۱۸۰ شمشیر خاں - ۱۰۳ -

۱۸۱ شوکت اللہ انصاری، ڈاکٹر شاہ - ۲۵۳، ۲۵۷ -

۱۸۲ شیر سنگھ - ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۴۳ -

ص

۱۸۳ صابر بخش سجادہ نشین، میاں - ۱۰۷ -

۱۸۴ صابر، حافظ - ۲۰۶ -

Marfat.com

۱۸۵ صابر علی حاجی - ۱۸۹ -

۱۸۶ صبغت اللہ، سید - ۱۸۸ -

۱۸۷ صبور اللہ، شیخ - ۱۰۶ -

۱۸۸ صدر خان - ۱۰۱ -

۱۸۹ صدر الدین - ۱۰۵ -

۱۹۰ صدر الدین دہلوی، مولانا مفتی - ۴۴، ۹۰ -

۱۹۱ صدر الدین قصاب - ۱۵۲ -

۱۹۲ صدر الدین مولوی - ۲۵۸ -

۱۹۳ صلاح الدین، میاں - ۱۰۶ -

۱۹۴ صدیق، مولانا محمد - ۱۵۴ -

ط

۱۹۵ طالب حسین - ۱۵۴ -

۱۹۶ طالب علی عظیم آبادی - ۱۵۶ -

۱۹۷ طفیل احمد منگلوری (علیگ)، مولوی سید ۲۳۷، ۲۳۸

۱۹۸ طوسون بن محمد علی پاشا -

ط

۱۹۹ ضابط خاں - ۴۷ -

ع

۲۰۰ عارف، شیخ محمد - ۱۰۵ -

۲۰۱ عاشق، حضرت مولانا محمد - ۲۸ -

۲۰۲ عالمگیر ثانی، معز الدین جہاندار شاہ - ۶۵ -

۲۰۳ عالی گوہر، شاہزادہ - دیکھیے شاہ عالم -

۲۰۴ عبداللہ، شیخ - ۲۴۵ -

۲۰۵ عبدالباقی خاں - ۹۷ -

۲۰۶ عبدالحکیم، شیخ - ۱۰۶ -

۲۰۷ عبدالحی، حضرت مولانا شاہ عبدالحیؒ
۲۹، ۴۴، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۸، ۱۰۵،
۱۱۳، ۱۳۶، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰،
۱۷۵، ۲۲۳ -

۲۰۸ عبدالخالق دہلوی، مولانا - ۴۴ -

۲۰۹ عبدالرب، مولانا - ۱۱۸، ۱۲۲ -

۲۱۰ عبدالرحمن، تاجر - ۱۵۳ -

۲۱۱ عبدالرحمن، سید - ۱۵۴ -

۲۱۲ عبدالرحمن، شیخ - ۱۰۴ -

۲۱۳ عبدالرحمن، قاضی - ۲۴۵ -

۲۱۴ عبدالرحیم ولایتی، حضرت حاجی شاہ -
۹۸، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۰۸ -

۲۱۵ عبدالرؤف، شیخ - ۱۰۶ -

۲۱۶ عبدالرزاق - ۱۰۶ -

۲۱۷ عبدالرزاق انصاری، حکیم ۱۵۵، ۲۵۳ -

۲۱۸ عبدالشکور خاں - ۱۰۴ -

۲۱۹ عبدالعزیز بن سعود - ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱ -

۲۲۰ عبدالعزیز، استاذ العلماء حضرت مولانا شاہ
عبدالعزیزؒ - ۳۱، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳

Marfat.com

۴۴، ۴۵، ۴۶، ۷۷، ۷۹، ۸۲، ۰
۸۳، ۸۶، ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۹۱،
۱۰۸، ۱۱۹، ۱۲۸، ۱۵۶، ۱۶۳،
۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۱، ۱۷۳،
۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰،
۱۹۲، ۲۲۰، ۲۳۸، ۲۳۹ -
۲۲۱ عبدالعلی - ۱۰۶ -
۲۲۲ عبدالعلی، حافظ - ۲۰۲ -
۲۲۳ عبدالعلی، مولانا لکھنوی - ۱۱۷ -
۲۲۴ عبدالغفار خاں پشاوری - ۲۰۲ -
۲۲۵ عبدالغنی، حضرت مولانا شاہ - ۴۴، ۹۰،
۱۷۱، ۲۵۱ -
۲۲۶ عبدالقادر - ۱۴۹، ۱۹۱،
۲۲۷ عبدالقادر، حضرت مولانا شاہ - ۴۴،
۲۲۸ عبدالقادر، مولوی - ۱۱۲ -
۲۲۹ عبداللہ خلف شیخ غلام حسین - ۱۵۴، ۱۴۷
۲۳۰ عبداللہ - ۱۹۱ -
۲۳۱ عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز - ۲۳۱، ۲۳۲ -
۲۳۲ عبداللہ، حاجی - ۱۰۶ -
۲۳۳ عبداللہ امام مسجد، حافظ - ۱۰۴، ۱۰۹ -
۲۳۴ عبداللہ، حافظ - ۱۰۶ -
۲۳۵ عبداللہ خاں - ۱۲۴
۲۳۶ عبداللہ (خانساماں) - ۲۰۶ -
۲۳۷ عبداللہ شنگرفی، شاہ - ۱۱۲ -
۲۳۸ عبداللہ، شیخ (کلکتہ)
۲۳۹ عبداللہ، قصاب - ۱۴۹ -
۲۴۰ عبداللہ، مولانا - ۱۵۰، ۱۵۲ -
۲۴۱ عبداللطیف، شیخ - ۱۴۹، ۱۵۵ -
۲۴۲ عبدالمجید خاں آفریدی - ۱۹۸ -
۲۴۳ عبدالواحد - ۱۹۱ -
۲۴۴ عبدالوہاب، مولانا حافظ - ۱۱۹،
۲۰۵ -
۲۴۵ عبیداللہ سندھی، مولانا - ۳۱، ۳۴،
۱۳۳، ۲۴۱ -
۲۴۶ عثمان، بریگیڈیر جنرل محمد - ۲۵۳ -
۲۴۷ عثمان، حافظ محمد - ۱۰۶ -
۲۴۸ عثمان، شیخ محمد - ۱۰۶ -
۲۴۹ عثمانی، دیوان لطف اللہ - ۲۶۰ -
۲۵۰ عزیز الرحمن منشی - ۱۵۳ -
۲۵۱ عصمت اللہ، میاں - ۱۰۶ -
۲۵۲ عظیم اللہ بیگ کمیدان - ۱۰۵ -
۲۵۳ علاؤ الدین، شیخ - ۱۰۵ -
۲۵۴ علاؤ الدین، قاضی - ۲۰۶ -
۲۵۵ علم اللہ، مولانا شاہ - ۳۰، ۱۶۴ -

Marfat.com

۲۵۶ علی جان، شیخ - ۱۵۲ -

۲۵۷ علی وردی خان، مہابت جنگ ۳۶، ۳۷

۲۵۸ عنایت اللہ - ۲۰۶ -

۲۵۹ عنایت اللہ خاں - ۱۹۱ -

۲۶۰ عنایت اللہ، شیخ - ۱۵۴ -

۲۶۱ عنایت علی عظیم آبادی، مولانا - ۹۲، ۱۹۱

غ

۲۶۲ غازی الدین حیدر بادشاہ غازی، رفیع الدولہ، رفیع الملک، شہامت جنگ، ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن، میر محمد پناہ۔ ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶ -

۲۶۳ غفور خاں والئی سرنج، نواب - ۸۸ -

۲۶۴ غلام حسن، شیخ ۱۵۳ -

۲۶۵ غلام حسین -

۲۶۶ غلام حسین، فخر التجار ۱۵۳، ۱۶۰، ۲۶۲

۲۶۷ غلام حیدر خاں ۱۰۱ -

۲۶۸ غلام حیدر خاں گوالیاری ۱۸۵، ۱۹۵، ۲۳۹

۲۶۹ غلام رسول خاں - ۱۰۱، ۱۹۵ -

۲۷۰ غلام رسول مہر (مصنف سید احمد شہید وغیرہ) - ۲۵۲، ۲۶۲ -

۲۷۱ غلام رحمن، شیخ - ۱۵۱، ۲۵۸ -

۲۷۲ غلام علی، حافظ - ۱۰۵

۲۷۳ غلام علی دہلوی، شاہ - ۴۴ -

۲۷۴ غلام علی، شیخ - ۱۰۰، ۱۱۱، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۹، ۱۸۹ -

۲۷۵ غلام محمد، شیخ - ۱۰۵

۲۷۶ غلام مرتضیٰ، دیوان - ۱۵۴، ۱۶۳ -

۲۷۷ غلام یحییٰ، مولوی - ۱۵۰ -

۲۷۸ غوث خاں، میاں - ۲۴۵ -

۲۷۹ غوث، منشی محمد - ۲۰۱ -

ف

۲۸۰ فتح علی، مولانا - ۱۵۲، ۱۸۱ -

۲۸۱ فخر الدین دہلوی، حضرت شاہ - ۴۶ -

۲۸۲ فرحت علی - ۱۴۰، ۱۵۲ -

۲۸۳ فرخ سیر - ۲۴۳ -

۲۸۴ فرزند علی، شیخ، قاضی - ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۸۱، ۱۸۳، ۲۵۳ تا ۲۵۶ -

۲۸۵ فرزند علی، مولانا - ۱۴۰ -

۲۸۶ فرید الدین، مولوی - ۱۰۶، ۲۶۰، ۲۶۱ -

۲۸۷ فصیح الدین، مولانا محمد - ۲۵۷ -

۲۸۸ فضل الرحمن، منشی - ۱۵۳ -

۲۸۹ فضیل، محمد -

۲۹۰ فقیر تاج الدین - ۲۴۷ -

Marfat.com

۲۹۱ فقیر چراغ الدین۔ ۲۴۷۔
۲۹۲ فقیر عزیز الدین۔ ۲۴۴۔
۲۹۳ فقیر محمد خاں۔ ۱۰۱، ۱۰۲۔
۲۹۴ فقیر محمد خاں گویا۔ ۱۲۱۔
۲۹۵ فقیر نور الدین۔ ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷۔
۲۹۶ فیض اللہ خاں، ارباب، مہمند۔ ۲۱۹۔
۲۹۷ فیض محمد خاں، نواب (فیض اللہ خاں) ۷۱، ۷۳

ق

۲۹۸ قادر بخش۔ ۸۸۔
۲۹۹ قادر بخش لکھنوی۔ ۱۵۳۔
۳۰۰ قاسم علی، مولانا پانی پتی، مولانا محمد۔ ۱۹۱۔
۳۰۱ قدن خاں۔ ۱۰۵۔
۳۰۲ قطب الدین، حافظ۔ ۹۳، ۱۰۶۔
۳۰۳ قطب الدین (گورنر قصور) ۲۲۵۔
۳۰۴ قطب الدین (نوابزادہ)۔ ۱۵۲۔
۳۰۵ قطب الہدیٰ، سید۔ ۳۰۔
۳۰۶ قمر الدین، حکیم۔ ۱۰۶۔
۳۰۷ قمر الدین کشمیری، خواجہ۔ ۱۵۲۔

ک

۳۰۸ کامگار خاں۔ ۶۶۔
۳۰۹ کرامت حسین۔ ۱۰۶۔
۳۱۰ کرامت علی، صدر امین، مولوی۔ ۱۳۹، ۱۳۹، ۱۴۹
۳۱۱ کرامت اللہ۔ ۱۹۲۔
۳۱۲ کرامت اللہ، سید۔ ۱۵۴۔
۳۱۳ کریم بخش، روٹی والے۔ ۱۰۵۔
۳۱۴ کریم الدین۔ ۱۰۶۔
۳۱۵ کریم الدین۔ ۱۰۷
۳۱۶ کریم اللہ بیگ، مرزا۔ ۱۱۲، ۱۵۰۔
۳۱۷ کریم اللہ دہلوی، مولانا۔ ۴۴۔
۳۱۸ کریم اللہ، رئیس۔

گ

۳۱۹ گاندھی، موہن داس کرم چند، مہاتما، ویلش باپو۔ ۲۲، ۲۳۔
۳۲۰ گنگھم، کیپٹن۔ ۱۴۱
۳۲۱ گھسیٹا، شاہ۔ ۱۵۳۔

ل

۳۲۲ لاہوری (سائیں)۔ ۲۰۵، ۲۰۶۔
۳۲۳ لعل محمد، شیخ۔ ۱۴۹۔
۳۲۴ لعل محمد، میاں۔ ۱۵۰۔
۳۲۵ لقمان، سید محمد۔ ۳۰۔
۳۲۶ لکھی میاں، رئیس۔ ۱۵۲۔
۳۲۷ لیک، لارڈ۔ ۷۶۔
۳۲۸ لینن، ولادی میرالچ الیانو۔ ۳۳۔

Marfat.com

م

۳۲۹ مادھو نرائن - ۸۲ -
۳۳۰ مارکس، کارل - ۶، ۳۳ -
۳۳۱ مان سنگھ والی جودھپور، راجہ - ۸۸ -
۳۳۲ مبین، مولانا محمد، خطیب عیدگاہ دیوبند - ۲۶۰
۳۳۳ محبوب حسن رضوی، سید - ۲۵۳، ۲۵۹
۳۳۴ محبوب علی دہلوی، مولانا میر - ۴۴، ۲۵۹
۳۳۵ محسن خاں - ۱۰۶ -
۳۳۶ محسن خاں - ۱۰۷ -
۳۳۷ محسن، سید محمد - ۱۵۳ -
۳۳۸ محسن قاضی، محمد - ۲۵۸ -
۳۳۹ محمد امیر - دیکھئے امیر
۳۴۰ محمد بخش، مولوی - ۱۰۴ -
۳۴۱ محمد بن سعود - ۲۲۹ -
۳۴۲ محمد بن عبدالوہاب نجدی - ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹
۳۴۳ محمد بناہ، شیخ - ۱۴۸ -
۳۴۴ محمد تقی قصاب - ۱۱۵، ۱۴۹ -
۳۴۵ محمد حسن، شیخ - ۱۰۵ -
۳۴۶ محمد حسن، قاضی - ۱۵۱ -
۳۴۷ محمد حیات - ۱۵۴ -
۳۴۸ محمد حسین - ۱۴۹ -
۳۴۹ محمد حسین - ۱۰۷
۳۵۰ محمد حسین نزک، ناخدا - ۱۶۰ -
۳۵۱ محمد حسین، حافظ - ۱۰۶ -
۳۵۲ محمد حسین، سید - ۱۰۶ -
۳۵۳ محمد حسین، شاہ - ۱۵۴ -
۳۵۴ محمد حسین، مولانا - ۱۰۸ -
۳۵۵ محمد حسین نموہیہ، شاہ - ۱۵۲ -
۳۵۶ محمد خاں بنگش - ۷۱ -
۳۵۷ محمد شاہ - ۳۶ -
۳۵۸ محمد علی پاشا ندیو مصر - ۲۳۲، ۲۳۳ -
۳۵۹ محمد علی رامپوری، مولانا سید - ۱۹۱ -
۳۶۰ محمد علی، مولانا - ۹۹ -
۳۶۱ محمد قلی خاں - ۶۲، ۶۵، ۶۶، ۶۷ -
۳۶۲ محمد گفاہ - ۱۴۸ -
۳۶۳ محمد ماہ - ۱۰۶ -
۳۶۴ محمد نبی - ۱۵۴ -
۳۶۵ محمد نبی انصاری برودانی - ۱۰۴ -
۳۶۶ محمد نبی انصاری منشی - ۱۵۳، ۱۵۴ -
۳۶۷ محمود بخت مرزا - ۱۵۵ -
۳۶۸ محمود خاں بن غوث خاں - ۲۴۵ -
۳۶۹ محمود، ڈاکٹر سید - ۱۵۲، ۱۵۵، ۲۵۲، ۲۵۳ -
۳۷۰ محی الدین بیگ مرزا - ۱۵۱ -
۳۷۱ مختار احمد انصاری، ڈاکٹر - ۱۵۵، ۲۵۴ -

Marfat.com

۳۷۲ مخدوم بخش، منشی - ۱۵۳ -
۳۷۳ مخدوم لکھنوی، مولانا - ۲۹، ۳۱، ۱۱۹ -
۳۷۴ مخصوص اللہ، مولانا - ۴۴ -
۳۷۵ مدلے خاں - ۱۰۵ -
۳۷۶ مدنی بنگالی، قاضی - ۲۰۵ -
۳۷۷ مراد خاں - ۱۰۵ -
۳۷۸ مسکین شاہ - ۲۲۵ -
۳۷۹ مظفر جنگ، نواب - ۷۱، ۷۳ -
۳۸۰ مظہر علی، شیخ - ۱۴۸ -
۳۸۱ مظہر علی عظیم آبادی، مولانا سید - ۱۵۳، ۲۱۹ -
۳۸۲ معین الدین حافظ - ۱۰۵ -
۳۸۳ معین، سید محمد - ۳۰ -
۳۸۴ مغیث الدین حکیم - ۱۹۳ -
۳۸۵ مقبول احمد، حافظ سید مقبول عالم - ۱۰۶، ۲۵۹ -
۳۸۶ مقیم خاں - ۱۹۱ -
۳۸۷ ملہار راؤ - ۷۹ -
۳۸۸ مملوک علی، حضرت مولانا - ۲۵۱ -
۳۸۹ منصور عالم، شاہ - ۱۵۱، ۲۵۷ -
۳۹۰ منور علی - ۱۰۶، ۲۶۰ -
۳۹۱ موسیٰ خاں پسر کامگار خاں - ۶۱ -
۳۹۲ موشیر لاس - ۶۶ -
۳۹۳ مولا بخش، خواجہ - ۱۵۳ -
۳۹۴ مہربان خاں - ۱۰۲ -
۳۹۵ میر جعفر - ۷۳ -
۳۹۶ میر صادق - ۷۳، ۷۴ -
۳۹۷ میر قاسم - ۶۷، ۶۸ -
۳۹۸ میلکم سرجان - ۸۸ -
۳۹۹ مینڈو خاں - ۱۲۴ -

ن

۴۰۰ نادر شاہ - ۳، ۳۴، ۳۶ -
۴۰۱ نپولین بوناپارٹ - ۸۵ -
۴۰۲ ننھے خاں - ۱۰۵ -
۴۰۳ نثار علی عرف ٹیٹو میاں - ۲۲۰، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۰ -
۴۰۴ نجابت علی سوداگر، حافظ - ۱۴۹ -
۴۰۵ نجف علی خاں - ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۸۲ -
۴۰۶ نجم الدین، قاضی - ۱۰۶ -
۴۰۷ نجیب الدولہ نجیب خاں روہیلہ - ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۳، ۶۴، ۶۶، ۷۱، ۷۴، ۱۸۰ -
۴۰۸ نذر محمد - ۲۰۴ -
۴۰۹ نصر اللہ - ۱۰۵ -
۴۱۰ نصیر الدین، مولانا - ۲۴۴ -
۴۱۱ نظام الدین - ۱۰۶ -
۴۱۲ نظام الدین چشتی، میاں - ۱۰۵، ۱۰۶، ۲۰۶
۴۱۳ نظام الدین، قاضی - ۲۴۵

Marfat.com

۴۱۴ نعمت اللہ، شاہ - ۱۵۵

۴۱۵ نعمت اللہ، مولانا - ۲۵۷

۴۱۶ نقوی، سید جعفری - ۲۰۱

۴۱۷ نور اللہ، مولانا - ۲۸، ۱۶۸

و

۴۱۸ واجد علیؒ - ۱۵۳

۴۱۹ وارث علیؒ، مولوی - ۲۰۶

۴۲۰ واضح، شاہ محمد واضحؒ - ۳۰

۴۲۱ وجیہ الدین سہارنپوری، مولوی - ۹۳

۴۲۲ وحید الدین، مولانا - ۹۳

۴۲۳ وزیر الدولہ، نواب - ۸۸، ۱۸۷، ۲۰۷، ۲۲۴

۴۲۴ وزیر، شیخ محمد - ۱۴۹

۴۲۵ ولایت علی، حضرت مولانا - ۹۲، ۱۵۴، ۱۹۱، ۲۵۷

۴۲۶ ولی اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ - ۱، ۴ تا ۶، ۱۱ تا ۱۴، ۱۷ تا ۲۴، ۲۶، ۲۸ تا ۳۰، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۷۹، ۸۶، ۹۰، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۶۸، ۱۷۶ تا ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۹۶

۴۲۷ ولی محمدؒ - ۲۰۴

۴۲۸ ولی محمد رئیس - ۱۰۷

۴۲۹ ولی محمد، شیخ - ۱۰۵

۴۳۰ ویلزلی، لارڈ - ۸۴

ہ

۴۳۱ ہارس، لارڈ - ۷۵

۴۳۲ ہبۃ اللہ، مولانا - ۲۸، ۱۶۸

۴۳۳ ہدایت اللہ - ۱۱۰

۴۳۴ ہری رام تحصیلدار - ۹۶

۴۳۵ ہلکر جسونت راؤ - ۷۶، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۹۳، ۱۴۴، ۲۰۹، ۲۳۹

۴۳۶ ہمایوں بیگ مرزا - ۱۰۱

۴۳۷ ہمایوں نصیر الدین محمد ۲۱۲

۴۳۸ ہنٹر، ڈاکٹر ولیم ولسن - ۹۱، ۱۳۲، ۱۴۳، ۲۴۵، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۲۳، ۲۳۴، ۲۴۰

۴۳۹ ہندو، راجہ رام - ۲۴۳

۴۴۰ ہسٹنگس، مارکوئس وارن - ۷۳، ۸۷، ۹۳

ی

۴۴۱ یار خاں، محمد - ۱۰۷، ۲۰۴، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۸، ۲۱۹

۴۴۲ یار محمدؒ، میاں - ۱۵۰

۴۴۳ یعقوب، سید محمدؒ ۱۸۷

۴۴۴ یعقوب، حضرت مولانا شاہ محمدؒ - ۴۴، ۹۰، ۲۵۰

۴۴۵ یقین اللہ، مولانا شاہؒ - ۱۱۹

۴۴۶ یوسف پھلتیؒ، حضرت مولانا محمدؒ - ۹۳، ۹۸، ۱۰۰، ۱۳۴، ۱۸۶

Marfat.com

مطبوعات مکتبہ محمودیہ معہ مدنیہ، کریم پارک لاہور

مجالسِ سبعہ : قیمت ۹ روپے

مراد آباد جیل میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی درسِ قرآنِ کریم کے سلسلے میں سات مجلسیں

علمی لطائف، رموزِ قرآن اور اسرار و حِکَم کا مجموعہ

بترتیب و تشریح: حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ، صدر مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی

دینی تعلیم کے ۱۲ رسالے (قیمت ۹ حصے ۲۵/۵۰ روپے)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے معصوم بچے باادب ہوں۔ ماں باپ کے فرمانبردار اور سعادتمند ہوں، اسلامی اخلاق سے مزیّن اور مسائل سے باخبر ہوں، ساتھ ہی اُردو ادب سے آشنا ہوں تو حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تالیف فرمودہ دینی تعلیم کے رسائل کا کورس اپنے بچوں کو پڑھائیں جو پرائمری سے لیکر آٹھویں جماعت تک کے طلبہ کے لیے درجہ وار ترتیب دیا گیا ہے (نو حصے چھپ کر تیار ہو گئے ہیں) کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ آفسٹ

متحدہ قومیت اور اسلام قیمت ۶ روپے

حضرتِ اقدس مدنیؒ نے نظریۂ قومیت پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ جدید نظریات رکھنے والوں کے لیے دعوتِ فکر ہے —— **نظریۂ قومیت** پر حضرتِ اقدس مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ کی خط و کتابت بھی اس کتاب کے آغاز میں شامل کر دی گئی ہے۔ (صفحات ۹۲)

شواہدِ تقدس اور تردیدِ الزامات صفحات ۲۱۸ قیمت ۱۰ روپے

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے یہ معرکہ آرا کتاب مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں لکھی ہے۔ بصیرت افروز محققانہ مباحث کا مجموعہ ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "اُولٰئکَ ھُمُ الرّاشدُون" کا مصداق ہیں۔ کتاب خصوصاً امانِ خلافت ذی النورین سیدنا عثمانؓ کے تقدس کی شاہدِ عادل ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

عُلماءِ ہند کا شاندار ماضی

حصّۂ سوم

—— ایک حیرت انگیز انقلابی تحریک جو بنگال کی مشرق سے لے کر شمالی ہند کی مغربی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہیبتناک خونی ہنگاموں کے بعد بھی سالہا سال زندہ رہی جس کے مقابلہ کے لیے برطانوی فوجوں کو بار بار خون کی ہولی کھیلنی پڑی۔ اس کے رہنماؤں کے حالات۔ اُن کے اخلاق و کردار۔ اُن کی بے نظیر و بےمثال قربانیاں۔ مقدمات اور ان کے فیصلے۔ سکھوں کی سرگذشت اور اس زمانہ کے قابلِ قدر سیاسی انکشافات۔

حضرت مولانا سیّد محمّد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

مُحدِّث، فقیہ، مُورِّخ، مُجاہد فی سبیل اللہ، مُؤلّفِ کُتبِ کثیرہ

مکتبہ محمودیّہ

"بیتُ الحمد"، جامعہ مدنیّہ، کریم پارک، لاہور

Marfat.com

فہرست مضامین

تحریک شاہ ولی اللہ کا دوسرا دور ۹

ایک کے بجائے دو مرکز ۱۱

مرکز صادق پور ۱۲

پٹنہ میں تحریک کی ابتدا ۱۷

تقسیم کار، لائحہ عمل تنظیمی

سرگرمیاں ۳۰

دورۂ بنگال، سفر حج اور

عزم جہاد ۳۶

پنجاب کی سیاست ۴۱

مرکز صادق پور کے مجاہد ۵۲

گلاب سنگھ کی شکست ۵۴

گرفتاری اور وطن کو واپسی ۵۶

مرکز ستھانہ ۵۹

مولانا عنایت علی غازی ۶۵

مولانا عنایت علی کے بعد ۷۴

خونریز معرکے اور جنگی اقدامات ۸۷

ہندوستان کے اندر نظام عمل ۹۵

تحریک کے نمایاں پہلو ۱۰۹

انتقامی کارروائیاں ۱۱۴

مقدمات، سازش، ملزمین

اور سزائیں ۱۲۲

گرفتاران بلا کے مصائب ۱۴۱

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

تحریکِ شاہ ولی اللہ کا دُوسرا دَور

سیّدنا حضرت شاہ عبد العزیز صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) کے عہدِ مبارک میں حضرت سیّد احمد صاحب (شہید) حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب (شہید) اور حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب (قدس اللہ اسرارہم) کے دوروں نے پورے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند میں جذبۂ انقلاب کے جو شعلے بھڑکا دیئے تھے وہ خون شہادت کے چھینٹوں سے سرد ہونے والے نہ تھے۔

یہ زمزمہ لاکھوں دلوں کو گرما چکا تھا، اور بقول ولیم ولسن ہنٹر یہ تحریک کسی رہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی[1]

چنانچہ شہداء بالاکوٹ کا خون ابھی جمنے نہیں پایا تھا کہ مجاہدین سرمست وکفن بردوش کا ایک گروہ "نندھیاڑ"[2] میں جمع ہوا، اور اپنا امیر[3] منتخب کر کے سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۷ - [2] سرگزشت مجاہدین ص ۲۵ - [3] منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا بیان ہے کہ ان مجاہدین نے مولانا نصیر الدین صاحب کو اپنا امیر منتخب کیا اور سید اکبر صاحب کے پاس "ستیانہ" میں جمع ہو گئے۔ (سوانح احمدی ص ۱۸۰) مگر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ پہلے یہ جماعت مولوی محمد قاسم صاحب کی سرکردگی میں تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی (داماد حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی) (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

سر بلند کر دیا، جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک لہراتا رہا، اور ہزاروں پاک نفوس اس کی عزت و عظمت پر قربان ہوتے رہے۔

مختصر یہ کہ ہجرت، جہاد اور شہادت کی جو رسم سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے جاری کی تھی، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی موقوف نہیں ہوئی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان کے علاوہ بیشمار محبانِ وطن اور فدا کارانِ حریت وہ تھے جو اگرچہ ترکِ وطن کر کے محاذ پر نہیں جا سکے تھے مگر ان کی نیک تمنائیں اور دلی ہمدردیاں مجاہدین کی ممد و معاون رہی تھیں۔ اُن کی امداد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک بہت بڑے انگریز نے جو شمالی مغربی صوبے میں نیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا، ولیم ولسن ہنٹر کو بتایا کہ اُس کے بہت سے دین دار مسلمان ملازموں کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہوں کا معین حصہ ستیانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے، اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کیلئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لئے چلے جاتے تھے، جس طرح اُس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھُٹی کی درخواست کرتے تھے اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو نیل کی کوٹھی میں کام کرتے تھے سنہ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان اس غدر کی بناء پر ایک یا دو مہینے کی چھُٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا ہے [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو اپنا امیر منتخب کیا۔ مولانا نصیرالدین صاحب اس وقت دہلی میں تھے او کنلے (O. KINELY) لکھتا ہے مشہد بالاکوٹ کے بعد مولانا قاسم صاحب کی سرکردگی میں (جو اس وقت مظفر آباد میں تھے) بچے کھچے لوگ ستیانہ پہنچے۔ مولوی نصیرالدین صاحب بعد کو دہلی سے سندھ ہو کر پہنچے (ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک ص ۶۹) بہر حال قائد کوئی بھی ہو، یہ ثابت ہے، کہ تحریک کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ مزید تحقیق و تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے سرگذشت مجاہدین از غلام رسول مہر۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۳ و ص ۳۴

ایک کے بجائے دو مرکز

دہلی — اور — صادق پور

سیّد صاحب کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہوگئے۔ دہلی کا پرانا مرکز نئے رجحانات کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور "صادق پور پٹنہ" کے نئے مرکز نے پرانی راہ و رسم کی تقلید[1] کی۔

اختلاف خواہ کسی جماعت اور طبقہ میں ہو، اچھا نہیں مانا جاتا۔ مگر وہ اختلاف جو تقسیم کار کی نوعیت اختیار کرلے، رحمت بن جاتا ہے۔ یہاں یہ اختلاف[2] اسی قسم کا ہے۔ چنانچہ انصاف پسند مورخ کو شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید مرکزوں کی یہ تقسیم حکمتِ عملی کی بنا پر قصداً کی گئی تھی۔

دہلی کے مرکز نے انقلاب کے لئے وہ شاہراہ اختیار کی جو ہندو مسلمانوں کے مشترک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی جو تقریباً پچاس سال بعد "انڈین نیشنل کانگرس" کا بنیادی مقصد[3] قرار

---

[1] یہ ایک لطیفہ ہے کہ فقہی مسلک کے لحاظ سے معاملہ برعکس تھا۔ [2] کیونکہ اس طرح جدّ و جہد انقلاب کی ہر ایک ممکن صورت پر عمل ہوگیا۔ انگریزوں کی طاقت اس وقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ مرکز اگر ایک رہتا تب بھی نتیجہ یہی ہوتا۔ مگر وحدتِ مرکز اور ایک طریقِ کار کی شکل میں جدّ و جہد کا ایک گوشہ خالی رہ جاتا اور ملّت اسلامیہ کی تاریخ اس فخر سے خالی رہ جاتی کہ ع مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

[3] بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو زیرِ صدارت مسٹر جی بینرجی ڈبلیو کلکتہ منعقد ہوا جس میں بمبئی کے مشہور تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں کانگرس کے یہ مقاصد قرار پائے۔ ۱: ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکّب ہے اُن سب کو متحد و متفق کرکے ایک قوم بنانا۔ ۲: اور اسی طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو، اس کی دماغی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا وغیرہ (روشن مستقبل صـ۲۸۰ و صـ۲۸۱)

Marfat.com

پائی اور جس کو بعد میں قومیت متحدہ کا عنوان دیا گیا۔ اور مرکز صادق پور کا طریق کار اور لائحہ عمل وہی رہا جو سید صاحبؒ نے قائم کیا تھا۔ یعنی ہجرت، جہاد، اور تن من دھن کی قربانی۔

سلسلۂ کلام کا تقاضا ہے کہ پہلے "مرکز صادق پور" کا ذکر کیا جائے، تاکہ ایک طریقِ کار کی پوری تاریخ ایک ہی دفعہ سامنے آجائے۔

مرکز صادق پور (وہابی تحریک)

مرکز کے بانی، ممتاز رہنما، بیرونِ مُلک اور اندرون مُلک سرگرمیاں اور نتائج

بانی مرکز (مولانا ولایت علی صاحب) اس مرکز کے بانی مولانا ولایت علی صاحب کا تذکرہ حضرت سید صاحب کے دورہ کے سلسلہ میں پہلے آچکا ہے۔ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

مولانا ولایت علی صاحب ایک معزز اور با اثر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے دادا احمد علی صاحب "اردل" کے قاضی (جج) تھے۔ (یہ اب ضلع گیا کا ایک قصبہ ہے) اس خدمت کے صلہ میں اُن کو بہت بڑی جاگیر بادشاہِ وقت کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ مولانا ولایت علی صاحب کے نانا جن کی آغوشِ شفقت میں آپ نے پرورش پائی تھی، رفیع الدین حسن خاں صوبہ بہار کے بہت بڑے دولت مند اور باوجاہت رئیس تھے اور بقول مولانا عبدالرحیم صوبہ بہار کے آخری ناظم (گورنر) تھے۔[1]

یہ ذہین و ذکی اور منچلا نونہال (ولایت علی) جب دولت و ثروت کے گہوارے میں پرورش پاکر سنِ شعور کو پہنچا تو وہ ایک پُرتکلف، شوقین مزاج، بانکا نوجوان تھا۔ لباس و پوشاک ریشمین، اعلیٰ قسم کا زربفت و زردوز، عطر میں بسا ہوا، آنکھوں میں سُرمہ

---

[1] الدر المنثور فی احوال صادق پور۔

دانتوں میں مسّی اور ہتھیلیوں پر رنگِ حنا، کاکلیں آہن تاب پُشت پر پڑی ہوئی، اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور چھلّے، چُوڑی دار پاجامہ پنڈلیوں سے چمٹا ہُوا، اور پیروں میں زردوز وصلی کی جوتیاں[1]۔ غرض اس زمانہ کے لحاظ سے پوری طرح فیشن ایبل۔

تعلیم | خاندان کے دستور کے موافق[2] اوّل آپ نے اپنے خاندان کے استادوں سے تعلیم پائی۔ پھر تکمیل کی غرض سے آپ لکھنؤ چلے آئے۔ اور لکھنؤ کے مشہور عالم و فاضل ماہر معقولات مولانا محمد اشرف[3] صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر آپ اپنے اُستاد کے مایۂ ناز شاگرد بن گئے۔

---

[1] الدر المنثور فی احوال صادق پور صـ۱۱۱۔ [2] حسب معمول شرفاء ہند چار برس کی عمر میں آپ مکتب میں بٹھائے گئے۔ ذہانت و ذکاوت وافر سے سات برس کی عمر میں آپ کی استعداد اس حد کو پہنچی کہ مقرّرہ معلّم سے آپ کی تشفّی نہیں ہونے لگی اور آخرش آپ کے والد بزرگوار مولوی فتح علی صاحب نے آپ کا سبق اپنے ذمّہ لیا۔ بارہ برس کی عمر میں جب مختصرات سے فراغت حاصل ہوئی تو ایک نہایت معروف و مشہور استاد معقول مولوی رمضان علی صاحب مجتہد مذہب امامیہ کے پاس آپکا سبق رجوع کر دیا گیا۔ پھر بشوقِ تحصیل مزید علوم مولانا محمد اشرف صاحب اُستاد معقول و منقول کی خدمت میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور تقریباً چار سال اُن کی خدمت میں فیضیاب ہوتے رہے (الدر المنثور صـ۱۱۱)۔ [3] مولانا محمد اشرف صاحب ابن قاضی نعمت اللہ خوش نویس ولد محمد معظم ولد احمد علی صدیقی بزرگے از اسلافش از لاہور آمدہ مقیم لکھنؤ شد۔ وے رحمۃ اللہ علیہ شاگرد مولانا نور الحق فرنگی محلی و مولانا سیّد مخدوم لکھنوی و مرید سیّد احمد مجاہد بریلوی بود، بتدریس و تصنیف عمرِ عزیزش بسر بردہ۔ در تالیف تاج اللغات کہ بحکم والیٔ لکھنؤ مؤلف شدہ او ہم شرکتے داشت۔ اصول راسخہ و شرحش دو مرشا مخہ و قسطاس الصّرف و تفسیر قرآن مجید و تاریخ علماء و مشائخ و سلاطینِ ہند ناتمام کہ مسودہ آن بخط شریفش بنظر مؤلف کتاب ہذا گذشتہ از تصانیف ہستند۔ مولانا ثابت علی مرحوم ساکن ضع بھکا ضلع الہ آباد از تلامذہ او و از اساتذہ جامع الاوراق اند۔ صاحب الترجمہ بتاریخ ہفتدہم سنہ دوازدہ صد و چہل و چہار ہجری بمرض ہیضہ رحلت فرمودہ در حجرۂ مسجد خود واقع جھوانی ٹولہ من محلّات لکھنؤ مدفون گردید شرفہ اللہ تعالٰی بتشریف الغفران۔ (صـ۱۸۱ تذکرہ علماء ہند مولانا رحمان علی صاحب مرحوم)۔

Marfat.com

سیّد صاحب سے ملاقات یہی زمانہ تھا، کہ سیّد صاحب کا قافلہ لکھنؤ پہنچا۔ اور زبانِ خلق نے اس عجیب و غریب جماعت کا چرچا مولانا محمد اشرف صاحب تک پہنچایا۔

مولانا محمد اشرف صاحب سنجیدہ مزاج عالم تھے منطق و فلسفہ کے ذوق نے آپ کو تحقیق و تفتیش کا عادی بنا دیا تھا۔ شہرت سے متاثر ہونے کے بجائے آپ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ سیّد صاحب کے تذکرہ نے آپ کو متوجّہ ضرور کیا۔ مگر آپ کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ شخصی طور پر سیّد صاحب کو پرکھ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے سیّد صاحب سے تنہائی میں ملاقات کی فرمائش کی۔

سیّد صاحب اپنی زندگی اسی مقصد کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ نے اجازت دے دی اور جب مولانا موصوف پہنچے تو فوراً تخلیہ کر لیا گیا۔

مولانا محمد اشرف صاحب نے جس قابلِ اعتماد شاگرد کے ذریعہ اپنا تعارف کرا کر ملاقات کا وقت مقرّر کرایا تھا، وہ یہی مولوی ولایت علی صاحب تھے جو اس وقت تخلیہ میں بھی ثالث ثلاثہ[1] تھے۔

تخلیہ میں ملاقات اور سیّد صاحب کے ارشادات سیّد صاحب رسمی طور پر عالم نہیں تھے لیکن اس منشا اور مقصد سے پوری طرح واقف تھے، جس کی تکمیل کے لئے خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ اسی منشا اور مقصد کو آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ جس کے لئے آپ اپنا سب کچھ قربان کر رہے تھے۔

سیّد صاحب نے منطقی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بالا ہو کر اپنے زمانہ کے حالات کا نقشہ کھینچا، اور اُن اخلاقی تباہیوں اور سماجی اور معاشی خرابیوں اور بربادیوں پر روشنی ڈالی جو اس وقت مُلک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر اس فرض کی طرف توجّہ دلائی جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا سچّا پیرو ہونے کی وجہ سے ایک مسلمان پر عائد ہوتا ہے آپ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت[2] فرمائی۔

---

[1] تین میں سے ایک۔ محمدؐ میاں۔ [2] الدر المنثور و سیرت سیّد احمد شہید وغیرہ

Marfat.com

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔　　ہم نے آپ کو صرف اس غرض سے بھیجا ہے کہ تمام جہانوں پر رحم ہو۔

آپ نے فرمایا۔ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس لئے ہے کہ تمام جہانوں پر رحمت ہو، تو آج یہ جبر و قہر اور ظلم و تعدی کی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر کیوں برس رہی ہیں"۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو وہ نظامِ حکومت بخشا تھا جو ہر متنفس بلکہ ہر ایک مخلوق کے لئے سراسر رحم و کرم تھا۔ ہم نے اپنی بداعمالیوں سے اس مقدس و معصوم نظام کی دھجیاں بکھیر کر ملوکیت کی مصیبت مسلط کر لی۔ آج دنیا میں جو بھی ظلم و ستم ہے، ملوکیت اور ملوکیت کے بعد اغیار کی غلامی کی جو ذلت و نحوست سامنے ہے، اُس کی ذمہ داری سب سے پہلے اُن پر ہے جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ

لے واعظانِ خوش بیان میلاد شریف اور سیرت مبارکہ کے جلسوں میں اس آیت کریمہ کو پڑھ کر بسا اوقات مسلمانوں کو اطمینان دلا دیتے ہیں کہ وہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں لہٰذا دنیا اور آخرت کی رحمتیں اُن کے لئے مخصوص ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اطمینان دلانے کے لئے نہیں بلکہ اُس فرض کا احساس دلانے کے لئے ہے جو ایک مسلمان پر بحیثیت مسلمان عائد ہوتا ہے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے نہیں آئے کہ کسی فرعون کو غرق کریں یا زمین پھٹے اور اس میں کوئی قارون مع اپنے پورے محل کے زمین دوز ہو جائے اس قسم کی عام تباہی اور بربادی سے آپ کی اُمت محفوظ رہے گی جس کی بشارت احادیث مبارکہ میں دے دی گئی ہے۔ آپ کی بعثت کا منشا یہ ہے کہ فرعون، سلطانِ عادل بنے، قارون میں حاتم کی صفت پیدا ہو، اور جو قوم کفر و عصیان، تمرد اور سرکشی کے سبب غرقِ طوفانِ نوح ہونی چاہیئے وہ سفینۂ رشد و ہدیٰ کی ناخدا بنے۔ وراثتِ ارض اور خلافتِ الٰہیہ کی مستحق ہو۔ اس ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے جس صبر و تحمل، اخلاص و ایثار، جفاکشی، ہمدردی، نوعِ انسان کی جگر سوزی اور دلگیری کی ضرورت ہے وہ وابستگانِ دامنِ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے۔ کما یشیر الیہ لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین۔

Marfat.com

وسلم کا نام لیتے ہیں مگر عمل سے محروم ہیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن سنبھالنے والے، مظلوموں کی امداد کے لئے پیکر رحمت بن کر کیوں نہیں اُٹھتے، اور ان اسباب و وسائل کے سامنے سینہ سپر کیوں نہیں ہو جاتے جو اس ظلم و ستم اور عوام کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ رحم و کرم اور امنِ عالم کے ذمہ دار گوشہ نشیں، خلوت گزیں، یا درس گاہوں میں مصروفِ تدریس ہیں، اور نظامِ کہن کے بوڑھے دیو، متاعِ امن تاراج کر رہے ہیں۔

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ شاہ پرستی کے پرانے کھنڈروں کو پیوندِ زمین کر دیا جائے اور نظامِ حکومت کا وہ جدید ایوان تعمیر کیا جائے جو نوعِ انسان کے ہر طبقہ کے لئے پناہ گاہ ہو، اور جہاں مخلوقِ خدا اطمینان اور چین کا سانس لے سکے۔

سید صاحب کی تقریر دو گھنٹہ جاری رہی[1]۔ تقریر کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا، شرابِ صداقت سے سرشار تھا۔ اُس نے صداقت پسند اُستاذ اور اُس کے نوجوان شاگرد پر جادو کا کام کیا۔ منطق و فلسفہ کی پادر ہوا موشگافیاں، ہوا ہو گئیں۔ دل و دماغ کے تمام گنجینے متاعِ درد کی نذر ہو گئے اور ہمدردیٔ خلقِ خدا کا وہ تیر جگر میں پیوست ہوا جس نے نہ صرف ان کو بلکہ ان کے اعزہ و اقارب کو بھی ساری عمر کے لئے بسملِ نیم جاں بنا دیا۔ چشمِ گریاں نے بھی دلِ مضطر کا ساتھ دیا۔ چنانچہ سیلِ اشک چشمۂ مژگاں سے رواں ہوا، اور بقول سوانح نگار:

دونوں کی داڑھیاں روتے روتے تر ہو گئیں[2]۔

افرادِ خاندان کا سید صاحب سے تعلق مولانا ولایت علی صاحب لذتِ درد سے آشنا ہوئے تو اب یہ شوق ہوا کہ خاندان کے سب بڑے چھوٹے اس کا مزہ چکھیں۔ یہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ تقریباً دو سال بعد جب سید صاحب کا قافلہ حج کے لئے روانہ

---

[1] الدر المنثور و سوانح احمدی وغیرہ۔ [2] الدر المنثور صـ۱۱۱ و سوانح احمدی وغیرہ۔

ہونے لگا تو آپ نے اپنے والد مولانا فتح علی صاحب کو سیّد صاحب کے فضائل و مناقب سے مطلع کیا، اور درخواست کی کہ سیّد صاحب پٹنہ پہنچیں تو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے فیوض و برکات اور اُن کے انفاسِ قدسیہ سے مستفیض ہوں۔ چنانچہ مولانا فتح علی صاحب خاندان[1] کے چند بزرگوں کو لے کر پٹنہ گئے اور سیّد صاحب کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔

اس پہلی ملاقات، اور مختصر فرصت[2] میں اگرچہ باضابطہ بیعت ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ مگر محبّت و ارادت کے کچھ نقش ایسے جم گئے، جو دن بدن اُبھرتے رہے اور ابھی سیّد صاحب سفرِ حج سے واپس نہیں ہوئے تھے کہ پورے خاندان کے دلوں کی زمین جذباتِ فدائیت کا لالہ زار بن چکی تھی۔

پٹنہ میں تحریک کی ابتداء

اور مرکز کی بنیاد

اسی زمانہ میں کہ سیّد صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے،

---

[1] اس میں شاہ محمد حسین صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو مولانا ولایت علی صاحب کے ماموں تھے اور آخر تک تحریک کی سرپرستی کرتے رہے (ماخوذ از سوانح احمدی ص۲۱۳)۔ [2] اس وقت کچھ شیعہ صاحبان نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ چند سربرآوردہ شیعہ پٹنہ کے انگریز افسر کے پاس گئے اور شکایت کی کہ سیّد صاحب جہاد کی نیّت سے یہ دورہ کر رہے ہیں۔ انگریز افسر نے جواب دیا۔ یہ پادری صاحب جن کے متعلق یہ شیعہ حضرات الزام لگاتے ہیں، بہت دین دار حقانی شخص ہیں کیونکہ جاسوس اُن کے حال کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم سے کسی نے یہ بات اب تک نہیں کی ہے۔ یہ پادری صاحب حج کو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بچے اور بوڑھے بھی ہیں۔ کوئی جنگی سامان اُن کے پاس نہیں۔ (وقائع احمدی قلمی نسخہ ص۷۶۹)

مولانا ولایت علی صاحب درسیات سے فارغ ہو کر لکھنؤ سے پٹنہ پہنچے، اور ایک مرکز قائم کر دیا۔ بقول مصنّف سوانح احمدی:

"مولانا (ولایت علی صاحب) نے اسی وقت سے جمعہ اور جماعت اپنے یہاں قائم کر کے وعظ و نصیحت شروع کر دی"۔

عوام کے جذبات نے پوری گرمجوشی سے مولانا کے وعظ اور نصیحت پر لبیک کہا، اور کچھ دنوں بعد جب سیّد صاحب کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو مشتاقانِ زیارت کی ایک جماعت استقبال کے لئے مونگیر تک پہنچی۔ اس کی قیادت مولانا ولایت علی صاحب اور آپ کے ماموں مولانا قاضی شاہ احمد حسین صاحب کر رہے تھے۔

یہ وہی مونگیر ہے جو اس زمانہ میں اسلحہ سازی میں شہرت رکھتا تھا اور جہاں سے سیّد صاحب نے کافی اسلحہ خریدے تھے۔[1]

مونگیر سے قافلہ روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قصبہ "باڑھ" میں قیام ہوا۔ جہاں مولانا ولایت علی صاحب کے والد صاحب اور دوسرے عمائدین نے کئی روز تک پورے قافلہ کی شاندار دعوتیں کیں۔ عوام کو سیّد صاحب اور جماعت کے مقرّرین کے مواعظ و خطابات سے استفادہ کا موقع ملا اور ہزاروں مسلمان گروہ در گروہ حلقہ بگوش ارادت ہوئے۔

قافلہ باڑھ سے روانہ ہو کر پٹنہ پہنچا تو اس مُشکِ ختن کی مہک پورے علاقہ کو سرمست کر چکی تھی، اور گرویدگی اور وابستگی کا یہ عالم تھا کہ بقول ڈبلو، ڈبلو ہنٹر:

"ان کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام[2] حکومت

---

[1] تفصیل سیّد صاحب کے تذکرہ میں گذر چکی ہے۔ [2] ہنٹر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نظام سیّد صاحب نے اس وقت قائم کیا جب حج کو تشریف لے جاتے ہوئے چند روز پٹنہ میں قیام فرمایا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب نے حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہوئے یہ نظام قائم کیا۔ حج بیت اللہ شریف کے لئے جاتے وقت نہ مولانا ولایت علی صاحب وہاں موجود تھے، اور نہ آپ کا خاندان حلقۂ ارادت میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جاتے وقت (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کیے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستہ پر پڑتا ہو، تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے[1] مقرر کیے۔ یعنی رُوحانی نائب اور ایک "قاضی القضاۃ"[2] مقرر کیا۔ اور اس کے لئے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت کیا کرتے تھے۔ اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد وہ یہاں سے روانہ ہوئے۔

ایثار و قربانی کی انتہا اس تحریک کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس کے داعی اور رہنما، ایثار و قربانی کی ابتدار خود اپنی ذات اور اپنے قریب ترین، عزیزوں سے کرتے رہے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے جہادِ حریّت کی رہنمائی کی، تو اپنے پورے خاندان کو وقفِ جہاد کر دیا۔ حضرت سیّد احمد صاحب کو امیرِ جہاد بنایا گیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے خاندان کے تمام چھوٹوں بڑوں کو ہدایت کر دی کہ وہ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ انتہا یہ کہ خاندان[3] ولی اللہ کے چشم و چراغ برادر زادہ عزیز مولانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سید صاحب کو پٹنہ کا قیام مختصر کرنا پڑا۔ کیونکہ شیعوں نے شکایت کر دی تھی کہ سیّد صاحب کی یہ نقل و حرکت جہاد کی غرض سے ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اگرچہ انگریز افسر نے باور نہیں کیا۔ مگر سید صاحب کے لئے خطرہ ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تو تمام پروگرام ختم اور تحریک ناکام ہو جائے گی۔ محمد میاں

[1] ان خلفار کے نام نہیں لئے گئے۔ غالباً ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا سید منظر علی صاحب۔ مولانا الٰہی بخش صاحب۔ مولانا ولایت علی صاحب۔ مولانا عنایت علی صاحب۔ [2] مولانا شاہ قاضی احمد حسین صاحب (واللہ اعلم) محمد میاں۔ [3] یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بیٹے اگرچہ چار تھے مگر پوتا صرف ایک تھا یعنی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب۔

Marfat.com

اسمٰعیل صاحب شہیدؒ اور اپنے عزیز داماد مولانا عبد الحیؒ صاحب کو سید صاحب کے حوالہ کر دیا کہ وہ سفر و حضر میں سید صاحب کی رفاقت کریں، اور اُن کے جھنڈے کے نیچے راہِ حق میں قربان ہوں۔

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب پیرانہ سالی اور بصارت سے معذوری کے باعث خود شریکِ قافلہ نہیں ہو سکے۔ لڑکا بھی اتفاق سے کوئی نہیں تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ ہی کو اولاد[1] کی طرح پالا تھا۔ انہیں کو راہِ خدا میں پیش کر دیا۔ خود سید احمد صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے، تو خاندان کے عزیز ترین افراد ان کے ساتھ تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ساری ذمّہ داری شاہ اسحاق صاحب پر آ پڑی تو آپ نے اپنے عزیز داماد مولانا نصیر الدین صاحب کو سرحد بھیج کر تحریک کو زندہ کیا۔ ایسے ہی مولانا ولایت علی صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تو آپ کے سامنے قربانی کیلئے سب سے پہلے اپنا خاندان تھا۔ والد صاحب اور خاندان کے بزرگوں کو دعوت دینے کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اب اُن کے منظور کرنے کی شان ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا عبد الرحیم صاحب کا بیان ہے:

"(حج بیت اللہ شریف سے واپسی پر) جب سید صاحب پٹنہ سے اپنے وطن (رائے بریلی) کے لئے روانہ ہوئے تو مولانا ولایت علی صاحب اور ان کے دونوں بھائی مولانا عنایت علی صاحب اور مولانا طالب علی

---

[1] حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للّٰہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق (امیر الروایات وغیرہ)۔ اس حمد و شکر کی بنیاد یہی تھی کہ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ سے وہی محبت فرماتے تھے جو اپنے صلبی فرزند سے کر سکتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے نواسے تھے۔ اُن کو بھی تحریک میں شامل کیا گیا تھا، اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ اندرونِ ہند تحریک کا نظم قائم کرنا، اور حسبِ ضرورت مجاہدین کی امداد حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے متعلق تھا۔

Marfat.com

صاحب اور چچا زاد بھائی مولانا باقر علی صاحب[1] دنیا ناپائیدار کی عیش و عشرت پر لات مار کر ہم رکاب سید صاحب ہوئے۔"

چند روز بعد مولانا ولایت علی صاحب کے نسبتی بھائی میر عثمان علی صاحب اور ماموں زاد بھائی مولانا قمر الدین صاحب[2]، پھر کچھ دنوں بعد مولانا ولایت علی صاحب کے والد ماجد مولانا فتح علی صاحب بھی اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مولوی فرحت حسین صاحب کو لے کر سید صاحب کی خدمت میں رائے بریلی پہنچ گئے۔"

سرمستی و وارفتگی

مولانا ولایت علی صاحب کی نزاکت طبع، نفاست پسندی اور پُر تکلف زندگی کا مختصر تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اس تحریک[3] میں شرکت کے بعد حیرت انگیز انقلاب بھی ملاحظہ فرمایئے۔ سوانح نگاروں[4] کی شہادت ہے کہ:

"آپ کو اُسوۂ نبی ﷺ سے ایسا ذوق حاصل ہو چکا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی

---

[1] یہی وہ بزرگ ہیں جو سید صاحبؒ کی زیر قیادت سب سے پہلی جنگ میں شہید ہوئے (سید احمد شہید وغیرہ)۔ [2] سوانح احمدی ص۲۰۹۔ [3] پٹنہ پہنچ کر مرکز قائم کر لیا۔ تب بھی تکلفات اور نزاکت پسندی کی وہی حالت رہی۔ جب سید صاحب کا قافلہ حج بیت اللہ سے واپس ہو رہا تھا تو ایک طرف شوق و ذوق کا یہ عالم کہ استقبال کے لئے پا پیادہ مونگیر پہنچے، اور دوسری جانب تکلفات کی یہ شان کہ اطلس و کمخواب کا لباس زیب بدن، نازک ہتھیلیاں حنا سے رنگی ہوئی۔ اور سیرت سید احمد شہید کے الفاظ میں "اس وقت مولوی ولایت علی صاحب کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ غیر متشرع اور آزاد لوگوں کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ سید عبد الرحمٰن صاحب نے سید صاحب سے ان کی وضع کی شکایت کی۔ فرمایا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ قدیم ہمراہیوں میں شامل ہو جائیں گے اور یہ سب ظاہری صورت بدل جائے گی ص۲۸۱۔ چنانچہ جب قافلہ میں شریک ہو کر رائے بریلی پہنچے تو یہ تمام رنگینیاں ختم تھیں۔ [4] مولانا عبد الرحیم صاحب زبیری ہاشمی۔ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

خدمت میں آپ پیش پیش رہتے تھے۔ جنگل جاکر لکڑیاں کاٹنا، لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھ کر لانا، اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا، مٹی کھودنا، گارا بنانا، یہ اُس نازپروردہ، وضع دار بانکے نوجوان کے شوق کے کام ہوگئے تھے"۔

مختصر الفاظ میں ایک حکایت بھی سُن لیجئے:

"مولانا ولایت علی صاحب کو رائے بریلی آئے ہوئے کئی مہینے گذر چکے تو اگرچہ مطالبہ کچھ نہیں تھا، مگر شفقتِ پدری نے خود ہی مولانا فتح علی صاحب کو اپنے نورِ نظر کی خبرگیری پر مجبور کر دیا۔ مولانا فتح علی صاحب نے ایک خادمِ خاص کو خیریت معلوم کرنے کے لئے رائے بریلی بھیجا اور اپنے گوشہ جگر، نورِ نظر کی ضروریات کے لئے کچھ روپیہ نقد، کپڑوں اور جوتیوں کے جوڑے اور ضروری سامان ساتھ کر دیا۔ اس خادم کو خود بھی مولانا ولایت علی صاحب کو دیکھنے کا شوق تھا۔ کیونکہ یہ بچپن سے ساتھ رہا تھا۔ خادم نے قافلہ میں پہنچ کر پٹنہ والے مولانا ولایت علی صاحب کو دریافت کیا۔ اُن کو بتایا گیا کہ وہ ندی پر گئے ہوئے ہیں۔ اس خادم نے ندی کا رُخ کیا۔ لبِ دریا کچھ مزدور گارا بنا رہے تھے۔ یہ خادم ایک کے پاس پہنچا اور دریافت کیا کہ مولوی ولایت علی کہاں ہیں؟ اس گارا بنانے والے نے جواب دیا کہ ولایت علی میں ہی ہوں۔ خادم کے دماغ میں مولانا ولایت علی صاحب کی چند ماہ پیشتر کی وہی تصویر تھی۔ سُرخ سپید، تر و تازہ، شاہانہ لباس میں ملبوس، ہر قسم کی زیبائش سے آراستہ۔ یہاں ایک مزدور برہنہ سر، برہنہ پا، گارے میں لتھڑا ہوا، سیاہ فام شخص کہہ رہا ہے کہ میں ولایت علی ہوں۔ خادم پہلے مذاق سمجھا۔ اس نے بار بار وضاحت کی پٹنہ والے مولانا ولایت علی جو مولانا فتح علی صاحب کے فرزند، ایک بڑے دولت مند گھرانے کے خوش رو اور خوش وضع جوان

Marfat.com

ہیں، اُن سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں - اس تشریح کے بعد بھی جب اس کو یہی جواب ملا اور اُس نے غور کر کے چہرے بشرے پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا - یہ غیر معمولی تغیّر دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے - اُس نے خطوط حوالے کئے اور قیام گاہ پر پہنچ کر والد صاحب کا ہدیہ پیش کیا - مولانا ولایت علی صاحب نے کپڑوں کی گٹھری اور روپیہ کی تھیلی اسی طرح سربند سیّد صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دی -

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

والد صاحب (مولانا فتح علی صاحب) کی پیش کش، اور آپ کے متعلق فیصلہ - خادم نے واپس پہنچ کر والد صاحب کو پوری روئیداد سنائی - والد صاحب پہلے سے زخم خوردہ تھے - بچے کے اس ایثار نے بوڑھے باپ کے افسردہ دل میں نئی اُمنگ اور سوکھی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دیا - چھوٹے فرزند (مولانا) فرحت حسین کو ساتھ لیا، اور اسی خانقاہ میں آپڑے جہاں اعجازِ مسیحا ملتِ مُردہ کو قُم بِاِذنِ اللہ کا حُکم سُنا رہا تھا - کہاں بہار کے تعلّقہ دار اور نواب زادے اور کہاں تکیہ شاہ علیم اللہ کے خرقہ پوش اور سرفروش مجاہد -

سیّد صاحب نے مولانا فتح علی صاحب کی پوری مدارات کی، تعظیم و تکریم سے پیش آئے - مگر مولانا فتح علی صاحب کی پیرانہ سالی اور فرحت حسین کے بچپن کا خیال کر کے ہجرت کی اجازت نہیں دی بلکہ صوبہ بہار کی خدمت سپرد کر کے آپ کو پٹنہ واپس کر دیا - جہاں یہ عرصہ تک تحریک کے لئے نیا خون اور تازہ مواد فراہم کرتے رہے -

ہجرت و سفارت وطن اور اہلِ وطن کی گلو خلاصی کے لئے جب سید صاحب نے بیرونِ وطن کا قصد کیا، تو مولانا ولایت علی صاحب اور خاندان کے دوسرے مجاہد

Marfat.com

ہمرکاب تھے۔ اور جب آزاد قبائل میں آزاد مرکز قائم کر لیا تو مولانا ولایت علی صاحب سفارت، کابل کے لئے نامزد کئے گئے۔ نوجوان سفیر جب کابل پہنچا[1] تو جذباتِ تبلیغ و اصلاح بھی بے قابو ہو گئے۔ آپ نے فرائضِ سفارت کے علاوہ ماحول کی اصلاح و تربیت کے لئے تقریریں بھی شروع کر دیں[2]۔ اور حالات سے متاثر ہو کر ایک طویل اصلاحی نظم بھی ارشاد فرمائی[3]۔

حیدر آباد میں تحریک سید صاحب نے شمالی ہند کا دورہ کیا تھا۔ جنوبی ہند میں صرف بمبئی چند روز قیام فرمایا۔ حیدر آباد، مدراس وغیرہ کہیں نہیں جا سکے تھے۔ آزاد قبائل میں آزاد مرکز قائم کرنے کے بعد اس کمی کی تلافی کا قصد فرمایا — چنانچہ مولانا ولایت علی صاحب کابل سے واپس ہوئے تو آپ کو حیدر آباد، اور مولانا محمد علی صاحب رام پوری کو مدراس کے لئے مامور فرمایا۔ یہ بزرگ اس جدائی سے آزردہ ہوئے تو سید صاحب نے فرمایا "مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اُٹھاتے ہیں"۔

تحریک کا اثر حیدر آباد میں آپ کی تحریک کامیاب رہی۔ نواب ناصر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ ناصر الدولہ کے بھائی مبارز الدولہ نے مولانا ولایت علی صاحب کی دعوت قبول کی۔ مگر ایک ایسا اسٹیٹ جس کی بنیاد وفاداریِ انگریز کے آب و گل سے

---

[1] غلام رسول صاحب مہرؔ کی تحقیق یہ ہے کہ سفیر بنا کر کابل بھیجنے کی روایت غلط ہے دلیل یہ ہے کہ دوست محمد خاں کبھی وزیر اعظم نہیں ہوئے۔ اور زمان شاہ کا زمانہ اس سے پہلے تھا۔ [2] منشی محمد جعفر صاحب کا بیان ہے کہ آپ تقریباً دو مہینے کابل میں رہے۔ توحید، اتباعِ سُنّت اور جہاد کے متعلق روزانہ وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ سوانح احمدی صـ۲۱۱۔ جو بات منشی صاحب کے خیال میں قابلِ تعریف ہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس سے ناراض ہیں۔ وہ مولانا ولایت علی صاحب کی تشدد پسندی کے شاکی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ تبلیغ و اصلاح، واعظ و مبلغ کے لئے خواہ کتنی ہی ضروری ہو، مگر ایک سفیر کے لئے بحیثیت سفیر اس کے جواز میں کلام ہے۔ [3] ملاحظہ ہو سوانح احمدی، تذکرہ مولانا ولایت علی صاحب۔

Marfat.com

استوار کی گئی تھی۔ اس کا وفا پرور چنگ و رباب، یہ نوائے تلخ کیسے برداشت کر سکتا تھا جو ایک مجاہد کے کام و دہن سے سرفروشانہ جذبات کے زیر و بم کے ساتھ بلند ہو رہی تھی چنانچہ مشکل سے دو ہی سال ہوئے تھے کہ آپ کو حدودِ ریاست سے نکلنا پڑا کچھ دنوں[۱] بعد آپ کے سب سے بڑے معتقد مبارز الدولہ کو نظر بندی اور پارٹی کے دوسرے سرگرم

---

[۱] مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری تحریر فرماتے ہیں:

انہیں دنوں (یعنی سفر حج سے واپسی کے بعد جب سفر جہاد کی تیاری ہو رہی تھی۔ نواب مبارز الدولہ حیدر آبادی اور اُن کے بھائی ناصر الدولہ میں اَن بن ہو کر سرکار انگریزی تک نوبت پہنچی، اور نواب مبارز الدولہ قید ہو گئے۔ اس سبب سے مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس حیدر آبادی مع اَور چند علماء کے بھاگ کر عظیم آباد پہنچے الخ (ذکر مولانا ولایت علی صاحب)۔ یہ اَن بن کیا تھی، اور کیوں ہوئی؟ مولانا محمد جعفر صاحب نے اس ابہام کی تفصیل نہیں فرمائی۔ تاریخ حیدر آباد کا مندرجہ ذیل اقتباس اس پر دھندلی سی روشنی ڈالتا ہے۔

ایک سازش کا انکشاف بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں تلور کے انگریز مجسٹریٹ نے ایک سازش کا پتہ لگایا جو انگریزی سلطنت کے خلاف کی جا رہی تھی۔ نواب ناصر الدولہ کے بھائی مبارز الدولہ اس میں شریک پائے گئے۔ اس فقرہ کے بعد مصنف تاریخ حیدر آباد، ریاست کی حمایت میں اس سازش کے الزام کو ہلکا کرنے کے لئے تحریر فرماتے ہیں:

جس حد تک واقعات کا تعلق ہے یہ کوئی سازش نہیں تھی۔ معاملہ صرف اتنا ہے، کہ جب مولوی ولایت علی عظیم آبادی خلیفہ سید احمد بریلوی سرغنہ وہابیان ہندوستان حیدر آباد پہنچے اور وہاں اُنہوں نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لئے وعظ کہنے شروع کئے تو نواب مبارز الدولہ کو بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مولوی ولایت علی صاحب اُن سے ملے اور پہلی ہی ملاقات میں نواب صاحب مسحور ہو گئے۔ چونکہ خود علم شناس تھے اس لئے مولوی ولایت علی صاحب کے مقام اور منصب کا پورا اندازہ کر لیا۔ اس وقت سے مبارز الدولہ اور اُن کے رفقاء نے اسلامی احکام کی پابندی بالالتزام شروع کر دی۔ چند سال بعد جب انگریزوں کو وہابیت کا خوف پیدا ہوا، تو مبارز الدولہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ارکان کو جلا وطنی نصیب ہوئی۔

حیدر آباد سے بمبئی | مولانا ولایت علی صاحب حیدر آباد سے بمبئی تشریف لے گئے، اور ابھی وہاں بساطِ عمل پوری طرح بچھانے نہیں پائے تھے کہ معرکہ بالاکوٹ کے درد انگیز سانحہ نے ارادوں کی دنیا کو نئے پروگرام کی دعوت دے دی کیونکہ اب سب سے اہم سوال[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اُن کے رفقاء کو بھی سازش سے متّہم کردیا۔ سازش کی تحقیقات کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مبارز الدولہ اپنے دس رفقاء سمیت ۱۳ ربیع الاوّل ۱۲۵۵ھ کو تیسری بار نواب صاحب بہادر کے حکم سے قلعہ گولکنڈہ کو جلا وطن ہوئے اور تمام وہابی فرداً فرداً گرفتار ہو کر قید کئے گئے۔ مبارز الدولہ نے قید ہی میں وفات پائی۔ (تاریخ حیدر آباد از حکیم نجم الغنی صاحب ص۴۹۷)

آفریں ہے مبارز الدولہ کو۔ ۱: جس کی جوہر شناسی نے مولانا ولایت علی صاحب کے مقام اور منصب کا پورا اندازہ لگایا۔ ۲: جس نے احکامِ اسلامی کی پابندی بالاہتمام شروع کی تو انگریزی اقتدارِ اعلیٰ سے اپنے مُلک کو آزاد کرانا بھی اپنا ایک واجب الادا فرض سمجھا۔ ۳: جس کے جذبات حرّیت کو بار بار کی گرفتاری اور جلا وطنی بھی فرو نہ کرسکی۔ انتہا یہ کہ قید و بند کی زندگی میں قیدِ زندگی سے نجات حاصل کی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اختلاف رائے اسی سوال کے جواب میں پیش آیا۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے خود دہلی کو مرکز بنا کر انقلاب کے لئے وہ پروگرام تجویز کیا جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء کا معرکہ پیش آیا۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے یہ ہے، کہ مولانا محمد اسحٰق صاحب نے ترکی خلافت سے اشتراک پیدا کرنا ضروری سمجھا اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ لے گئے۔ (سیاسی تحریک ص۱۰۱)۔ اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفّر حسین کاندھلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنایا، جو نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا (سیاسی تحریک ص۱۰۸)۔ بہرحال دہلی کا مرکز مستقل ہو یا مکہ معظمہ کے مرکز کے زیر اثر ہو، یہ واضح اور مسلّم ہے کہ صادق پور کے مرکز سے جُدا تھا اور اس کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

مرکز کا پیش آگیا کہ اس کو کس طرح باقی رکھا جائے اور ایثار و قربانی کی رسم کو کس طرح پروان چڑھایا جائے۔

اس عرصہ میں دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ پٹنہ میں آپ کے والد ماجد مولانا فتح علی صاحب وفات پاگئے۔ لہذا پہلے آپ نے پٹنہ کا قصد کیا۔ برہان پور، جبل پور، نرسنگھ پور، کندولی اور سیونی وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے آپ دو سال میں پٹنہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر کتابِ انقلاب کے منتشر اوراق کو از سرِ نو شیرازہ بند کیا۔

پارٹی کی دوبارہ تشکیل مولانا ولایت علی صاحب نے پٹنہ پہنچ کر تازہ سرگرمیوں کے لئے پرانے ساتھیوں کی نئی پارٹی بنائی جس کا مرکز "صادق پور" ہوا، اور جس کے مرکزی ارکان (کابینہ کے ممبر) یہ تھے۔

(۱) مولانا سید محمد علی صاحب (رام پوری)۔

(۲) مولانا شاہ محمد حسین صاحب۔

(۳) مولانا عنایت علی صاحب برادرِ خورد۔

نشر و اشاعت اور تنظیم و تبلیغ

تحریک کو عوامی بنانے کے لئے سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا طریقہ پیش نظر تھا۔ یعنی

(۱) **عام مجمعوں میں تقریریں** اس کے متعلق مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پالیسی وہ تھی جو ۱۸۵۷ء میں عالم آشکارا ہوئی یعنی مشترک جد و جہد اور مشترک نظامِ عمل تفصیل ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کے سلسلہ میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ پیدائش ۱۲۰۳ھ۔ سفر حج سے واپسی کے وقت سید صاحب اور آپ کے پورے قافلہ کی مدارات میں نمایاں حصہ لیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے زندگی بھر تحریک کے رکنِ رکین رہے۔ ۱۲۶۱ھ میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں دو سال صرف ہوئے۔ ۱۲۷۶ھ میں چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ (الدر المنثور)

Marfat.com

کا بیان ہے :

"مجمع اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بغرض تبلیغ و پند پہنچتے، کارخانہ داروں کے کارخانوں میں اور کسانوں کے کھیتوں پر پہنچ کر وعظ و پند کرتے، اور اُن کی بدزبانیوں اور غصّوں کو شربت کی طرح نوش کر جاتے - آپ اپنے دَور و سیر میں 'قریہ بقریہ (گاؤں گاؤں)، فروکش ہوتے اور تحریک کی باتیں پیش کرتے - اس لئے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں غیر معمولی دیر لگتی تھی"[1]

نماز جمعہ کے لئے کچھ مسجدیں مقرر کر لی گئی تھیں (تفصیل آگے آتی ہے) پارٹی سے تعلق رکھنے والے خاص طور پر ان مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے، اور نماز کے بعد تقریر کی جاتی - ان تقریروں کا موضوع کیا ہوتا تھا - ہنٹر صاحب کی تحقیق یہ ہے :

"جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے - ان میں سب سے زیادہ جہاد پر زور دیا جاتا تھا"[2]

(۲) **خاص مجمعوں میں درس** | مکان پر بعد نماز ظہر تا نماز عصر قرآن و حدیث کا درس دیتے - مولوی عبداللہ، آپ کے خلفِ اکبر قاری ہوتے - دوسرے علماء، تفسیر کی کتاب ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے - علماء کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی[3]

(۳) **تصنیف و تالیف** | مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے :

آپ نے جہاں جیسی ضرورت دیکھی، مختصر اور عام فہم رسالے قلم بند فرما کر لوگوں کے حوالے کئے - ایسے رسائل کی تعداد سَو سے کم نہ ہو گی - اگرچہ اس وقت صرف چند رسالے دستیاب ہو سکے ہیں[4]

(۴) **پریس** | آپ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی سے حضرت

---

[1] الدر المنثور ص ۱۱۶ (ملخصاً) - [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۳ - [3] ایضاً ص ۱۱۶ ملخصاً - [4] الدر المنثور ص ۱

Marfat.com

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کے تصنیف فرمودہ رسالے طلب فرمائے۔ پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کو طبع کرانے کی کوشش کی۔ مگر جب اس مطبع کے مالکوں نے اُن کو طبع کرنے سے انکار کر دیا تو دورۂ بنگال کے زمانہ میں آپ نے یہ خدمت اپنے مریدِ خاص مولانا بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپُرد کی۔ مولانا موصوف نے دس ہزار روپیہ کا ایک ٹائپ پریس خرید کر ان کتابوں کو بار بار طبع کرایا۔[1]

یہ عجیب معمہ ہے کہ مطبع حسینی لکھنؤ نے ترجمہ قرآن شریف کی طباعت سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا اقتباس اس معمّہ کا صحیح حل پیش کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ سنؔو[2] کے قریب رسالے لاپتہ کیوں ہو گئے۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں:

> "انگریزوں کے خلاف ضرورتِ جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اُس کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال[2] کی پیشین گوئیوں سے پر اور ضرورتِ[3] جہاد کے لئے وقف ہے ..... بعض کتابیں تو اُن میں سے حد سے

---

[1] الدر المنثور ص۱۱۶ ملخصاً۔ [2] اس سلسلہ کے ایک منظوم رسالے کے اشعار تو آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اس رسالہ کا نام ہے (پیشین گوئی شاہ نعمت اللہ صاحب) مختلف عنوانوں اور مختلف اسلوب سے جہاد کی ضرورت سمجھائی جاتی تھی۔ مثلاً کاشتکاروں کو بتایا جاتا تھا کہ بادشاہ جب ظالم و جابر ہوتا ہے تو بارش نہیں ہوتی اور قحط پڑتا ہے اور اس کو اتفاق کہیئے یا قدرتی معجزہ کہ اس زمانے میں یکے بعد دیگرے ایسے قحط پڑے جن سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ بقول سرولیم ڈگبی اس صدی میں اکتیس قحط پڑے اور کروڑوں ہندوستانی اس سے متاثر ہوئے اور ہلاک ہوئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، نقشِ حیات جلد اوّل۔ [3] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۹۹ وص۱۰۰۔

زیادہ اشتعال انگیز ہیں اور مسوّدات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی ہے اور اُن کا زہریلا اثر اُن کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلّغین کے اس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغِ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ رُوح پھونک دی جاتی ہے، بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے۔[۱]

تقسیمِ کار، لائحہ عمل، تنظیمی سرگرمیاں[۲]

اور اس کے اثرات

(۱) پارٹی کے ارکان کے کام اور اُن کے علاقے معیّن کر دیئے گئے۔ مثلاً

مولانا ولایت علی صاحب | جو اس جماعت کے امیر کی حیثیت رکھتے تھے اور عام طور پر اُن کو "بڑے حضرت" کہا جاتا تھا۔ ۱: تحریک کی عمومی نگرانی۔ ۲: بیرونی ممالک سے رابطہ آپ کے فرائض۔ تھے۔ ۳: اور جب آپ کا قیام پٹنہ میں ہوتا، نواب فخر الدولہ کی مسجد میں نمازِ جمعہ کی امامت اور نماز کے بعد تقریر آپ کے ذمّہ تھی۔ اور جمعہ کے علاوہ اور باقی دنوں میں مذکورہ بالا پروگرام جاری رہتا تھا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آپ کا وعظ بہت پُرتاثیر ہوتا تھا۔ آپ پارٹی کے خاص ارکان کے علاوہ تحریک کے دوسرے ہم نواؤں میں تبلیغ وارشاد کا سلیقہ پیدا کر کے قصبات و دیہات کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔[۳]

مولانا محمد علی صاحب رام پوری | کا تعلّق اُسی علاقہ سے برقرار رہا، جو

۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۹۹ و ص۱۰۱۔ ۲۔ ماخوذ از الدر المنثور وغیرہ۔ ۳۔ الدر المنثور ص۱۲۶

آپ کے لئے سید صاحب تجویز فرما چکے تھے۔ یعنی جنوبی ہند کا علاقہ جس کا مرکز مدراس تھا۔

شاہ محمد حسین صاحب کو صوبہ بہار سپرد ہوا۔ آپ کا ہیڈ کوارٹر پٹنہ قرار دیا گیا۔ جب آپ کا قیام پٹنہ میں ہوتا تو مسجد نمویہ کی امامت اور وہاں وعظ و تقریر بھی آپ کے ذمّہ ہوتا۔

مولانا عنایت علی صاحب کو صوبہ بنگال سپرد ہوا۔ آپ نے وطنِ عزیز سے رختِ سفر باندھا اور بنگال ہی میں کئی برس گذار دیئے۔

(۲) اُن کی جدّوجہد نے کیا رنگ پیدا کر دیا۔ اُس کی وضاحت کے لئے ایک ہی شہادت کافی ہے۔ ولیم ولسن ہنٹر کا ارشاد ہے:

"پٹنہ کے خلفاء جو اَن تھک واعظ، خود اپنے آپ سے بے پروا بے داغ زندگی بسر کرنے والے، انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف، روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور اُن کے لئے ایک مثال تھے اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی، اور یہ انہی کا کام تھا کہ اُنہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصوّر پیدا کرنے کی ترغیب دی[1]"

جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصّہ کو مضبوط تر کرتے رہیں۔

(۳) **مرکز کی نوعیّت اور اہمیّت** اُنہوں نے پٹنہ کے دارالاشاعت کو باغیوں اور غدّاروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا۔ اور اُس کے اردگرد دیواروں

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوم صہ ۱۰۱

Marfat.com

اور حجروں کی ایک بھول بھلیاں بنائی ہوئی تھیں جو خُفیہ دروازوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تیار کئے گئے۔ جہاں وہ رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفاء نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کو مسلّح ہوکر مدافعت کرنے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اُن کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچ دار راستوں کی شکل میں اختیار کیا۔ آخر کار جب حکومت نے اس سازشی ادارے کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا۔ گویا اُسے ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کارروائی کرنا ہے۔

"ہر ایک ضلع کے مبلّغین، متعصّب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے اُن میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھڑکا دیتے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کردیا جاتا۔ اُن میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کرلیا جاتا تھا، اور جب وُہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہوجاتے تھے تو اُن کو اُن کے ضلعے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کُتب فروش کی حیثیت سے واپس کردیا جاتا۔"[1]

ان دونوں خلیفوں (مولانا ولایت علی صاحب اور مولانا محمّد علی صاحب) نے بذاتِ خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مبلّغین بے شمار تھے، اور مدبّرانہ تنظیم نے اُن کو اس قابل بنادیا تھا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے، اپنا اڈا جمالیتے۔ اس طرح ہر ہر ضلع میں مجاہدین کا ایک مبلّغ ہوتا اور اُن کے جذبات کو مشتعل رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً سفری واعظ بھی دورہ کرتے رہتے۔ پٹنہ کا مرکزی پروپیگنڈا اُن کے اقتدار کو پائیدار اور مستقل کرتا رہتا تھا۔ جنوبی ہند میں اُنھوں نے جوش و خروش کی وہ آندھی چلائی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات

---

[1] باب دوم ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۰۱

تک بیت المال میں دے دیئے۔ شمال مغربی صوبوں سے اُنھوں نے رنگروٹوں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ کیں۔ ہر جگہ پر اُنھوں نے جوش کو انتہا تک پہنچا دیا۔

"پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسران کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دِلوں کو بے قرار کیا، اور فتنہ و فساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا، جیسا کہ ظاہر ہے[1]۔"

اُن کے خُلفاء نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سرہنری لارنس کی گواہیوں کے دوران معلوم ہوا، کہ وہ پنجاب میں مجاہدین کے (باعزّت) نام سے موسوم تھے[2]۔

تعداد ایک انقلابی جماعت جو فرازی کے نام سے مشہور تھی اور مشرقی اضلاع میں اس کا کافی اثر تھا، جس کے سرغنہ نثار علی عرف ٹیٹو میاں[3] نے ۱۸۳۱ء میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ مولانا یحییٰ علی صاحب نے اُن کو بھی اس تنظیم میں شامل کر لیا تھا، اور اب یہ تحریک یہاں تک ہمہ گیر ہو گئی تھی کہ ۱۸۴۶ء میں اُن کی تعداد اسّی ہزار تھی۔ جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے تھے اور ہر ایک دوسرے کے کام کو جماعت کا کام سمجھ کر پُوری گرمجوشی سے انجام دیتا تھا[4]۔

ہمّت و جرأت اُن کی ہمّت و جرأت، شجاعت اور بہادری کے متعلق

---

[1] باب دوم۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۷۵۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۷۔ [3] نثار علی عرف ٹیٹو میاں اور اُن کی بغاوت کا تذکرہ حضرت سید صاحب کے حالات میں گذر چکا۔ یہ بنگال میں سید صاحب کی تحریک کے انچارج تھے اور سید صاحب نے ۱۸۳۱ء میں پشاور فتح کیا تھا تو نثار علی صاحب نے کلکتہ کے مشرقی اضلاع میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ [4] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۲۵۔

Marfat.com

ہنٹر صاحب کی شہادت ہے:

"دہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی، کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ بعض حالات کے تحت ایک بنگالی بھی اسی بے جگری سے لڑ سکتا ہے، جس طرح ایک افغانی[1]"

وفاداری اور شریفانہ اخلاق یہ بات خاص طور پر قابلِ یادداشت ہے کہ یہ بھیڑ محض نمائشی نہیں تھی۔ بلکہ جذباتِ وفاداری اس کی تہ میں پوری طرح کار فرما تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی حیرت اور پریشانی ملاحظہ فرمائیے۔ بنگال کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"یہ شر انگیزی یہاں تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لئے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہوگیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے، اور اُن کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو اُن کے مُرید ہوں۔ لیکن اُن کا حال یہ ہے کہ اپنے سردار سے غدّاری کے بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں[2]۔"

مبلّغین کے اخلاق و عادات کے متعلّق ہنٹر صاحب اعتراف کرتے ہیں:

"گو یہ مقامی مبلّغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیان ثابت ہوتے ہیں مگر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اُن کا نام ادب سے نہ لوں۔ اُن میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں[3]۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایک وہابی مبلّغ سب سے زیادہ رُوحانیت رکھنے والا، بہت زیادہ بے غرض،

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۵۔ [2] ایضاً ص ۱۴۶۔ [3] ایضاً ص ۱۰۳

اور بے لوث ہوگا۔[1]

وہابی مبلّغ کی یہی (درویشانہ) زندگی ہے جو سب سے زیادہ اُن دیہاتیوں کو جو اُن کی راہ میں پڑتے، اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ سال میں کئی کئی مہینے وہ کسی کے گھر میں قدم نہیں رکھتا (آسمان کے نیچے زمین کے فرش پر زندگی گذارتا ہے) وہ دُور دراز کے صوبوں سے آتا۔ لیکن اُس کے طُول طویل سفر میں اُس کا کوئی ہم سفر نہ ہوتا بجز کسی ایک وفادار مُرید کے، جو اُس کو اُس کے مراقبوں سے وقتاً فوقتاً چونکا دیتا۔ اُس کی حلیم الطبعی اور اپنے گرد و پیش سے بے تعلّقی اُس کو عام آدمیوں سے بظاہر مختلف بنا دیتی ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ دیہاتی اُس کے اردگرد جمع ہو جائیں اور کچھ مُدّت کے لئے پانی اور زمین کی حد بندی کے جھگڑوں کو فراموش کر دیں۔[2]

وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام النّاس میں تبلیغ کرتے ہیں اُن کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی اُمّید و بیم کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بڑی مسرّت کے ساتھ اِس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اُن میں ہزارہا اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعۃً بڑے ہی مُتّقی ہیں اور نفس کُشی کو اپنی زندگی کا نصب العین تصوّر کرتے ہیں یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں اور یہ اُنہیں کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دُنیادار لوگوں کی اکثریّت بڑی عزّت اور تقدّس کی نظر سے دیکھتی ہے۔۔ بہترین

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صکا۔ [2] ایضاً ص۱۰۷

Marfat.com

وہابی وہ ہے جو نہ کسی سے ڈرے، اور نہ اُصول کے خلاف کسی کی رعایت کرے۔ اُس کی زندگی کا راستہ صاف ہے کسی قسم کی تہدید یا تشدّد اُس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے اور اُنھوں نے بغاوت میں حصّہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لئے نہیں لیا۔[1]

دَورہ بنگال، سفرِ حج اور عزمِ جہاد

یہ پروگرام پٹنہ میں دو سال جاری رہا۔ اس نے تحریک کو تازہ دم کر دیا۔ اور ایک عجیب و غریب عقیدہ سے تحریک میں ایک نئی رُوح[2] پیدا کی گئی۔ عقیدہ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۵۸۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۶۔ [3] ہنٹر صاحب کا فیصلہ تو یہی ہے کہ یہ عقیدہ جعلی اور بناوٹی تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"وہ خلیفے جن کو امام صاحب نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، اُنہوں نے ایسے عینی شاہد پیدا کئے جنھوں نے اعلان کیا کہ جس وقت لڑائی زوروں پر تھی، ہمارے امام صاحب کو گرد کے بادلوں میں ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا" (صلا ہمارے ہندوستانی مسلمان)۔

ہنٹر صاحب نے جعلی ہونے کے اور بھی دلائل پیش کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو (باب دوم، ہمارے ہندوستانی مسلمان صلا تا صسے) مگر ہمیں ہنٹر صاحب کے فیصلہ سے اختلاف ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پٹنہ کے ذمّہ دار خلفاء کے جذبات بھی اس عقیدہ سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا وہ دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا یحییٰ علی صاحب جنھوں نے تحریک کو منظّم کرنے میں بے نظیر تدبّر اور سب سے زیادہ سرگرمی سے کام کیا۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو جیلخانوں کی سلاخوں کے پیچھے سیّد صاحب کے فراق میں بڑے درد اور عشق سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

یہ تھا کہ سید صاحب کی وفات نہیں ہوئی۔ وہ زندہ ہیں اور عنقریب ظاہر ہو کر دشمنوں پر غلبہ حاصل کریں گے۔ بہرحال جب صادق پور پٹنہ کی مرکزیت قابل

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ)

جب صبا کوئے یار سے گذرے — اتنا پیغام درد کا کہنا

دن بہت انتظار میں گذرے — کونسی رات آپ آئیں گے

(تواریخ عجیب)

ظاہر ہے کہ جعل کرنے والا خود اپنے جعل سے اتنا متاثر نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی بھی اس عقیدہ کو "سیاسی چال" فرماتے ہیں (شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک ص ۱۹۵) مگر پھر یہ بھی اعتراف کرتے ہیں:

اس پارٹی (صادقپور کی پارٹی) کا مرکز فکر یہی بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصے کے لئے غائب ہو گئے ہیں۔ اُن کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیئے۔ وہ ضرور آئیں گے اور اُنہیں کی امامت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے (ص ۱۹۵ شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک) یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اہل علم کی مرکزی جماعت کا مرکزی فکر جعلی ہو۔

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔ بعض اتفاقی واقعات اس کے مؤید بن گئے۔ امیر شہید بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر تک اپنے اصحاب کو وصیت کرتے رہے ہیں کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لئے ہم چند روز غائب ہو جائیں تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے کام پر مستقل طور سے قائم رہیں۔ درحقیقت وہ اس اشارے اور کنائے سے پیش آنے والے واقعات کے لئے ذہنوں کو تیار کرتے تھے مگر پریشان دماغی اس قدر سوچنے کا موقع کب دیتی ہے۔ اس طرح یہ روایت پیدا ہوئی اور مخالفوں نے سارے ہندوستان میں بھر دی، تاکہ تحریک اپنے عمل کے اعتبار سے ختم ہو جائے (ص ۱۹۳ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک)۔ ہمارے خیال میں سید صاحب کے وہ جملے بھی اس روایت اور عقیدہ کی بنیاد بن گئے جو عزم بالجزم اور مقصد پر مکمل یقین و اعتماد کے ماتحت آپ کی زبان سے صادر ہوئے تھے۔ اور آپ کے معتقدین کے ذہنوں میں پتھر کی لکیر بن گئے تھے۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر رہے تھے تو آپ نے اپنی ہمشیرہ محترمہ سے فرمایا تھا کہ جبتک فلاں فلاں کام انجام نہ پا جائیں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اطمینان حد تک مضبوط ہوگئی تو مولانا ولایت علی صاحب بنگال تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کے مقرر کردہ نائب یعنی آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی صاحب دو سال سے کام کر رہے تھے، اور حیرت انگیز مستعدی سے آپ نے بنگال میں تنظیم کی تھی۔

بنگال میں آپ نے شہروں اور دیہات کا دورہ کیا۔ کلکتہ پہونچ کر مولانا بدیع الزماں صاحب بردوانی کو نائب و خلیفہ کی حیثیت سے مسجد مصری گنج کا امام مقرر کیا۔ پھر آپ بحری راستہ سے بمبئی اور بمبئی سے حجاز تشریف لے گئے۔ راستہ میں جہاں بھی قیام ہوا، مجلسیں آراستہ کر کے داستانِ درد سنائی گئی اور زندہ دلوں کو متوالا بنایا گیا۔ بمبئی میں تقریباً دو ماہ قیام رہا اور حضرت سید صاحب شہیدؒ کی دبائی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے سلگایا گیا۔[1]

چلتے وقت مولانا عنایت علی صاحب کو بمبئی میں اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا، اور آپ مع اہل و عیال مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔[2] حج سے فراغت کے بعد یمن[3]، نجد، اسیر، مسقط، حضرموت، مخا، حدیدہ وغیرہ کا دورہ کیا۔ یعنی وہ تار

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) میری موت نہیں آسکتی۔ اگر کوئی قسم کھا کر بھی میرے مرنے کی خبر دے، اس کا یقین نہ کرنا۔ (سوانح احمدی ملخصاً ص ۹۲) اس پر سونے کا سہاگہ یہ کہ آپ کے معتقدین کا دل نہیں چاہتا تھا کہ حضرت سید صاحب حادثہ موت کے شکار ہوں اور بقول مولانا سندھی شکست فاش کا تصور مجاہدین کے فکر سے کوسوں دور تھا۔ (سیاسی تحریک ص ۱۹۲) بہر حال جذبات نے تمنا اور آرزو میں عقیدے کی قوت پیدا کر دی اور جیسے جیسے جذبات فرو ہوتے رہے عقیدہ بھی مضمحل ہوتا رہا، یہاں تک کہ ختم ہوگیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] الدر المنثور ص ۱۲۲۔ [2] مکہ معظمہ پہنچ کر آپ نے عبداللہ سراج محدث سے سند حاصل کی۔ عبداللہ سراج فرماتے تھے، کہ مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی (ص ۱۲۲ الدر المنثور)۔ [3] یمن پہنچے تو یہاں کے مشہور محدث عالم قاضی محمد بن علی شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) سے سند حدیث حاصل کی اور الدرۃ البہیہ وغیرہ انکی چند تصنیفات ساتھ لائے (الدر المنثور ص ۱۲۲)

Marfat.com

پھر سے جوڑے جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹوٹ گئے تھے۔ واپسی پر مولانا عنایت علی صاحب کو بمبئی سے ساتھ لے کر کلکتہ پہنچے اور بنگال کا دورہ کرتے ہوئے، اپنے مرکز، صادق پور پٹنہ میں فروکش ہوئے۔ آپ نے پارٹی کے ارکان پر دوبارہ نظر ڈالی اور اس مرتبہ مرکزی جماعت میں چند ارکان کا اضافہ کیا۔

مولانا زین العابدین[1] صاحب حیدرآبادی اور مولانا محمد عباس صاحب حیدرآبادی کسی طرح حیدرآباد سے فرار ہو کر اپنے چند ساتھی علماء کے ساتھ پٹنہ پہنچے تھے، اُن کو بھی مرکزی کابینہ میں شامل کیا اور تنظیم کے لئے اڑیسہ اور الہ آباد وغیرہ (یو۔پی) کا علاقہ سپرد کیا۔

مولانا الٰہی بخش[2] صاحب کے چار فرزند، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا فیاض علی صاحب

---

[1] یہ وہی دونوں عالم ہیں جو قیام حیدرآباد کے زمانہ میں مولانا ولایت علی صاحب کی دعوت سے سب سے پہلے متاثر ہوئے تھے اور اُن کے ذریعہ نواب مبارز الدولہ سے تعلق قائم کیا گیا تھا۔ نواب مبارز الدولہ کو نظر بند کیا گیا تو انکو گرفتار کر کے جیلخانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ برسوں جیل میں رہے مگر جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی ع

یہ وہ نشہ نہیں ہے جسے ترشی اُتار دے

آخرکار جیل سے فرار ہوئے اور صادق پور پٹنہ کے انقلابی مرکز میں حاضر ہو گئے۔

[2] مولانا الٰہی بخش صاحب ولد شیخ ہدایت علی صاحب مرحوم ساکن محمد انواں، عظیم آباد پٹنہ، شہر عظیم آباد کے رؤسا عظام میں سے تھے عقل و دانش، فہم و فراست میں یگانۂ زمانہ۔ بڑے بڑے رؤسا، اپنے نجی اور اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے اور آپکی رائے پر اعتماد کرتے۔ نہایت خوش اخلاق، حلیم و مستقل مزاج صاحب مروّت، برادر پرور، درس و تدریس کا شوق تھا۔ حاذق و ماہر طبیب تھے مگر مطب نہیں کرتے تھے۔ زود اثر اعلیٰ قسم کی دوائیں ضرور تیار رکھتے اور خدمت خلق کے جذبہ سے اُن کو مفت تقسیم کرتے۔ اقربا کی نگہداشت اور غریبوں کی ہمدردی میں خاص مقام رکھتے تھے انگریزی حکومت میں بھی آپکی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حق پسندی اور ثبات و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی حق بات بتا دیتا تو اُس پر جم جاتے۔ پھر جمے ہوئے قدم کا اُکھڑنا ناممکن تھا۔

سید صاحب پٹنہ تشریف لائے تو آپ نے دعوت کی۔ مکان پر وعظ کرایا۔ لیکن (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

مولانا یحییٰ علی صاحب اور مولانا اکبر علی صاحب، جو اب تک عملاً تحریک سے غیر متعلق تھے، پارٹی میں شامل ہوئے، سب سے پہلے سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے، اب مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔

اب ابتدائی منزلیں سب طے ہو چکی تھیں اور مجاہدین کی نگاہیں آزاد سرحد کی طرف اُٹھ رہی تھیں کہ سیّد ضامن شاہ (رئیس بالاکوٹ) کی درخواست پہنچی کہ گلاب سنگھ راجہ کشمیر کے مقابلہ پر اُس کی امداد کی جائے۔ یہ درخواست فوراً منظور ہوئی اور مولانا عنایت علی صاحب، سیّد ضامن شاہ کی امداد کے لئے روانہ کئے گئے۔ پھر مولانا ولایت علی صاحب خود بالاکوٹ پہنچے اور مجاہدین کی کمان ہاتھ میں لے لی۔

سیّد صاحب کا قائم کیا ہوا محاذ سونا تو نہیں ہوا تھا۔ مگر اُس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ "کُل ہند" تحریک چلا سکے۔ تقریباً دس سال بعد اُس کی رگوں میں تازہ خون بھرا گیا اور اُس کا رشتہ "صادق پور" سے جوڑ کر اس کو کُل ہند تحریک بنا دیا گیا۔

یہ گلاب سنگھ کون ہیں؟ سیّد صاحب کی شہادت کے بعد سکھوں کی حکومت پر کیا گذری؟ پنجاب کی سیاست میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اب گلاب سنگھ سے مقابلہ سکھوں سے فرقہ وارانہ جنگ تھی یا انگریزی سامراج کے خلاف جارحانہ اقدام تھا؟ اس موقع پر جبتک ان باتوں کی وضاحت نہ ہو جائے، اس تحریک کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا وضاحتِ موضوع کے لئے ہمیں موضوع سے ہٹنا پڑ رہا ہے کہ یہ بے ربطی بھی ایک ربط ہے۔

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) طبیعت بیعت کیلئے آمادہ نہیں تھی۔ صاحبزادوں نے بیعت کر لی مگر آپ نے بیعت نہیں کی اور جب تجربہ نے تحریک کی اہمیت واضح کر دی تو سیّد صاحب کے نائب مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور سب کچھ تحریک کے حوالہ کر دیا۔ چاروں بیٹے تحریک میں شامل ہوئے اور اسی میں فنا ہو گئے لاکھوں روپیہ کی جائداد سرکار کی نذر ہو گئی۔ عظیم الشان حویلیاں کھُدوا کر پھینک دی گئیں تفصیل آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا نصیرالدین صاحب وغیرہ کی امارت میں جماعت اپنا کام کرتی رہی، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ محمد میاں

Marfat.com

پنجاب کی سیاست میں تبدیلیاں

سکھ حکومت کی بربادی۔ گلاب سنگھ اور اُس کے بھائیوں کے کارنامے۔

گلاب سنگھ، جس کے تعارف کے لئے ہمیں موضوع سے ہٹنا پڑا، جموں[1] کا رہنے والا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کا نام "دھیان سنگھ" تھا اور چھوٹے بھائی کا نام "سوچیت سنگھ"۔ یہ تینوں بھائی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں معمولی گھوڑ سواروں میں داخل ہوئے لیکن ترقی کرتے کرتے راجہ دھیان سنگھ وزارتِ عظمٰی کے منصب پر فائز ہوا۔ گلاب سنگھ کو عہدۂ نظامت[2] ملا، اور سوچیت سنگھ گھوڑ چڑھا فوج میں چہار یاری ڈیرہ کا افسر اعلیٰ بنا[3]۔

دھیان سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخر دور میں مہاراجہ کا سب سے بڑا معتمد تھا۔ وہ حرم سرا میں جب چاہتا، بلا روک ٹوک چلا جاتا اور مہاراجہ کے مزاج میں یہاں تک دخیل تھا کہ مہاراجہ کے لڑکے بھی اُس کی اجازت کے بغیر باپ سے نہیں مل سکتے تھے۔ دھیان سنگھ سے زیادہ اُس کا لڑکا ہیرا سنگھ مہاراجہ کو محبوب اور اس کا منظورِ نظر تھا۔ مہاراجہ کو اُس کی جُدائی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں تھی[4]۔

---

[1] یہ ڈوگرہ یعنی پہاڑی تھا۔ اسی سے ڈوگروں کے راج کی بنیاد پڑی۔ جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ [2] گلاب سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خدمت گذار بن کر عہدہ نظامت تک پہنچا۔ پھر انگریزی سرکار کا مخلص وفادار بن کر جموں و کشمیر کا مہاراجہ بنا (تفصیل کے لئے آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں)۔ [3] مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی ص ۲۴۳۔ [4] گلشن پنجاب ص ۳۹۔

۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا[1] ۔ جنگِ اقتدار کی اس سے زیادہ افسوس ناک مثال کیا ہو سکتی ہے کہ ایک منظم اور وسیع سلطنت جو ستلج سے شروع ہو کر درۂ خیبر اور بلوچستان تک پہنچی ہوئی تھی، ریگ کے تودہ کی طرح صرف دس سال کے عرصہ میں بے نام و نشان ہو گئی۔

اس جنگ کا آغاز راجہ دھیان سنگھ کی ایک سازش سے ہوا۔ اس جنگ کی پہلی زد مہاراجہ کھڑک سنگھ پر پڑی۔ جو رنجیت سنگھ کا جانشین تھا اور ابھی پانچ برس پورے نہیں ہوئے تھے کہ یکے بعد دیگرے پانچ گدی نشین اس قربان گاہ پر ذبح کر دیئے گئے منصب وزارت کو سنبھالنے والے بھی بھینٹ ہوتے رہے۔ اور خون کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اُس وقت پایاب ہوا، جب سرزمینِ پنجاب کے چپہ چپہ پر انگریزی فوج کے قدم جم گئے۔

اس وحشت و بربریت اور نفرت انگیز جنگ و جدال کا مقدس مقصد "حُبِّ وطن" قرار دیا جاتا تھا، اور انگریزوں سے ساز باز کا الزام اتنا اشتعال انگیز تھا کہ فوجیں تو درکنار مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوی کو شوہر سے، اور نونہال سنگھ، بیٹے کو اپنے باپ سے برگشتہ کرنے کے لئے جو منتر پڑھا گیا وہ یہی الزام تھا[2]۔

---

[1] مہاراجہ کثیر العیال تھا۔ اس کی رانیاں سولہ تھیں۔ اُن میں سے آٹھ ایسی تھیں جن کے ساتھ باقاعدہ رسومات کے بعد شادی ہوئی تھی، اور باقی آٹھ کو مہاراجہ نے چادر ڈالنے کی رسم پوری کر کے حرم میں داخل کر لیا تھا (تاریخ رؤسا پنجاب از سر لیپل گرفن، و مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی صفحہ ۳۵۵) مہاراجہ کے سات لڑکے تھے۔ کنور کھڑک سنگھ۔ کنور شیر سنگھ، کنور تارا سنگھ، کنور کشمیرا سنگھ، کنور پشورا سنگھ، کنور مُلتانا سنگھ، کنور دلیپ سنگھ۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں سے کئی لڑکے رنجیت سنگھ کی بیویوں کے بطن سے نہیں تھے بلکہ اُن کے گود لئے ہوئے تھے (گلشن پنجاب صفحہ ۶۴)۔ [2] مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب کھڑک سنگھ کو جانشین بنایا، تو اپنے بھروسہ کے وزیر دھیان سنگھ کو وصیت کی کہ وہ اس کا وفادار وزیر ثابت ہو۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ شرطِ وفاداری یہ تھی کہ کھڑک سنگھ، دھیان سنگھ کے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

باپ اور بیٹے میں نفرت کی بھی انتہا ہوگئی کہ مہلک مرض میں مبتلا باپ (کھڑک سنگھ) بیٹے کو یاد کرتا ہے، مگر بیٹا باپ کی صورت دیکھنی گوارا نہیں کرتا صرف ایک مرتبہ "مزاج پرسی" کے لئے گیا اور جب کھڑک سنگھ قلعہ میں محصور دم توڑ رہا تھا، تو نونہال سنگھ "شاہ بلور" میں شکار کھیل رہا تھا۔

کھڑک سنگھ بیمار کیا ہوا، اور اُس کا انتقال کب ہوا؟ اس کی حقیقت پنڈت دیبی پرشاد صاحب سے دریافت کیجئے۔ آپ کا بیان ہے:

"کھڑک سنگھ نے بسبب کھانے سفیدہ کاشغری اور اس کپور کے جو کہ دھیان سنگھ کے مقرر کئے ہوئے طبیبوں نے واسطے اُس کے مرض کے تجویز کی تھی۔ ماہ نومبر ۱۸۴۰ء میں وفات پائی[1]"

مگر دستِ قدرت کا یہ خاموش انتقام بھی کسقدر عبرت ہے کہ کنور نونہال سنگھ شکارگاہ میں باپ کے مرنے کی خبر پاکر ہاتھی پر سوار واپس ہو رہا تھا کہ شہر پناہ کی پھاٹک کا شہتیر[2] اس کے اُوپر گر پڑا۔ اُس کا ساتھی اوتم سنگھ (پسر گلاب سنگھ

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) ہاتھ میں کٹھ پُتلی بن کر رہے۔ اور جب کھڑک سنگھ اس کو برداشت نہیں کر سکا تو دھیان سنگھ نے سازش شروع کر دی کہ کھڑک سنگھ در پردہ انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ وزیر سلطنت اور اس کے بھائی (گلاب سنگھ) نے کنور نونہال سنگھ اور اس کی والدہ کو کھڑک سنگھ کی طرف سے اتنا ورغلایا کہ انہوں نے ارا کینِ سلطنت کی یہ تجویز برضامندی منظور کر لی کہ مہاراجہ کو قید کر لیں یا کسی اور صورت سے اس کو کار و بارِ سلطنت سے بے دخل کر دیں (تاریخ پنجاب عرف گلشنِ پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر ص ۴۲)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] گلشنِ پنجاب ص ۴۳۔ [2] منشی عبدالکریم صاحب مصنف تاریخ پنجاب تحفۂ احباب کی عبارت ملاحظہ ہو:

"طرفہ ہذا اقبالی مہاراجہ رنجیت سنگھ ایں شد کہ کنور نونہال سنگھ پسر کھڑک سنگھ متوفا کہ جوان نوخاستہ وبحلیہ فہم و فراست آراستہ و پیراستہ بود، دفعۃً ازیں جہان سُست بنیان درگذشت (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

و برادر زادہ دھیان سنگھ) فوراً مرگیا۔ نونہال سنگھ کو بے ہوشی کی حالت میں قلعہ لے جایا گیا۔ جہاں وہ تھوڑی دیر زندہ رہ کر باپ کے ساتھ مرگھٹ کے لئے تیار ہوگیا۔

کھڑک سنگھ کی بیوی رانی چندر کنور جس نے اپنے سر کا تاج اپنے ہاتھوں اتارا اور جس کی آنکھوں کا نور قدرت نے چھینا، گدی نشینی کی اُمید پر زندہ رہی۔ لیکن شکنجۂ انتقام کی گرفت سے وہ بھی نہ بچ سکی، اور کچھ ہی دِنوں بعد وُہ بھی قتل کر دی گئی۔[1]

بہر حال دھیان سنگھ اب پہلے سے زیادہ کامیاب تھا اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ اُس نے شیر سنگھ (پسر دویم رنجیت سنگھ) کو مہاراجہ بنایا اور قلمدانِ وزارت خود اپنے جھولے میں ڈالا۔

اُس کے بھائی گلاب سنگھ نے بھی موقع[2] سے فائدہ اُٹھایا اور جمو پر مستقل

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) گویند بعد از سوختن لاش بدر خود بر کنارِ دریا۔ راوی چوں معاودت شہر کرد و سواریِ او بدروازہ شہر رسید۔ بسببِ ہجوم فیلان سواری امراء چنداں چپقلش و ازدحام درمیانِ آں دروازہ شد کہ فیل سواریِ نونہال سنگھ بآہستگی تمام مے رفت، و درچنیں حال مردم توپ خانہ برائے تہنیت و سلامی بموجب حکمِ او یکبارگی صد و پنجاہ ضرب توپ را کہ از بیشتر قریب دروازہ مذکور جمع کردہ بودند سرداد ند۔ از قضا و قدر بصدمہ صدائے توپہا سائیان سنگی آں دروازہ بروے بیفتاد و ہماں ساعت طریقِ عدم و فنا نمود۔ افسوس کہ آں نہالِ نو کہ ہنوز از شجرِ زندگانی برنخوردہ بود بہ تند بادِ اجل از بیخ و بُن بیفتاد (صہ تاریخ پنجاب۔ تحفۂ احباب)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] شیر سنگھ نے جو کھڑک سنگھ کے بعد گدی نشین ہوا۔ اُس کو اسکی خادمہ باندیوں سے قتل کرا دیا۔ کیونکہ اُس نے شیر سنگھ سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور یہ طعنہ دیا تھا کہ وہ دھوبن کے بطن سے ہے جیمل سنگھ کی لڑکی دھوبن کے لڑکے سے راضی نہیں ہوسکتی (گلشن پنجاب صلاً ۵۴)۔ [2] بیٹے اور شوہر کے بعد رانی چندر کنور ہی وارث تخت مانی جاتی تھی۔ اُس نے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

فرماں روا کی حیثیت سے قابض ہو گیا۔

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ مہاراجہ شیر سنگھ کو دھیان سنگھ کی چیرہ دستی اکھڑنے لگی۔ شیر سنگھ نے اپنے استقلال کی خاطر نیا پانسہ پھینکا۔ مگر اس میں دھیان سنگھ بعد میں پھنسا اور پہلے خود شیر سنگھ اور اس کا بچہ شکار ہو گیا ع

چاہ کن را چاہ در پیش

شیر سنگھ نے دھیان سنگھ کو ختم کرنے کے لئے ایسے گروہ[1] سے مدد چاہی، جو در پردہ شیر سنگھ کا بھی دشمن تھا۔ چنانچہ پہلے شیر سنگھ اور اُس کا چودہ سالہ بچہ قتل ہوا۔ پھر دھیان سنگھ اور اُس کے وفادار محافظ (جو مذہباً مسلمان تھا اور جس نے اپنے آقا کو بچانے کے لئے مقابلہ کیا تھا) کو قتل کر کے اُن کی لاشیں قیمہ قیمہ کی گئیں اور قلعہ کی خندق میں پھینک دی گئیں[2]۔

جیسے ہی دھیان سنگھ کے قتل کی خبر اُس کے بیٹے ہیرا سنگھ کو پہنچی اُس نے

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) باضابطہ جنگ کے بعد اُس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ گلاب سنگھ نے اس جنگ زرگری میں نمایاں حصہ لیا، اور فائدہ بھی بہت اُٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گولہ بارود کے بہانہ سے سونے چاندی کے سولہ چھکڑے لدوا کر جموں لے گیا تھا۔ نو لاکھ سالانہ آمدنی کی جاگیر جو رانی چند رکنور کو اسکی وجہ معاش کے طور پر ملی تھی اور بہت سے جواہرات جو رانی کے پاس تھے، یہ بھی گلاب سنگھ کے قبضہ میں آئے (تاریخ پنجاب از دیبی پرشاد صاحب ص ۵۱)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ لہنیا سنگھ، سردار خاندان سندھاں والہ اور اُس کے بھائی عطر سنگھ اور اجیت سنگھ تھے۔ لہنیا سنگھ نے شیر سنگھ کے جلوس کے وقت کچھ مزاحمت کی تھی اس غصہ میں شیر سنگھ نے اس کو قید کر دیا تھا۔ اور اُس کے دونوں بھائی فرار ہو کر سرکار کمپنی کے علاقہ میں چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیر سنگھ نے ان سب کو معاف کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ ممنون احسان ہوں گے۔ مگر یہ اُس سے خار کھائے ہوئے تھے اور اُن کو دھیان سنگھ نے خفیہ طور پر شیر سنگھ کے خلاف بھڑکا رکھا تھا۔ (گلشن پنجاب ص ۵۵)۔ [2] گلشن پنجاب ص ۵۸۔

Marfat.com

پدرِ مقتول کے خون کا بدلہ لینے کے لئے فوج کو مشتعل کیا۔

ہیرا سنگھ کا الزام یہ تھا کہ سندھاں والا جب ہندوستان میں تھے، تو اُنھوں نے انگریزوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ غدر مچائیں گے تاکہ انگریز پنجاب پر قابض ہو سکیں اور فوج خالصہ ختم کر دی جائے۔[1]

ہیرا سنگھ تقریباً چالیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، اور اگلے ہی روز قلعہ فتح کر کے اجیت سنگھ سندھاں والہ اور لہنا سنگھ کے سر قلم کر دیئے منصب وزارت پر اپنا قدم جمایا اور رنجیت سنگھ کی گدی پر اُس کے سب سے چھوٹے نا بالغ لڑکے "دلیپ سنگھ" کو سجا دیا۔ مگر ہیرا سنگھ اور اس کے چچا گلاب سنگھ میں کدورت ہو گئی۔ دوسری جانب رانی چندا والدہ دلیپ سنگھ بھی ہیرا سنگھ کے مقابلہ میں اپنے بھائی جواہر سنگھ کو وزیر دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک شورش برپا ہوئی جس کے نتیجہ میں ہیرا سنگھ قتل ہوا۔ لاہوری دروازہ پر اُس کا سر آویزاں کیا گیا اور جواہر سنگھ وزیرِ سلطنت ہوا۔

اس ہنگامہ سے لاہور کی مرکزیت کو ایک اور دھکا لگا اور گلاب سنگھ اپنی جگہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کے باقی لڑکے ملوکیت کی خون آشامی ملاحظہ ہو۔ خون کی ندی بہ رہی ہے مگر اس کا تالو اب بھی خشک ہے اور تازہ خون تلاش کر رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کا ایک لڑکا کشمیرا سنگھ حیلے بہانے سے ہیرا سنگھ کے دورِ وزارت میں قتل کیا جا چکا تھا۔ جواہر سنگھ وزیرِ اعظم ہوا تو اُس نے سازش کر کے پشورا سنگھ کو بھی قتل کرا دیا۔ مگر جلد ہی راز فاش ہو گیا۔ اور فوج خالصہ نے برہم ہو کر جواہر سنگھ کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

رانی کو اپنے بھائی کے قتل کا بہت صدمہ ہوا۔ کئی روز تک وہ بے پردہ سمادھی پر جا کر ماتم کرتی رہی۔ آخر کار صبر کرنا پڑا۔ اب وزارت لال سنگھ کے حوالے کی گئی۔

---

[1] گلشنِ پنجاب صد ۵۹

پنجاب کا سرسبز و شاداب خطہ جب اس طرح بدامنی اور طوائف الملوکی کا لالہ زار بن کر ہر ایک فاتح کے استقبال کے لئے تیار ہوا، تو انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لئے کب ممکن تھا کہ خاموشی سے تماشا دیکھتی رہتی اور عدمِ مداخلت کے عہد و پیمان پر دیانت داری سے ثابت قدم رہتی۔ اُس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

دربار لاہور خستہ حالی کے باوجود اپنی آن پر قائم رہا۔ فوج خالصہ نے شدت سے مقابلہ کیا۔ مگر اُس کے جرنیل نہ اتنے بہادر تھے اور نہ تجربہ کار۔ چنانچہ تیج سنگھ (کمانڈر انچیف بہادر) تو لاہور ہی میں پس و پیش کرتے رہے۔ وزیر اعظم لال سنگھ بہادر بیس پچیس ہزار فوج لے کر میدان میں پہنچے۔ مگر پہلے ہی معرکے کے بعد راہِ فرار اختیار کی۔ اب فوج موجود مگر جرنیل مفقود۔ اس افراتفری کا نتیجہ شکست اور پسپائی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا[1]۔ گلاب سنگھ راجہ جموں، بے شک اس حکومت کا رُکن نہیں تھا مگر سکھوں کی طاقت کا ایک بازو ضرور تھا۔ وہ امداد کے لئے تین ہزار فوج لے کر آیا۔ مگر اس گرگِ باراں دیدہ نے پہلے ہی ایسی پالیسی اختیار کی کہ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیّاد بھی

سکھوں کے لئے صلح کے سوا چارہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے بھی اُس وقت صُلح ہی کو غنیمت سمجھا۔ کیونکہ مارچ کا مہینہ تھا۔ موسم گرم ہونے لگا تھا۔ انگریزی فوج اور اُس کے مددگار گورکھا فوج کے لئے گرمیوں میں لڑنا دشوار تھا۔ اور بقول مصنّف:

"پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبوں میں غلغلہ مچ رہا تھا اور اگر سکھوں کی لڑائی جلد ختم نہ کی جاتی تو عجب نہیں تھا کہ مُلک میں سرکشی کے آثار نمایاں ہو جاتے[2]"

بہرحال ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزی گورنمنٹ اور دربار لاہور کے درمیان

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ گلشن پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد صاحب و تحفۂ احباب از منشی عبدالکریم صاحب۔ [2] گلشنِ پنجاب صہ ۱۰۹

صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔

یہ صُلح نامہ دربارِ لاہور کے لئے پیغامِ موت تھا کیونکہ اس پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ ڈالا گیا۔ پچاس لاکھ روپیہ کی ادائیگی ہو سکی۔ باقی ایک کروڑ کے عوض میں کشمیر کا صوبہ ضبط کیا گیا۔ البتہ راجہ گلاب سنگھ (جس کے تعارف کے لئے یہ سلسلہ ضبطِ تحریر میں آیا) وہ خوش نصیب تھا جس کا ستارۂ اقبال بلند ہوا۔

وہ اپنے حلقہ کا خود مختار فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ مہاراجہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کو اس کی مستقل حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اُس سے ایک معاہدہ کیا گیا، اور صوبہ کشمیر بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ کمپنی کو ایک کروڑ کی نقد رقم وصول ہو سکے[1]۔

دربار لاہور کے مصلحت اندیش ارکان نے گلاب سنگھ کا پلّہ بھاری دیکھا، تو اسی کی طرف جُھک گئے اور اُس کو وزیر اعظم سلطنت پنجاب مشہور کر دیا[2]۔

لال سنگھ وزیر اعظم کی معزولی: شیخ امام الدّین دربار لاہور کی طرف سے کشمیر کے گورنر تھے۔ جب گلاب سنگھ نے انگریزوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہا تو شیخ صاحب اَڑ گئے[3]۔ کامیاب تو کیا ہوتے، ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کی اس جرأت اور جذبۂ وفاداری نے وزیر اعظم لال سنگھ کا دامن داغ دار کر دیا۔

لال سنگھ پر الزام لگایا گیا کہ شیخ امام الدّین نے اُن کے اشارہ پر مقابلہ کی یہ جرأت کی تھی۔ لہٰذا اس غریب کو نہ صرف معزول بلکہ گرفتار بھی کر لیا گیا اور پنجاب سے جلا وطن کر کے آگرہ بھیج دیا گیا۔ رانی صاحبہ کو غیرت آئی۔ اُنہوں نے لال سنگھ کی معزولی کے خلاف احتجاج کیا، اور ایک پیشکش کی کہ اگر لال سنگھ کی برطرفی کا حکم

---

[1] گلشن پنجاب ص۱۲۳۔ [2] ایضاً ص۱۱۱۔ [3] ایک قلمی مکتوب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب مولانا ولایت علی صاحب سے تعلق رکھتے تھے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ملاحظہ ہو سرگذشت مجاہدین ص۲۵۔

Marfat.com

واپس لے لیا جائے تو ہندوستان کا مشہور ہیرا "کوہِ نور" نذر کر دیں گی[1]۔

مگر کمپنی کے زمانہ شناس ایجنٹ جو مالِ غنیمت میں یہ ہیرا وصول کر سکتے تھے، رانی کا احسان کیوں سر لیتے۔ چنانچہ یہ پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔

۱۶ / مارچ ۱۸۴۶ء کا معاہدہ جو اس وقت کی مصلحتوں کی بنا پر کیا گیا تھا، ڈیڑھ سال بعد انگریزی حرص و طمع کے لئے ناکافی معلوم ہونے لگا۔ تو نئے معاہدہ کا مسودہ تیار کیا گیا اور ۱۶ / دسمبر ۱۸۴۷ء کو اس پر دستخط کرائے گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے ریزیڈنٹ صاحب کے اختیارات بڑھائے گئے۔ ایک کونسل مقرر کی گئی اور طے ہوا کہ ریزیڈنٹ صاحب حسبِ صوابدید لاہور میں انگریزی فوج رکھا کریں گے اور اس کا سالانہ خرچ ۲۲ لاکھ روپیہ دربار کو ادا کرنا ہوگا۔ مہارانی صاحبہ کا وظیفہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ طے کیا گیا[2]۔

اس معاہدہ سے کچھ دنوں بعد ستم رسیدہ رانی کو لاہور سے شیخوپورہ بھیج دیا گیا الزام یہ تھا کہ وہ اس معاہدہ سے راضی کیوں نہیں۔ مہارانی کی جلا وطنی کا جرعۂ تلخ سکھ سرداروں کے لئے اس طرح خوش گوار بنایا گیا کہ وفاداروں کو انعامات، جاگیریں اور وظیفے عطا کر دیئے گئے۔ اب کون تھا جو اس اُتری کمان کو چڑھانے کی فکر کرتا۔

شورش و ہیجان ۱۶ / دسمبر ۱۸۴۷ء کو معاہدہ پر دستخط ضرور ہو گئے۔ اور خود غرض سامراج پرست انعامات سے خوش بھی ہو گئے مگر عوام میں اضطراب و اشتعال تھا کیونکہ:

۱: اُن کا مُلک تاراج ہوا تھا۔ ۲: مہارانی گرفتار ہوئیں۔

۳: پرانی فوجیں منتشر کر دی گئیں جو باقی رہیں اُن کی شان و عظمت گھٹا دی گئی۔

۴: ایک ایسی قوم کا غلبہ ہوا، جو مذہب، تہذیب، تمدن نسل اور وطن ہر ایک لحاظ سے غیر تھی۔

چنانچہ بغاوت نمودار ہوئی[3] علاقہ ملتان کی فوجیں دیوان مول راج کی زیرِ قیادت

---

[1] گلشن پنجاب صہ ۱۲۸ - [2] ایضاً صہ ۱۳۲ - [3] ایضاً ملخصاً صہ ۱۴۴ -

Marfat.com

میدان میں اُتریں۔ انگریزوں کی ہندوستانی فوجوں کے کچھ دستے بھی اُن سے مل گئے، اور ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ مگر جب ہر طرح سے مجبور ہو گئے تو ۲۲ جنوری ۱۸۳۶ء کو دیوان مول راج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ محب وطن مع اہل وعیال قلعہ لاہور میں قید کیا گیا اور پھر کالے پانی بھیج دیا گیا۔[1]

پٹھانوں نے زیر قیادت سلطان محمد خاں و دوست محمد خاں وغیرہ علم بغاوت بلند کیا اور عرصہ تک تہلکہ مچائے رکھا۔[2]

لاہور کی فوجوں میں بغاوت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ ابھی بھڑکنے نہ پائی تھیں کہ سازش کا انکشاف ہو گیا۔ گنگارام، کہان سنگھ اور ایک شخص مسمّی گلاب سنگھ سازش کے بانی قرار دیئے گئے۔ اُن کو پھانسی کا حکم ہوا۔ لیکن جب گلاب سنگھ کی پھانسی کا وقت آیا تو اُس نے مزید انکشاف کا وعدہ کر کے پھانسی سے جان بچالی۔ اس وعدہ معاف گواہ گلاب سنگھ" کی شہادت پر بہت سے سپاہی گرفتار ہوئے۔ جو فوج میں بغاوت پھیلانی چاہتے تھے۔ اس سازش کے تار مہارانی کے دامن سے بھی جوڑ دیئے گئے۔ اب مہارانی صاحبہ کے لئے شیخوپورہ میں بھی گنجائش نہ رہی۔ اُن کو جلاوطن کر کے بنارس بھیجا گیا۔[3] پھر قلعہ چنار گڈھ میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے وہ ایک بیراگن کا بھیس بدل کر فرار ہو گئیں اور نیپال پہنچ کر پناہ لی۔ مہاراجہ نیپال کی طرف سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ آنکی پنشن مقرر ہو گئی۔[4]

۱۸ نومبر ۱۸۴۹ء کو جب لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند لاہور پہنچے، تو نو۹ سکھ گرفتار کئے گئے۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ مہارانی جنداں نے اُن کو بھیجا تھا کہ فوج میں بغاوت پھیلائیں اور راجہ دلیپ سنگھ کو نکال کر لے جائیں۔[5]

۱۔ گلشن پنجاب صـ۱۵۲ ۔ ۲۔ ایضاً صـ۱۴۷ ۔ ۳۔ ایضاً صـ۱۳۹ و صـ۱۴۰ ۔ ۴۔ ایضاً صـ۱۵۳ ۔ ۵۔ ایضاً صـ۱۵۳ ۔

پنجاب کا الحاق اور دلیپ سنگھ کی معزولی الزامات کے ان تند و تیز جھونکوں میں یہ کہاں ممکن تھا کہ دلیپ سنگھ کی راج گدی کا کمزور آشیانہ باقی رہ جاتا۔ اب اس آشیاں کے سارے تنکے بکھیر دیئے گئے۔ تمام سامان، اسباب ضبط، جواہرات اور پورا توشہ خانہ مالِ غنیمت، سکھ ریاست ختم، اور صوبہ پنجاب کا الحاق ممالکِ محروسہ سے کر دیا گیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ اس مختصر سرگذشت کے بعد آپ راجہ گلاب سنگھ والیِ جموّں کے کردار کا جائزہ لیجئے۔

قوم تباہ ہو رہی ہے۔ وطنِ عزیز پر غیروں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ قومی اور وطنی خودداری اور غیرت کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ سیاسی اقتدار کا بھوکا اور ذاتی وجاہت کا حریص "گلاب سنگھ" ہر ایک کو خود غرضی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ یہ تو کہاں ممکن تھا کہ قومی زوال سے اُس کے بدن میں پھریری آتی، اور انگریزوں کی بلاءِ بے درماں کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ چتر سنگھ اور شیر سنگھ وغیرہ رئیس موضع اٹاری نے گلاب سنگھ کو خط لکھ کر وطن عزیز کے کچھ فرائض یاد دلائے، تو اس وفادار مہاراجہ نے وہ خط بجنسہٖ ریزیڈنٹ بہادر کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ ریزیڈنٹ بہادر ایسے بہانوں کی تلاش میں تھے۔ انگریزی فوج حرکت میں آئی اور چتر سنگھ وغیرہ کو مع اہل وعیال گرفتار کر کے جلا وطن، اُن کی جائدادیں ضبط اور اُن کے مکانات مسمار کر دیئے۔[1]

(حالانکہ یہ اٹاری وہ مقام ہے، جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پیدائش ہوئی تھی۔ جس کا چپّہ چپّہ محبّ وطن سکھ کے لئے قابل احترام تھا)۔

اب اگر مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کے بھائی عنایت علی صاحب

---

[1] تاریخ پنجاب از دیبی پرشاد ص ۱۵۲۔

بھی حالات سے متاثر ہوں اور سید ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ کا دعوت نامہ خرمن جذبات میں چنگاری کا کام کرنے لگے اور یہ فدا کاران حریت اپنے ٹوٹے پھوٹے توپ و تفنگ لے کر جان کی بازی لگادیں اور

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

پر آمادہ ہو جائیں، تو اگر یہ قصور ہے تو جذبۂ حب وطن کا اور قلب با احساس کے درد کا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رلائے کیوں

مرکز صادق پور کے مجاہد میدانِ جنگ میں!

۱۸۴۵ء و ۱۸۴۶ء کا وہ زمانہ جس میں سکھ حکومت کے خلاف انگریزوں کی سازشیں کامیاب ہو رہی ہیں، گلاب سنگھ راجہ جمو کی انگریز پرستی طشت از بام ہو چکی ہے، اور مفاد پرست خود غرض عہدہ دار انگریز کے مقابلہ سے جان بچا رہے ہیں اور اسی گلاب سنگھ کو پورے پنجاب کا وزیر اعظم بنا کر سرکار کمپنی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف حالت یہ ہے کہ حفاظتِ وطن کے لئے عوام کے جذبات بھڑک رہے ہیں۔ ایک ایک محبّ وطن انگریز کے مقابلہ کیلئے آتش بداماں اور سر بکف ہے اور بقول مسٹر دیبی پرشاد:

"پورے ہندوستان بالخصوص شمالی مغربی صوبہ میں غلغلہ مچ رہا تھا"[۱]

بالاکوٹ کا رئیس سید ضامن شاہ بھی اپنے علاقہ کی حفاظت کی خاطر تیر کمان سنبھالتا ہے اور جب اپنے حریف راجہ گلاب سنگھ کے مقابلہ میں کمزوری محسوس کرتا ہے تو

---

[۱] گلشن پنجاب صفحہ ۱۰۹

Marfat.com

مولانا ولایت علی صاحب "بانی مرکز صادق پور" سے امداد کی اپیل کرتا ہے۔ یہاں پیمانہ صبر پہلے سے لبریز تھا۔ وہ جذبات جن کی پرورش سالہا سال سے کی جارہی تھی، چھلکنے کے لئے بے تاب تھے۔ سید ضامن شاہ کی اپیل ایک ایسا عنوان تھا جس پر لبیک کہنے کے لئے ہر ایک مجاہد سو جان سے تیار تھا۔ مولانا سید ولایت علی صاحب نے پانچ سو مجاہدین کا ایک دستہ تیار کیا اور مولانا عنایت علی صاحب کی زیر قیادت بالاکوٹ روانہ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد خود بھی رخت سفر باندھا اور ۱۷ رشوال ۱۲۶۲ھ مطابق ۹ راکتوبر ۱۸۴۶ء جمعہ کے دن بالاکوٹ پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

آپ کے رفقاء میں بنگال و بہار وغیرہ کے مجاہدین کے علاوہ مرکز صادق پور کے ممتاز حضرات

① مولانا فیاض علی صاحب

② مولانا یحییٰ علی صاحب

③ مولانا اکبر علی صاحب

(ابناء مولانا الٰہی بخش صاحب و برادران مولانا احمد اللہ صاحب)

اور آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صاحب بھی شامل تھے۔[1]

صادق پور کا مرکز اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کے حوالہ کیا۔ جنہوں نے پورے نظم و ضبط کے ساتھ مرکز کے ہمہ گیر نظام کو اپنی زندگی کے آخری لمحہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) تک قائم رکھا۔

---

[1] الدر المنثور ص ۴۱ و ص ۴۲

گُلاب سِنگھ کی شکست

اور انگریزی ڈپلومیسی کی فتح!

گلاب سنگھ کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ چند ہی حملوں نے اُس کا نشہ ڈھیلا کر دیا اور وہ صلح کی درخواست کرنے لگا۔ مگر بدقسمتی یہ تھی، کہ ان مجاہدینِ حریت نے جس کو اپنا سمجھا تھا، وہ اپنا نہیں تھا۔ ضامن شاہ اور گلاب سنگھ اگرچہ دو حریف تھے، دونوں کے مذہب بھی جُدا، اور نعرے بھی جُدا۔ مگر خود غرضی کے مندر میں وہ شاہ اور یہ سنگھ، ایک ہی طرح کے پجاری تھے۔ یہاں نہ کفر کی پہچان تھی، نہ اسلام کا امتیاز، دونوں ایک ہی محبوبہ اقتدار کے پرستار تھے۔

گلاب سنگھ کی شکست کے بعد اگر مولانا ولایت علی، ضامن شاہ کے آستانۂ اقتدار پر پیشانی رکھ دیتے تو ضامن شاہ کو بھی عقیدت کے پھول پیش کرنے میں تامّل نہ ہوتا۔ لیکن جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس لئے تھا کہ طاغوتی اقتدار کا خاتمہ کر کے عدل وانصاف اور رحم وکرم کی حکومت قائم کرے۔ خودغرضیوں کے شیطان کو جہنّم رسید کر کے، خداپرستی اور بے لوث خدمتِ خلق کا بازار گرم کرے، وہ ضامن شاہ کو "شاہ" اور "نواب" مان کر اُس کے سامنے اپنی مقدّس پیشانی کس طرح جُھکا سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ گلاب سنگھ کی جیسے جیسے شکست ہوئی، ان مجاہدینِ حریّت کی شوکت و حشمت، ضامن شاہ کو اکھرنے لگی۔

بدقسمتی کا دوسرا باب یہ تھا کہ ابھی ایک سال نہیں گذرا تھا کہ الحاق پنجاب کے منصوبہ پر عمل ہونے لگا اور انگریزی فوجیں جو ۱۸۴۶ء تک ستلج کے پار نہیں ہوئی تھیں، اب پنجاب کے چپّہ چپّہ پر پہنچنے لگیں۔

کمپنی کے لفٹننٹ گورنر اور گورنر، جو راجہ دلیپ سنگھ اور مہارانی چندا

کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کی بے پناہ فوج کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

لیکن انگریز کی ڈپلومیسی ہی کیا تھی، اگر وہ براہِ راست مولانا ولایت علی پر حملہ کر کے پُورے شمالی ہند[1] کو اپنے بر خلاف برانگیختہ کر لیتا۔ لہٰذا نہایت احتیاط کے ساتھ ضامن شاہ کے اقتدار پسندانہ رجحانات سے فائدہ اُٹھایا گیا، اور انہیں قبائل کو جن کی نجات کے لئے مجاہدین کا یہ لشکر خاک و خون سے کھیل رہا تھا، انہیں مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ نفرت انگریزی کے لئے وہابیت کا پُرانا الزام کافی تھا، جس کا نتیجہ وہی ہوا، جو پہلے ہو چکا تھا۔

جماعت کے جانبازوں[2] کی زبان سے یہ دل خراش داستان سُن لیجئے:

فوجی افسر ویٹس ایگنیو اور لفٹنٹ ہلسڈن تھوڑی سی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور مجاہدین کے علاقہ کے قریب کیمپ قائم کر دیا یہاں سے خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے علاقہ کے لوگوں کو مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا۔ سید ضامن شاہ نے بھی بے وفائی کی راہ اب پوری رازداری کے ساتھ ایک تاریخ مقرر کر کے سارے مفتوحہ علاقہ میں غدر کرا دیا۔ عُمال یعنی مجاہدین کے مقامی افسر اور مجاہدین کی

---

[1] بہار اس تحریک کا گہوارہ تھا۔ بنگال اور یوپی میں جس طرح دلوں کو گرمایا جا چکا تھا۔ اس کا تذکرہ مختصر طور پر پچھلے صفحات میں گذر چکا تھا۔ سرحدی علاقہ اور پنجاب میں اس تحریک کے اثرات کا اندازہ ہنٹر صاحب کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:

پٹنہ کی عدالت کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے خلفاء نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سر ہنری لارنس کو گواہیوں کے دوران معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں مجاہدین کے نام سے موسوم تھے (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۶)۔

[2] مولانا عبدالرحیم صادق پوری مصنف الدر المنثور و منشی محمد جعفر تھانیسری مصنف سوانح احمدی۔

Marfat.com

پولیس کے ذمہ دار قتل کر دیئے گئے۔ گویا اپنی دانست میں اس تحریک کی جڑیں اکھاڑ دی گئیں۔ افسوس صد افسوس۔

نوٹ: غلام رسول صاحب مہر "تذکرۂ صادقہ" کی اس روایت کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا ولایت علی صاحب جیسے ہی سرحد پہنچے، تین ماہ کے اندر اندر انگریزوں سے پٹش آگئی جو درہ ڈب میں ہوئی۔ اس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔ ضامن شاہ کاغان چلے گئے۔ مجاہدین میں سے مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ گرفتار ہوگئے۔ باقی مجاہدین کی کثیر تعداد بچ کر نکل گئی اور میر اولاد علی صاحب کی زیر قیادت اپنا نظام قائم کیا۔ (ملاحظہ ہو سرگذشت مجاہدین ص۲۵۷ و ص۲۶۷)۔

گرفتاری اور وطن کو واپسی

سید ضامن کی ریاست اور بالاکوٹ کے علاقہ میں مجاہدین کے اس قتل عام کے بعد مولانا ولایت علی صاحب نے علاقہ سوات[1] کا قصد کیا۔ راستہ میں سرکار کمپنی کا علاقہ پڑتا تھا۔ مولانا ولایت علی صاحب لشکر مجاہدین کے ساتھ جب اس علاقہ میں پہنچے تو انگریزی فوجوں نے دفعۃً محاصرہ کر لیا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ:

آپ حضرات نے (مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ) افسران فوج سے راہ داری چاہی اور افسران نے انگریزی عملداری سے باامن و امان گذرنے کی تحریری اجازت بھی بھیج دی مگر جب یہ حضرات

---

[1] اس علاقہ کے رئیس کا نام اکبر شاہ تھا، اور اس سے مجاہدین کی پرانی راہ و رسم تھی۔ ان کا مزید تعارف آگے آئے گا۔

Marfat.com

مع مجاہدین ولشکر روہیلہ سرکاری عمل داری میں پہنچے، تو انگریزی فوجوں نے دفعتہً اُن کا محاصرہ کر لیا۔ راہ داری کے پروانے دکھلائے گئے تو کہہ دیا گیا کہ سرکار کمپنی (گورنر جنرل اور اس کی کونسل) نے ان کی منظوری نہیں دی۔ یہ اُن افسران کی ذاتی تحریریں تھیں جن کے وہ خود ذمّہ دار ہو سکتے تھے۔ مگر اُن کا تبادلہ ہو چکا ہے[1]

بہر حال اُس وقت ہتھیار ڈالنا ہی مصلحت سمجھا گیا۔ چنانچہ آپ کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے :

آپ حضرات نے اطاعت قبول کر لی اور مجاہدین کے دستوں اور روہیلہ فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ راستہ میں سے مجاہدین کی کثیر تعداد فرار ہو گئی اور علاقہ سوات میں پہنچ کر زیر قیادت میر اولاد علی صاحب ستھیانہ کیمپ میں داخل ہو گئی۔ آپ دونوں بھائی باقی مجاہدین، روہیلہ لشکر اور گرفتار شدہ توپ خانہ اور سامانِ جنگ کے ساتھ لاہور پہنچے۔ جان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے دو منزل آگے بڑھ کر گرم جوشی سے آپ کا استقبال کیا۔ آپ کی شجاعت کی داد دی، اور اس موقع پر آپ نے ہتھیار ڈال کر جس تدبّر سے کام لیا تھا، اُس کی تحسین وآفرین کی اور آپ سے درخواست کی، کہ توپ خانہ اور سامانِ جنگ گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کر کے روہیلہ فوج کی تنخواہ ادا کر دی جائے اور اس کو برخاست کر دیا جائے۔ باقی پانچ سو مجاہدین کو اپنے ساتھ لے کر وطن تشریف لے جائیں مولانا ولایت علی صاحب نے اس کو بھی منظور کیا۔ اب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چیف کمشنر نے ایک روز حکومت کی طرف سے اور

---

[1] الدر المنثور ص۱۲۴ و سوانح احمدی

Marfat.com

دوسرے روز خاص اپنی طرف سے آپ کی اور آپ کے ساتھی مجاہدین کی دعوت کی۔ تیسرے روز مولوی رجب علی صاحب[1] میر منشی چیف کمشنر پنجاب نے سب حضرات کی دعوت کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کے خرچ سے اہتمام و اکرام کے ساتھ آپ سب کو مع جملہ مجاہدین کے پٹنہ پہنچا دیا گیا۔ یہ لوگ پٹنہ پہنچ کر پہلے چیف کمشنر کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ کمشنر صاحب نے بڑے تپاک و گرمجوشی سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ اور اندر لے جا کر آپ سے فرمایا کہ گورنمنٹ آپ دونوں سے دو سال کے لئے مچلکے لینا چاہتی ہے۔ دونوں بھائیوں نے یہ بھی منظور کیا اور مچلکوں پر دستخط[2] کر دیئے۔ پھر وہاں سے رخصت ہو کر مکان تشریف لائے۔ پورا شہر آپ کی زیارت کے لئے بیتاب تھا اور آپ کے پہنچنے سے پہلے کمشنر صاحب کی کوٹھی پر ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس دو سال کے عرصہ میں بدستورِ سابق

---

[1] غالباً یہ وہی رجب علی خاں ہیں جن کی بہن بندی بائی بیگم تھی۔ بندی بائی سے بہادر شاہ نے ۱۸۴۷ء میں نکاح کیا تھا۔ زینت محل کے بعد یہ دوسری بیوی تھی جو بادشاہ کی منظورِ نظر تھی۔ مولوی رجب علی صاحب کا مکان دہلی میں کوچہ میر عاشق میں تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے حامی رہے۔ پہلے بھی باغیوں (مجاہدین حریت) کے اقتدار کے زمانہ میں یہ محلہ اس لئے محفوظ رہا کہ بادشاہ کے سالے کا مکان یہاں تھا، اور انگریزوں کے تسلط کے زمانہ میں اس لئے محفوظ رہا کہ مولوی رجب علی صاحب انگریزوں کے وفادار تھے، جو اس دوران مخبری کرتے رہے تھے۔ محمد میاں

[2] پٹنہ کی مشہور فرم امیر خاں و حشم داد خاں کے شریک حشم داد خاں و دلاور خاں کی ذاتی ضمانت تھی جس کی پاداش میں یہ لوگ بھی بعد میں مصیبتوں کا نشانہ بنے اور اُن کی فرم ۱۸۷۱ء و ۱۸۷۲ء میں تباہ کر دی گئی۔ تاریخ مچلکہ ۲۳ جولائی ۱۸۴۷ء (اسلامی سیاسی تحریک ص ۵۶)۔

Marfat.com

وعظ و نصیحت، مراقبہ و مشاہدہ وغیرہ میں مصروف ہو گئے، اور صوبہ جات میں تبلیغ و ارشاد کے لئے دورے شروع کر دیئے مختلف اضلاع اور صوبوں میں مبلّغین کو روانہ کر دیا اور چند ماہ بعد مولانا عنایت علی صاحب کو بنگال روانہ کر دیا[1]۔

مرکز ستھانہ اور مولانا ولایت علی صاحب کی دوبارہ ہجرت

ستھانہ کیمپ مولانا ولایت علی صاحب کی آئندہ کارگزاریوں کے بیان سے پہلے ستھانہ کیمپ اور اس کے بانی کا تعارف ضروری ہے۔

ہنٹر، جو سیّد احمد صاحب شہیدؒ کے متعلق قزّاق اور ڈاکو کے الفاظ استعمال کرنے سے نہیں شرماتا، وہ نو آبادی ستھانہ کے بانی "زمان شاہ" کو ایک قاتل بتاتا ہے جو جان بچانے کے لئے سندھ پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا[2]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آبادی کے بانی زمان شاہ نہیں بلکہ "سیّد ضامن شاہ" ہیں۔ آپ کا آبائی وطن "تختہ بند" تھا۔ یہ دہلی آئے اور یہاں سے اُن کو نوشہرہ کا علاقہ جاگیر میں ملا۔ مگر اس ہما بلند پرواز نے جاگیر کے دامِ زرّیں میں پھنسنا گوارا نہیں کیا، اُس کی سیر چشم و آزاد فطرت نے یہ جاگیر دوسروں کے حوالے کی اور اپنے لئے "مہابن" کی ایک دشوار گذار چوٹی منتخب کر لی۔ یہاں ایک جھونپڑی ڈال کر یادِ خدا کی شمع روشن کی۔ ارادت مند پروانے اس جھونپڑے کے گرد جمع ہونے لگے اور اس طرح موضع ستھانہ اور پھر ستھانہ کیمپ کی بُنیاد پڑ گئی[3]۔ جس نے مہابن کی پُرانی

---

[1] الدر المنثور صـ۱۲۴۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان صـ۳۱۔ [3] آریا جو ترکِ وطن کر کے ہندوستان آرہے تھے، جب ہندوکش سے گذرے تو اُن کے سامنے ساڑھے سات ہزار فٹ اونچا پہاڑ اور اس پر بہت گھنا جنگل تھا۔ ایسا گھنا جنگل اُن کی نظر سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

تاریخ میں ترکِ وطن اور ایثار و اخلاص کی نئی تاریخ کا پیوند لگا دیا۔

سیّد ضامن شاہ، سخاوت، شجاعت اور خدا پرستی میں یگانہ تھے، اور بھی اوصاف تھے جن کے باعث پورا علاقہ اُن کا معتقد ہو گیا تھا۔ اُن کے پوتے سیّد اکبر شاہ، دادا کے نقشِ قدم پر دین داری، محبّت، اخلاص، ہمدردیٔ خلق اور ایثار و قربانی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ صاف دماغ، اور صاف گو، عہد کے پابند۔

سیّد اکبر شاہ نے حضرت سیّد احمد صاحب شہیدؒ سے تعلّق قائم کیا۔ پھر خود بھی بیعت کی اور گھر کے سب چھوٹے بڑے، یہاں تک کہ اُن کی والدۂ محترمہ بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئیں۔ اس علاقہ میں جس نے پیمانِ وفا کو پوری طرح نبھایا، یہی سیّد اکبر شاہ ہیں۔ حادثہ بالاکوٹ نے اس پیمان کو کمزور کرنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط کر دیا۔[1]

چنانچہ سیّد صاحب کی شہادت کے بعد یہی نوآبادی غازیوں کا مرکز بن گئی، اور پورے ہندوستان میں یہاں تک مشہور ہوئی کہ ایک انگریز تاجر کی روایت کے بموجب:

"شمالی ہند کے بہت سے مسلمان اپنی آمدنی کا ایک حصّہ اس کیمپ کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے اور جو زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے، وہ ہر سال اس کیمپ میں پہنچتے اور ہلالی فوج میں بھرتی ہو کر

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) نہیں گذرا تھا اس لئے وہ اس کو "مہابن" کہنے لگے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کے تارکینِ وطن کا پناہ گاہ بھی یہی مہابن بنا، اور جس طرح وہ کئی ہزار سال پہلے آنے والوں کے استقبال کے لئے حاضر تھا، کئی ہزار سال بعد جب جنگِ آزادی کے مورچہ کے لئے محفوظ مقام کی ضرورت پیش آئی تو اسی پہاڑ نے دامن پھیلا دیا۔ محمد میاں

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ سیرت سیّد احمد شہید از غلام رسول صاحب مہر۔

Marfat.com

فریضۂ جہاد ادا کیا کرتے تھے۔[1]

دوبارہ ہجرت ستھانہ کیمپ کا مختصر تعارف ہوچکا۔ اب مولانا ولایت علی کا قصّہ سُنیئے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری راوی ہیں:

جناب کو (مولانا ولایت علی صاحب کو) ہندوستان میں واپسی کا نہایت رنج و ملال تھا۔ اکثر دوپہر اور رات کو آسمان کے نیچے کھڑے ہوکر اور کبھی سجدے میں سر رکھ کر نہایت بے قراری اور اضطراب کے ساتھ اس مُلک سے نکلنے کی دُعا کرتے رہے۔ ابھی مچلکہ کی میعاد میں کئی مہینے باقی تھے کہ آپ نے دولت خانہ کو فرشِ فروش جھاڑ و فانوس اور دیگر اشیاءِ زینت سے خُوب آراستہ و پیراستہ کیا اور اصطبل میں عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر باندھے اور عمدہ عمدہ رنگین کبوتروں سے کبوتر خانہ سجوایا۔ تاکہ لوگوں کو یقین ہوجائے کہ آپ دنیا میں خُوب پھنس گئے ہیں اور اب ترکِ وطن نہ کرسکیں گے مگر میعاد پوری ہوتے ہی یک بیک چند احباب مخلصین اور مولوی یحیٰی علی صاحب کو ساتھ لے کر بارادۂ ہجرت مُلک سوات روانہ ہوگئے۔ اس عرصہ میں سیّد اکبر شاہ کا مُلک سوات سے آپ کی طلبی کا خط بھی پہنچا تھا۔

آپ نے مولانا عنایت علی صاحب کو لکھ بھیجا کہ مکان سوتے ہوئے تم بھی چلے آؤ اور اپنے بڑے فرزند مولوی عبداللہ صاحب اور (اپنے ایک عزیز) مولوی فیاض علی صاحب کو فرما گئے کہ ایک ہفتہ کے اندر مع کُل عیال و اطفال و اسباب سفر مجھ سے موضع

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صہ٣٣۔

Marfat.com

گڈھانہ میں آکر ملو۔ اس پہلے قافلہ کا تخمینہ دو ڈھائی سو کا ہوگا۔ اب مکان پر صرف پانچ مرد رہ گئے تھے اور دو عورتیں۔

سادگی کی انتہا اور سفر کی منزلیں راستہ میں حاجی امام علی صاحب رئیس کولور نے دعوت کی تیاری کرنی چاہی۔ آپ نے دعوت کے اہتمام سے اُن کو روک کر فرمایا۔ آپ کے گھر میں ہلوائیوں کے لئے جو ستّو رہتا ہے، اسی کو لائیں۔ مجبوراً انھوں نے تعمیلِ ارشاد کی، اور آپ نے تمام قافلہ کو اور خود اپنے گھر کے تمام آدمیوں کو وہی ستّو کھلایا۔

جب آپ آرہ پہنچے، چودھری ہدایت بشیر صاحب رئیسِ اعظم آرہ نے بڑی لمبی دعوت کرنی چاہی، اُن کو بھی اس سے روک کر صرف چاول دال اور ایک دیگ طلب کی اور کھچڑی پکوا کر تمام ساتھیوں کو سیر کرایا اور آرام سے سو رہے۔

وہاں سے چل کر غازی پور پہنچے۔ مولوی محمد فصیح صاحب نے آپ کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ قافلہ کو مسجد میں جگہ دی عورتوں کو اپنے زنان خانے میں لے گئے اور مولانا کو اپنے رہنے کے حجرے میں جگہ دی اور دونوں وقت زنان خانہ سے کھانا لاکر خود سب کے ہاتھ دھلواتے، کھانا کھلاتے اور پس خوردہ خود مع اہل وعیال تناول فرماتے اور بوقت رخصت آرزو ظاہر کی کہ آپ کا قاصد مجھ سے ملتا جایا کرے۔

یہاں سے رخصت ہو کر قریہ بقریہ اور شہر بشہر وعظ و نصیحت اور ہدایت کرتے ہوئے ڈیڑھ برس کے عرصہ کے بعد آپ دہلی پہنچے۔

دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقاتیں آپ نے دہلی میں تقریباً

Marfat.com

دو ماہ قیام کیا۔ جامع مسجد فتحپوری کے قریب ایک وسیع مکان میں آپ کا قیام تھا۔ جامع مسجد اور دہلی کے مختلف اطراف واکناف میں آپ کا وعظ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ بیگم زینت محل کے اُستاد مولانا امام علی صاحب اور دہلی کے مشہور شاعر "مومن خاں" مجلس وعظ میں اکثر حاضر رہتے۔ مولانا امام علی صاحب باضابطہ بیعت بھی ہو گئے اور بادشاہ اور بادشاہ بیگم سے مولانا کے اوصاف بیان کر کے اُن کو مشتاقِ زیارت بنا دیا۔ بادشاہ نے مولانا صاحب کی معرفت پیغامِ دعوت بھیجا۔ مولانا ولایت علی صاحب نے معذرت کی، اور پھر بادشاہ کے شدید اصرار سے متأثر ہو کر دعوت منظور کر لی۔ پانچ آدمیوں کے ساتھ آپ قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے تخت سے اُتر کر لبِ فرش تک آپ کا استقبال کیا، اور پھر اپنی برابر آپ کو تخت پر بٹھا لیا۔

اس کے بعد وعظ شروع ہوا۔ آپ نے آیۃ کریمہ اِنَّمَا الحیوٰۃ الدّنیا لعب ولھو و زینۃ وتفاخر تلاوت کی۔ اثناء وعظ میں جب آپ نے "عذاب شدید" کی تفسیر شروع کی تو وزیر اعظم نے جھک کر کان میں کہا کہ "بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں ہے"۔ مگر آپ نے اس کی پروا نہیں کی۔

بادشاہ، بیگمات، شاہزادے اور حاضرین مجلس وعظ سے بہت متأثر ہوئے۔ اکثر کے آنسو بہنے لگے۔ جب وعظ ختم ہوا۔ تو بادشاہ نے ترکِ دنیا کے متعلق اپنے اشعار پیش کئے جن کو ریزیڈنٹ نے پڑھ کر سنایا پھر ریزیڈنٹ نے تمام قلعہ کی سیر کرائی۔

Marfat.com

جب آپ قلعہ سے واپس ہوکر قیام گاہ پر پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے مومن خاں اور مولوی امام علی صاحب کھانے کے پچاس خوان لے کر حاضر ہوئے۔ مومن خاں نے آپ سے بیعت بھی کی۔ اور فرمائش پیش کی کہ رمضان میں آپ یہاں قیام فرمائیں۔ قلعہ کے کسی محل میں فروکش ہوں۔ نماز تراویح ساتھ ساتھ ادا کریں اور وعظ و نصیحت سے مستفیض ہونے کا موقع دیں لیکن مولانا عنایت علی کی نظر ریذیڈنٹ کے رویہ پر تھی۔ آپ نے زیادہ قیام مناسب نہیں سمجھا اور فوراً ہی کوچ کر کے جمنا پار ہو گئے اور وہیں رمضان کا چاند دیکھا۔

وہاں سے کوچ کر کے منزل در منزل طے کرتے ہوئے آپ لدھیانہ کے قریب پہنچے اور مولانا عنایت علی صاحب کے انتظار میں "سرائے کھنا" میں ٹھہرے رہے۔ مولانا عنایت علی صاحب کے پہنچتے ہی دونوں بھائی چند ہمراہیوں کے ساتھ سوات روانہ ہو گئے۔ مولانا عبداللہ صاحب کو ہدایت کر گئے کہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہمراہیوں کو روانہ کرنا، اور خود مع جملہ اہل و عیال جلد جلد منزل طے کرتے ہوئے ملک یاغستان پہنچنا۔

سید اکبر شاہ نے آپ کی آمد کی خبر پا کر نہایت گرمجوشی سے مع لشکرِ مجاہدین آپ کی پیشوائی کی۔ جب آپ کے ہجرت کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی، تو اکثر مخلصین ہندوستان سے ہجرت کر کے آپ کے پاس پہنچ گئے۔

ہجرت کے بعد آپ تبلیغ و ارشاد، درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ظہر درس دیتے اور صبح کے وقت مراقبہ اور مشاہدہ میں لوگوں کو توجہ دلاتے، اور ایک معیّن وقت پر

Marfat.com

فوجی پریڈ اور فن سپہ گری کی مشق کرایا کرتے۔[۱] کچھ عرصہ وہاں قیام رہا۔ یہ پوری مدت جہاد کی تیاریوں میں گذری۔

وفات مگر ابھی قتال وجدال کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ رحمتِ الٰہی نے یاد کیا۔ سرحد کی زمین پسند آئی اور وہیں رہ گئے۔ محرم ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں بعارضہ خناق وفات پائی۔ ۶۴ سال عمر ہوئی۔ ستھانہ میں دفن کئے گئے۔ دخل خلداً تاریخ وفات ہے۔

۱۲۶۹ھ

مولانا عنایت علی غازیؒ

عمر کا تیسواں دورہ پورا کر رہے تھے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

بیعت، ایک باعمل انسان کے لئے سعی پیہم کا معاہدہ ہوتی ہے۔ مولانا عنایت علی غازیؒ پیکرِ عمل تھے۔ بیعت کے بعد سے وفات تک آپکی زندگی کا ایک ایک لمحہ بے پناہ سرگرمیوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی وقت اور کسی حال میں بھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ بیعت کے بعد حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے قافلہ میں شریک ہو کر محاذِ جنگ پر گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد دہلی کے ایک عالم[۲] نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ تو ایک مبصر و مشاہد کی حیثیت سے پروپیگنڈے کی تردید کے لئے آپ کو سید صاحبؒ نے دہلی بھیج دیا۔[۳] ابھی آپ یہی فرض انجام دے رہے تھے کہ حادثہ

۱؎ الدر المنثور ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۷۔ ۲؎ ان کا نام مولوی محبوب علی تھا۔ یہ سرحد گئے اور آزردہ خاطر ہو کر واپس آکر تحریک کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں بھی یہ مخالف رہے۔ مگر جب انگریزوں نے ان کو انعام میں کئی گاؤں کی جاگیر دینی چاہی تو انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ آپکی حمایت میں نہیں کیا بلکہ میری تحقیق میں مسئلہ اسی طرح تھا (سید احمد شہید از غلام رسول صاحب مہر)۔ ۳؎ الدر المنثور ص ۱۳۳

Marfat.com

بالاکوٹ نے بحث کا موضوع ہی بدل دیا۔

جب مولانا ولایت علی صاحب نے زمامِ قیادت سنبھالی تو آپ اُن کے سب سے بڑے معتمد اور عملی جدّوجُہد میں دستِ راست بلکہ رُوحِ رواں تھے۔ آپ نے تقریباً سات سال تک بنگال کا دورہ کر کے وہ نظم قائم کیا جو تقریباً چالیس سال تک مجاہدینِ سرحد کے لئے آدمی اور روپے فراہم کرتا رہا۔ آپ نے مولانا شریعت اللہ صاحب کے ماننے والوں کو "جو فرازی" کہلاتے تھے، تحریک میں شریک کیا اور اُن حضرات کو بھی تحریک کا سرگرم ممبر بنا لیا جو نثار احمد صاحب عرف ٹیٹو میاں کے ساتھیوں میں سے باقی تھے۔ ابھی آپ بنگال میں جہادِ حرّیت کی سُرنگیں بچھا رہے تھے، کہ سیّد ضامن شاہ کی اپیل پر ایک نیا مورچہ بالاکوٹ میں قائم کیا گیا۔ پہلا شخص جس نے اس مورچہ پر فتح و کامرانی کا جھنڈا گاڑا، یہی غازی تھا، جس کے فولادی عزم کے سامنے موت کا بھی پتہ پانی ہوتا تھا۔

مولانا ولایت علی صاحب جب گرفتار کر کے واپس کئے گئے، تو آپ بھی ساتھ تھے۔ کچھ دنوں پٹنہ میں قیام کر کے پھر بنگال پہنچے، اور جنگِ آزادی کی بھٹیوں کو دوبارہ گرم کر دیا۔ تقریباً ۱۸۵۰ء میں مولانا ولایت علی صاحب نے دوبارہ سرحد کا رُخ کیا، تو آپ بھی بنگال سے روانہ ہو کر اوّل والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اُن سے ہجرت کی اجازت چاہی[1]۔ پھر اپنے حصّہ کی تمام جائداد فروخت کر کے مع اہل و عیال روانہ ہوئے۔ مولانا ولایت علی صاحب کا قافلہ کھنا سرائے (پنجاب) فروکش تھا کہ آپ بھی پہنچ گئے۔

سوات پہنچ کر کچھ دنوں بڑے بھائی کی قیادت میں کام کیا۔ پھر آپ نے جُدا ہو کر اپنا مورچہ الگ لگایا۔

اس علیحدگی کا سبب کیا تھا؟ انگریزی دور کے ایک مسلمان مورّخ[2] کا محتاط

---

[1] الدر المنثور ص ۱۳۷۔ [2] مولانا مسعود عالم صاحب۔ ملاحظہ ہو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۶۲ و سوانح احمدی ص ۱۲۴

جواب ملاحظہ فرمائیے:

مولانا ولایت علی صاحب جہاد کی تیاری ہی میں وقت صرف کر رہے تھے۔ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیئے۔ جہاں داد خاں والی اَنب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی۔ مگر مولانا ولایت علی صاحب نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازی کو ناگوار معلوم ہوئی، اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے۔

اس مجمل بیان کی تفصیل کے لئے انگریزوں کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

جہاں داد خاں والی اَنب ہمارا حلیف تھا[1]۔ سید اکبر شاہ کے لڑکے مبارک شاہ نے عنایت علی کے ساتھ "مردان" کے قلعہ پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا۔ لیکن اس کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا۔ تب عنایت علی ناراض چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو ورغلانے کی کوشش کی[2]۔

ان مختصر شہادتوں نے واضح کر دیا کہ اختلاف صرف یہ تھا کہ "قلعہ مردان" کی مہم کی ناکامی کے بعد مولانا ولایت علی صاحب اسی محاذ کو دوبارہ مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا عنایت علی صاحب نے صرف اتنی بات کو کافی نہیں سمجھا۔ آپ نے ایک دوسرا محاذ بھی تیار کر لیا۔ یہ یوسف زئی کا علاقہ تھا جہاں سید عباس رئیس علاقہ کے تعاون سے آپ نے منگل تھانہ میں دوسرا مورچہ کھول دیا۔

بہر حال جنگ آزادی کے یہ جرنیل اور کمانڈر جو ایک عرصہ تک حُبِّ وطن اور

---

[1] مسٹر ٹی۔ ای۔ راونشا (T.E. Revinshan) مجسٹریٹ پٹنہ ۱۸۶۵ء کا میمورنڈم۔ نیز ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر ص ۳۸۔ [2] جنرل رپورٹ متعلق یوسف زئی از ایچ۔ ڈبلیو بیلیو لاہور ۱۸۶۴ء بحوالہ اسلامی تحریک۔

Marfat.com

انگریز دشمنی کے جذبات شیر سنگھ یا گلاب سنگھ کی مخالفت کے پردے میں چھپائے ہوئے تھے، اب کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ انگریز اُن کا دشمن تھا، اور یہ آزاد منش محبّ وطن بہادر، عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر انگریز دشمنی میں قربانیاں پیش کرنا، سب سے بڑی سعادت، اور اس راستہ میں فنا ہو جانا اعلیٰ درجہ کی شہادت سمجھتے تھے۔

اس پوری تاریخ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انگریز جس طرح مجاہدین کے حریف تھے، سکھوں کے بھی حریف تھے۔ لہٰذا مجاہدین اور سکھوں کی جنگ انگریزوں کے لئے فال نیک تھی۔ اکثر مؤرخین کے سامنے صرف یہی پہلو ہے اور چونکہ ابتداء میں انگریزوں نے مجاہدین کی کارروائیوں میں مزاحمت نہیں کی، تو اُن کو ایک دلیل بھی مل گئی ہے۔ مگر درحقیقت یہ مؤرخین کی غلطی ہے اور جن انگریزوں نے ایسا سمجھا، اُن کی خام خیالی تھی۔ کیونکہ مجاہدین کے حریف وہ سکھ تھے جو انگریزوں کے حریف نہیں بلکہ حلیف تھے۔ جیسا کہ پہلے گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔

مستقل امارت اور انگریزوں سے جنگ

مولانا ولایت علی صاحب کے انتقال کے بعد مولانا عنایت علی صاحب غازی منگل تھانہ سے ستھانہ تشریف لے آئے جو مجاہدین کا مستقر اور ہیڈ کوارٹر تھا۔ تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آپ نے جیسے ہی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی، انگریزوں کے حلیف جہاں داد خاں والی اَنب پر حملہ کرنے کا منصوبہ پورا کرنا شروع کر دیا۔

آپ کا یہ حملہ کامیاب ہوا۔ جہاں داد خاں کی قوت ٹوٹ گئی۔ انگریزوں کو بار بار امداد کے لئے فوجیں بھیجنی پڑیں۔ جو ناکام رہیں۔ مگر افسوس حالات نے مساعدت نہیں کی۔

۱: ازلی وفادار اکبر شاہ کے لڑکے بے وفا ہو گئے۔

۲: ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان کی عام بغاوت نے امداد کے راستے بند کر دیئے۔

Marfat.com

۳ : انگریزوں کی تازہ دم فوجوں نے جب ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریّت کو ناکام کر دیا تو ان مجاہدین پر تاخت کی اور ان کو پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

یہی وہ دور تھا کہ پیغامِ اجل آپہنچا، اور ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) کے آخر میں آپ نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ رحمہ اللہ

اب اس دور کے متعلق پہلے سوانح نگاروں کا رقّت انگیز بیان ملاحظہ فرمایئے اس کے بعد انگریزی مؤرخین کی شکایت سُنئے :

مولانا عبد الرحیم صاحب کا ارشاد ہے :

۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راستے پُرخطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے، جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھے۔ اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جا سکتا مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں سے اصحابِ صفہ کی سُنّت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلّہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ آپ مہاجرین و انصار پر صرف کر چکے تھے، اور تھا بھی کیا، اُونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی تلخ تھی۔ یہ وقت تھا کہ اگلی اُمّتیں مضطر ہو کر متٰی نصر اللہ پکار اُٹھتی تھیں۔ مگر اس صبر و استقامت کے پہاڑ نے پورے صبر و تحمّل کے ساتھ راضی برضا رہتے ہوئے اَللّٰھُمَّ بالرفیق الاعلیٰ زبان ترکرتے ہوئے بعارضہ بخار و ضیق النفس ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۸ء) کے آخر میں سجن المومن سے جنّت مقیم کو رحلت کی۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ واحشرہ فی زمرۃ المھاجرین

Marfat.com

الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیك صلی الله علیه وعلی اله وصحبه اجمعین۔ (الدر المنثور ص۱۳۸)

یہ مولانا عبد الرحیم صاحب کا بیان ہے جو ایسے وقت لکھا گیا، کہ اس خاندان کی تباہی کے بعد باقی ماندہ افراد کو برطانوی سامراج کے غیض وغضب سے بچانا مقصود تھا۔

اس کے بعد ان مجاہدین کے خاص کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر کا غضب آلود بیان ملاحظہ فرمائیے۔ وہ انقلابی سرگرمیوں اور خفیہ سازشوں کا شکوہ کس طرح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"۱۸۵۲ء میں ان مجاہدین نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آگیا ہے۔ روپیہ اور آدمی ہمارے علاقوں سے ستھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومتِ پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط وکتابت بھی پکڑلی تھی یعنی انہوں نے کمال عیّاری کے ساتھ ہماری ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصّب نوآبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبے پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ اُن خطوط سے یہ بات، پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔

انہیں دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس انگریزی صوبہ کے دار الخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی علانیہ تبلیغ کر

Marfat.com

رہے ہیں۔ پولیس بھی انہیں دیوانوں کی طرف دار تھی اور اُن کے لیڈروں میں سے ایک نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اس غرض سے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلہ میں کوئی مزید تفتیش ہوئی، تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے گا۔

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا، اُس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھ بند نہ کر سکتی تھی...... اسی سال (۱۸۵۲ء) میں انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط وکتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل وغارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک، ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔

اس اثناء میں ستھانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف

Marfat.com

سرحد میں تعصب کے جذبات کو اُبھارتا رہتا تھا نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہِ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنا ڈالی جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصّہ لیا۔ اس سال اُن لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ اس علاقہ میں معیّن سرکاری افسروں سے تحویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہوگئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے۔ اور لفٹنٹ ہورن کے کیمپ پر شبخوں مارا، جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے اب زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سرسڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہوگیا (جس کی تفصیل یہ تھی۔ توپخانہ ۲۱۹۔ سوار ۵۵۱۔ پیدل ۴۱۵۷۔ کُل ۴۸۸۷ باقاعدہ فوج)۔۔۔۔ بڑی دقّت کے بعد جنرل سرسڈنی کوٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُن کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار اور ستھانہ کی باغی نوآبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ مہابن پہاڑیوں کی دشوار گذار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اپنی قوّت کو ذرا بھی ضعف نہ پہنچنے پایا۔ کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر انہیں ایک نوآبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی[1]۔

انگریزوں نے اس فوجی مہم کے علاوہ دوسری حرکت یہ کی کہ کچھ قبائل کو ستھانہ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان از ص۳۷ تا ص۴۰

کیمپ کے خلاف آمادۂ جنگ کر کے ستھانہ کیمپ کے رئیس (سید اکبر شاہ صاحب کے بھائی) سید عمر شاہ کو قتل کرا دیا[1] اور مجاہدین کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرا دیا۔

خدا بُرا کرے رقابت کا جو ان قبائل میں ایک موروثی ترکہ ہے۔ انگریز جیسے شاطرین سیاست کے لئے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا کیا مشکل تھا۔ اور جب سنہری تمناؤں کے سبز باغ بھی دکھائے جا سکتے تھے، تو بدنام وہابیوں کے خلاف ہر ایک مشکل آسان ہو سکتی تھی۔ یہاں ان سب حربوں سے کام لیا گیا اور مجاہدینِ حریت پر عرصۂ حیات زیادہ سے زیادہ تنگ کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ مولانا عنایت علی غازی نے اپنے دَور میں:

(۱) براہِ راست انگریزوں کے مقابلہ پر مہم جاری کی۔ جس کی مدافعت کے لئے سات سال میں ۱۶ مرتبہ برطانوی فوجیں بھیجی گئیں۔

(۲) ۱۸۵۷ء میں ایک طرف ہندوستان بالخصوص شمالی ہند انقلاب اور بغاوت کا آتش کدہ بنا ہوا تھا۔ دوسری جانب مولانا عنایت علی غازی نے علاقۂ سرحد سے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔

(۳) مولانا عنایت علی غازی اور ستھانہ کیمپ کی طاقت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ انگریزوں کو ایک بہت مضبوط فوجی اڈا، مقابلہ کے لئے قائم کرنا پڑا۔ جس میں باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ یعنی بے قاعدہ اور باقاعدہ فوج و پولیس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔

(۴) اس فوجی مہم کے علاوہ ڈپلومیسیوں سے کام لے کر کچھ قبائل کو مجاہدین کے خلاف بھڑکایا گیا۔ ان کے خلاف ہنگامے برپا کرائے گئے۔ اور ستھانہ کیمپ کے رئیس سید عمر شاہ کو شہید کرا دیا گیا۔

(۵) ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے باعث شمالی ہند سے ستھانہ کیمپ کی

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۰

Marfat.com

امداد بند ہوگئی اور وہ تقریباً ایک لاکھ فوج کے نرغے میں آگیا۔ کچھ قبائل نے بھی ہنگامے برپا کرکے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

(٦) انگریزوں اور اُن کے ہم نواؤں کی اس بے پناہ یورش کا اثر مجاہدین پر صرف اتنا پڑا کہ ستھانہ سے ہٹ کر انہوں نے مہابن میں اپنا کیمپ قائم کر لیا۔ لیکن مالی مشکلات میں وہ اس طرح گھر گئے کہ بقول مولانا عبدالرحیم صاحب ایک عرصہ تک اُن کو کونپلوں اور پتیوں پر گذارا کرنا پڑا۔ اسی حالت میں مولانا عنایت علی صاحب بیمار ہوئے اور رخصت ہوگئے۔ رحمۃ اللہ ورضی عنہ۔

مولانا عنایت علی غازیؒ کے بعد

مولانا نور اللہؒ، میر مقصود علیؒ اور مولانا عبداللہ صادقپوریؒ

مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے حضرت مولانا عنایت علی غازی رحمۃ اللہ اس دار محن سے رخصت ہو چکے۔ مگر یہ مٹھی بھر جماعت جو کسی حال میں انگریز کی قیادت اور غیر ملکی اقتدار قائم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی، اب بھی زندہ ہے۔

عزم و ارادہ کے یہ پختہ کار بہادر جو ناز و نعم کے گہواروں میں پل کر جوان ہوئے تھے، اپنے عشرت کدوں، عظیم الشان دیوان خانوں اور جنت نشان وطن عزیز کو چھوڑ کر کوہستان کے تاریک دروں میں اس لئے زندگی گذار رہے تھے کہ حریت اور آزادی اُن کو دنیا کی ہر ایک نعمت اور ہر ایک عزت و عظمت سے زیادہ عزیز تھی۔ اور نصب العین کے لئے مر مٹنا اُن کے نزدیک حیاتِ جاوید اور ابدی زندگانی تھا۔ یہ مردانِ باخدا مسادیانہ زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ چھوٹے بڑے کا نشیب و فراز

Marfat.com

اُن کے یہاں ختم ہوگیا تھا مگر جماعتی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے وہ ایک امیر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا عنایت علی غازی کی رُوحِ پُر فتوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، تو فوراً ہی انتخابِ امیر کے لئے تگ و دو شروع کر دی گئی مولانا نور اللہ[۱] صاحب اس منصب کے لیے سب سے بہتر نظر آئے، زمامِ قیادت انہیں کے سُپرد کر دی۔

آپ کا زمانۂ امارت صرف دو سال ہے۔ اس عرصہ میں کوئی مہم پیش نہیں آئی۔ تمام سرگرمیاں اُس کمزوری کو دُور کرنے میں صَرف ہوتی رہیں جو "سڈنی کاٹن" کے حملوں سے مجاہدین کی فوج میں پیدا ہوگئی تھیں۔ دوسری کوشش یہ ہوتی رہی کہ ان قبائل کو ہمنوا کر لیا جائے جن کو انگریزی مدبّر مخالف بنا چکے تھے۔ مولانا نور اللہ صاحب کے بعد میر مقصود علی[۲] صاحب اس منصب کے لئے منتخب کئے گئے۔ آپ کے زمانہ میں انگریزی فوجوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ مگر ابھی دو سال

---

[۱] غلام رسول صاحب مہر ڈاکٹر بیلیو کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا عنایت علیؒ کی وفات کے بعد اُن کے فرزند حافظ عبد المجید کے بجائے تین آدمیوں کو مشترکہ امیر بنا دیا گیا۔ ایک مولانا نصر اللہ، دوسرے شاہ اکرام اللہ اور تیسرے میر تقی۔ اور حافظ عبد المجید کو اس لئے امیر نہ بنایا گیا کہ اُن کی زبان میں لکنت تھی۔ مشترکہ امارت میں مولانا نور اللہ کو دوسروں پر تقدم حاصل تھا۔ گویا وہ اس بورڈ کے صدر تھے۔ انہوں نے ضلع پشاور کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف برانگیختہ کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ لیکن حکومت نے ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ (سرگذشت مجاہدین ص۳۰۵)۔ ان تین امیروں میں سے شاہ اکرام اللہ "شاہ نور لڑی" کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ مولانا نور اللہ کابل جاتے ہوئے بلا سر (وادی جملہ) پہنچے تو بخار آکر فوت ہو گئے۔ وہ بلا سر ہی کی زمین میں آرام فرما ہیں۔ اسی اثناء میں مولانا مقصود علی آپہنچے جو میرٹھ میں گرفتار ہو کر ابھی رہا ہوئے تھے۔ مجاہدین نے اُنہیں اپنا امیر بنا لیا (تقریباً ۱۸۶۱ء) (سرگذشت مجاہدین ص۳۱۸)

[۲] میر مقصود علی صاحب دانا پور (پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور خاندانِ صادق پور سے اُن کی قرابت بھی تھی۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک)۔

Marfat.com

پورے نہ ہوئے تھے کہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں انہیں بھی سفرِ آخرت پیش آگیا۔

اب امارت کی باگ ڈور اُس کے حوالہ کی گئی جس کی پرورش بچپن ہی سے جہادِ حریت کی آب و ہوا میں ہوئی تھی یہ حضرت مولانا ولایت علی صاحب کے فرزندِ اکبر مولانا عبداللہ صاحب[1] صادق پوری تھے۔ جنہوں نے تقریباً چالیس برس برابر اس عَلَم کو بلند کیا جس کے دورِ امارت میں بار بار انگریزی فوجوں کو خاک و خون سے کھیلنا پڑا۔

آپ سے خط و کتابت کے جُرم میں ہزاروں محبانِ وطن گرفتار کر کے عبور دریائے شور اور نظر بند کئے گئے۔ ایک عرصہ تک پورے شمالی ہند میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کا بازار گرم رہا اور یکے بعد دیگرے سازش کے پانچ مقدمات چلائے گئے جن کی تفصیل چند صفحات بعد ملاحظہ سے گذرے گی۔

---

[1] مولانا عبداللہ ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپکی والدہ محترمہ حیدرآباد کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا ولایت علی صاحب کی جہادی اولوالعزمی اس رشتہ کا سبب بنی۔ یعنی مولانا عبداللہ کے والد مجاہد تھے تو نانا مجاہد نواز۔ پھر جہاد و انقلاب کی تیاریوں کے دور ہی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ہمیشہ سفر و حضر میں والد ماجد کے ساتھ رہے۔ ابھی پندرہ سولہ برس کی عمر تھی کہ والد ماجد کے ساتھ پکھلی اور بالاکوٹ کے جہاد و قتال میں عملی شرکت کی۔ مولانا ولایت علی صاحب نے جب دوبارہ ہجرت کی تو مولانا عبداللہ صاحب ساتھ تھے اور فوجی نظم و ضبط آپ کے سپرد تھا۔ مولانا عنایت علی صاحب کے دورِ امارت ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء تا ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں بھی دو تین سال وہاں رہے۔ پھر چچا کی تیز مزاجی کے باعث اُن سے موافقت نہ ہوئی تو چھوٹے چچا مولانا فرحت حسین صاحب کے پاس پٹنہ چلے آئے لیکن اس مردِ مجاہد کو گھر میں قرار نہ آسکا اور چار پانچ سال کے بعد اپنی تمام جائداد فروخت کر کے اپنے نابالغ بھائی مولوی عبدالکریم صاحب اور تمام اہل و عیال کے ساتھ شوال ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔ حج سے فراغت کے بعد اگلے سال ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں سوات پہنچ گئے اور کم و بیش دو سال میر مقصود علی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۷۳)۔

مولانا عبداللہ صاحب کی وفات اور اُن کے جانشین

مولانا عبداللہ صادق پوری زندگی کے آخری لمحات تک اس راہ پر ثابت قدم رہے۔ اُن کی وفات شعبان ۱۳۲۰ھ (نومبر ۱۹۰۲ء) میں ہوئی۔ اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم صاحب کو یہ خدمت سونپی گئی۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ (تقریباً ۱۹۱۵ء) کو آپ کا انتقال ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ برطانوی سامراج کا کوکبِ اقبال عروج کے آخری نقطہ پر پہنچا ہوا تھا اور ہندوستان میں اس نظام کے تار بکھر چکے تھے۔[۱]

مولانا عبدالکریم کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ صاحب کے پوتے نعمت اللہ صاحب امیر بنائے گئے۔ جن کو کسی مسلمان ہی نے شہید کر دیا۔ پھر مولانا عبداللہ صاحب کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی منصب امامت پر فائز ہوئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی سامراج کے کارندوں نے فارورڈ پالیسی[۲] پر عمل شروع کیا۔ جس پر تقریباً پچاس برس تک عمل ہوتا رہا۔ ہندوستان کا

---

[۱] یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے کہ یہ نظام بے شک بکھر گیا۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات مُردہ نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے اسی زمانہ میں ایک دوسرے خفیہ نظام کے تار پھیلا دیئے یہ وہ نظام ہے جس کو انگریزی جاسوسوں نے ریشمی رومال کی تحریک کا نام دیا۔ جس کے قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علمائے حق جلد اوّل اور نقشِ حیات جلد اوّل)۔ اسی زمانہ میں ملک کی سیاسی بیداری نے ایک دوسری انجمن کو روز افزوں ترقی دی۔ یہ وہی انجمن ہے جس کو انڈین نیشنل کانگریس کے باوقار نام سے یاد کیا جاتا ہے جو کچھ عرصہ بعد وطن عزیز کی نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ [۲] اس پالیسی کا منشا یہ تھا کہ آزاد قبائل کے دشوار گذار پہاڑوں کو زیر نگیں کیا جائے۔ ان علاقوں میں فوجی چوکیاں قائم کی جائیں اور سڑکیں نکال کر راستوں کی دشواریوں کو ختم کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ اس پالیسی کی مخالفت کرتی رہی اور مسلم لیگ اس کی موافقت میں زبان اور قلم کی طاقت صرف کرتی رہی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صاحب مرحوم۔

Marfat.com

کروڑوں، اربوں روپیہ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کی بناء پر صرف کیا گیا۔ لاکھوں من گولہ بارود سے ان غریب الوطن مجاہدین اور اُن کے ہم نوا قبائل کی جھونپڑیوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ آج نہ وہ پالیسی رہی اور نہ پالیسی کو طے کرنے والے۔ البتہ شہیدانِ حریت کے وارث، اور اُن کی مقدس تاریخ زندہ ہے، اور زندہ رہے گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خُونریز معرکے اور جنگی اقدامات

ایثار و اخلاص اور قُوّت و دولت کا مقابلہ

شکست و فتح مقدر سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خُوب کیا

اُمراء کے ناموں سے آپ واقف ہوگئے۔ ۱۸۵۸ء (حضرت مولانا عنایت علی صاحب غازی) کے سالِ وفات تک کارناموں کا ذکر بھی آچکا۔ ۱۸۵۸ء کے بعد نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک انگریزی فوجوں سے جو خونریز معرکے پیش آئے، اُن کی داستان بہت طویل ہے اور اب اس کا سُننا بھی بے کار۔ البتہ فداکارانِ حریت کی قربانیوں کا معمولی تخمینہ لگانے کے لئے کچھ تذکرہ ضروری ہے۔ جن قربان ہونے والوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دینے میں دریغ نہیں کیا، کیا ہم اُن کے ذکرِ خیر کے لئے چند منٹ صرف کر دینے بھی پسند نہ کریں گے؟

بے شک تاریخ کے صفحات نے اُن کو نمایاں جگہ نہیں دی۔ کیونکہ تاریخ

Marfat.com

کی یہ کمزوری بہت پرانی ہے کہ وہ صرف فاتحین کے نام ہی روشن کیا کرتی ہے۔ بالخصوص ایسے دور میں کہ قلم دشمنوں کے ہاتھ میں ہو یا اہلِ قلم دشمنوں سے مرعوب ہوں۔ لیکن کیا آزاد ہندوستان کے حقیقت شناس مؤرخ بھی اسی "دشمن نوازی" کی تقلید کریں گے۔

ہم اس تذکرہ کا آغاز مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ایک مختصر تحریر سے کرتے ہیں۔ مولانا محمد جعفر صاحب پارٹی کے سرگرم آرگنائزر تھے۔ اسی جرم میں وہ گرفتار کئے گئے، اور عمر قید کی سزا دے کر انڈمان بھیج دیئے گئے۔ مگر قدرت نے اُن کو عمر اتنی عطا فرمائی تھی کہ سزا دینے والے بھی اُکتا گئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں رہائی نصیب ہوئی تو دبی دبی زبان میں کچھ باتیں بیان کیں۔ اُن کا ایک فقرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ میں سرحد غربی ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جا کر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلتِ بے جا کے سبب سے مُلّاں عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے کئی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلہ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ قافلۂ مجاہدین جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کو ہماری سرکار چڑھی تھی، الگ رہ گیا۔ مگر مدعوئے حفاظتِ خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجاہدوں نے بھی بہ تمنائے حصولِ شہادت، دادِ شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھلائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی۔ خود جنرل

Marfat.com

چیمبرلین صاحب مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و
خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر
سرحد بھیج دی گئی۔[1]

اس متن کی شرح انگریزی رپورٹوں بالخصوص ماہر وہابیت ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ لہٰذا انہیں راویوں کی روایتوں کے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

(۱) یہ باغی کیمپ (۱۸۵۸ء میں) سر سڈنی کوٹن کے حملوں اور خود اپنے طرف داروں کی علیحدگی کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اور اس سبب سے دو سال تک بالکل خاموش رہا۔[2]

ہم نے ستھانہ کے علاقہ کو اس ہمسایہ قبیلہ (اتمان زئی) کے سپرد کر دیا، جس نے عُشر (مجاہدین کا مقرر کردہ مذہبی ٹیکس) دینے کی مخالفت کی تھی، اور مجاہدین کے ایک امیر (سید عمر شاہ) کو قتل کر دیا تھا۔

اس قبیلے (اتمان زئی) اور ایک دوسرے طاقت ور قبیلے (جادون) سے ہم نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقہ میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور وہ اس تیسری قوم کی بھی مخالفت کریں گے جو مجاہدین کو اس علاقے میں لانے کی سفارش اور تائید کرے گی۔ نیز مجاہدین اور دوسرے شریر لوگوں کو اس علاقے سے گذرنے نہ دیں گے تاکہ وہ برطانوی علاقہ میں داخل ہو کر فساد نہ پھیلا سکیں۔

مگر ابھی دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ باغی نو آبادی نے سرحدی

---

[1] تواریخ عجیب عرف کالا پانی۔ مطبوعہ اقبال اکاڈمی لاہور ص ۸۔ [2] یہ وہ زمانہ ہے جس میں مولانا نور اللہ صاحب پارٹی کے لیڈر اور امیر رہے۔

Marfat.com

قبائل میں پھر اقتدار حاصل کرلیا۔

(یہ مولانا نور اللہ صاحب کا تدبر تھا کہ اس تھوڑے عرصہ میں انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دی)۔

۱۸۶۱ء میں (میر مقصود علی صاحب کے زمانۂ امارت میں) ملکا سے (جو پہاڑوں کے بیچ میں اُن کی جائے پناہ تھا) مہابن پر حملہ کر دیا۔ جہاں سے ۱۸۵۶ء میں سر سڈنی کاٹن نے اُن کو بھگایا تھا۔ اور خاص ستھانہ کی پُرانی آبادی کے اُوپر قلعہ بند ہو گئے۔ اس مضبوط قلعے سے نکل کر وہ ہمارے گاؤں پر چھاپے مارتے تھے اور وہی قبیلے جنہوں نے ہم سے عہد کیا تھا (کہ گذرنے نہ دیں گے) اُن کو گذرنے کی اجازت دیتے تھے۔ گویا کُھلے طور پر اس امر کا اعلان ہو گیا تھا کہ پُرانی حالت پھر قائم ہو گئی ہے۔ مجاہدین راولپنڈی کے ضلع میں گھس آئے اور دن دہاڑے شاہراہِ عام پر پولیس چوکی کے قریب دو قتل کر دیئے۔ اس کے تین ہفتہ بعد انہوں نے ہمارے علاقہ پر چھاپہ مارا اور تین دولت مند آدمیوں کو اُٹھا کر لے گئے۔ اور اُن کی رہائی کے لئے ہمارے فوجی افسروں سے فدیہ کا مطالبہ کر دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد اسی قسم کی ایک اور واردات ہوئی۔ حکومت سرحد نے رپورٹ کی کہ ۱۸۵۶ء کے شرم ناک حالات پھر پیدا ہو گئے ہیں .... اب ہمارے پاس بدلے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا .... تاہم ہماری بے وفا ہندوستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی رہی ۱۸۶۲ء میں (یعنی جس سال میر مقصود علی صاحب کی وفات ہوئی اور مولانا عبداللہ صاحب صادق پوری امیر بنائے گئے) اُن کی تعداد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک دوسری جنگ کا مشورہ

Marfat.com

دینے پر مجبور ہوگئی۔

مولانا عبداللہ صاحب صادقپوری کا دورِ امارت اپریل ۱۸۶۳ء کے اوائل میں اُنہوں نے ہمارے علاقہ میں پھر قتل وغارت اور لُوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اسی سال جولائی میں وہ نہایت دلیری کے ساتھ ستھانہ کے علاقے پر پھر قابض ہوگئے۔ اور ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب کو تہدید آمیز خطوط لکھے۔ اُن کی ہمسایہ قوموں نے ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کو اپنے تعصّب پر قربان کر دیا، اور اُن وعدوں کو بالکل فراموش کر دیا جو ہمارے ساتھ کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس باغی آبادی کو سرحد پر ایک دفعہ پھر حاکمانہ اقتدار حاصل ہوگیا۔

دسمبر ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) میں[1] وہ برطانوی علاقے پر چڑھ دوڑے۔ اور ہماری طلایہ گرد فوج پر شب خون مار کر گویا باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر بھی حملہ کر کے "کوہ سیاہ" پر اُن کے دیہات کو جلا دیا، اور سرحدی چوکیوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔

اسی مہینے میں اُنہوں نے تناول کی حلیف تحصیلوں پر بھی چھاپہ مارا، اور ایک مُلکی افسر کو اُس کے چند ساتھیوں کے ساتھ قتل کر دیا..... اب ہم تقریباً انہیں حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۷ء و ۱۸۳۱ء کے درمیان (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے زمانہ میں) پیدا ہوگئے تھے اور جس کے نتیجہ میں اس متعصب لشکر نے پنجاب پر اپنا تصرّف جما لیا تھا۔ یہاں تک کہ سرحدی دار الخلافہ (پشاور)

---

[1] یہی وہ حملہ ہے جس کی طرف منشی محمد جعفر تھانیسری نے مذکورہ بالا بیان میں اشارہ کیا ہے۔

Marfat.com

اُن کے قبضہ میں آگیا تھا ...... اب میں اس متعصّب نوآبادی کے خلاف چار مہموں میں سے ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کے لئے منتخب کروں گا۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح باغی کیمپ امن کے زمانہ میں ہماری سرحد پر ہمارے لئے باعثِ توہین تھا، اُس سے کہیں زیادہ جنگ کے زمانہ میں ہماری فوج کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔"[1]

یہ سب ہنٹر صاحب کی تمہید تھی۔ اب ۱۸۶۳ء کی جنگ امبیلا کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

"۱۸ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سات ہزار برطانوی فوج نے سر نیول چیمبرلین کی سرکردگی میں کُوچ کیا۔ اُن کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا اور چار ہزار خچر اور باربرداری کے دوسرے جانور (جن کو جمع کرنے کے لئے پنجاب کا کونہ کونہ چھان مارا تھا) اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرے دن شام کو فوج کا ایک کالم تمام رات کوچ کرتا ہوا ایک ایسی گھاٹی پر جا پہنچا تھا جو درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی اور زیادہ تکلیف دہ طور پر "درۂ امبیلا" کے نام سے مشہور ہے۔ ہمارے جنگی مرکز کی حفاظت کے لئے کافی فوج موجود رہتی تھی، اور اُس کے پیچھے سرحدی مقامات پر بھی طاقت ور مورچہ بندی کی گئی تھی۔ جس میں پیادہ اور سوار فوج اور کافی توپ خانہ موجود تھا۔ کیونکہ ۲۰ر تاریخ تک جرنیل کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ قبائل جن کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا، اب مذبذب حالت میں ہیں اور اُس کے دو ہی دن بعد اُس نے گورنمنٹ کو تار دے دیا تھا کہ "فوج کو مجبوراً رُکنا پڑا ہے"۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۴ تا ص۴۵۔

Marfat.com

۲۳ اکتوبر کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سوات کا روحانی پیشوا (ملا عبد الغفور[1]) بھی ہمارے دشمنوں کے ساتھ جا ملا۔ اس اثناء میں گورنمنٹ کے نام سرحد سے تار پر تار چلے آرہے تھے کہ جن میں مزید اور مزید بر مزید فوج بھیجنے کی التجا کی جاتی تھی۔

فیروز پور رجمنٹ کے ایک حصّہ کو کوچ کا حکم دیا گیا۔ ایک اور رجمنٹ کو پشاور سے مغرب کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ ۹۳ ہائی لینڈز سیالکوٹ سے اور ۲۳، اور ۲۴ ہندوستانی پیدل فوج لاہور سے یلغار کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ ابھی تین ہفتے بھی نہیں گذرنے پائے تھے کہ پنجاب کے قلعے یہاں تک خالی ہو گئے کہ میاں میر کے کمانڈ افسر کے لئے مشکل ہو گیا کہ گورنر پنجاب کے لئے ۲۴ فوجیوں کی گارد کا انتظام کر سکے۔

اس اثناء میں قبائلی لشکر ہماری فوج کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اب آگے بڑھنا تو بالکل ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست کھا جانے سے بھی بدتر۔ ہماری اس حالت نے قبائلی لشکر کو جس کے افراد بچپن ہی سے پہاڑی جنگوں میں ماہر ہو جاتے ہیں، بہت فائدے میں رکھا۔[2]

ایک ایک دن کی دیر دشمنوں کے تعصبی جوش، انکی طاقت اور امیدوں کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنیل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی فوجیں ڈر کے مارے درے میں دبکی پڑی ہیں، اور وادی

---

[1] ایک درویش صفت آدمی جس نے یوسف زئی قبیلہ پر حیرت انگیز اثر جما رکھا ہے۔ اس قبیلہ کے علاوہ اور پٹھان قبائل بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۴۵ تا ص ۵۰۔

"چومالہ" میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں، جہاں "باجوڑ" قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس طرح ہماری فوج کا ہراول میسرہ اور پشت کی آمد و رفت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔

۸ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے نہایت بے صبری کے ساتھ پوچھا کہ اگر جرنیل صاحب کو ۱۶۰۰ پیادہ فوج کی کمک بہم پہنچائی جائے تو کیا وہ ملکا کی متعصب آبادی کو فنا کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے؟ ۱۲ تاریخ کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اسی وقت ممکن ہے جب دو ہزار پیادہ فوج ہو اور کچھ توپیں ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ حوصلہ شکن پیغام بھی آیا کہ جرنیل صاحب اس وقت تک حملہ کرنے کے خلاف ہیں، جب تک کہ درمیانی قبائل کے ساتھ صلح صفائی نہ ہو جائے۔

سارے سرحدی علاقہ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۴ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کے کیمپ کی حفاظتی فوج کا ایک حصہ عاریتاً مانگنا پڑا اور ۷ فوسیلرز کو بسرعت تمام سرحد کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور ساتھ ہی ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھیج دی گئی تاکہ ہمارے سلسلہ آمد و رفت کی حفاظت ہو سکے، جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔

بار برداری کے سامان کے لئے ۴۲۰۰ اونٹ اور ۲۱۰۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکام ہو چکی تھیں۔

Marfat.com

اصل خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اس سے آگے کھلے میدان پر قبضہ کرلیا جائے۔ امپیریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ر نومبر تک ختم ہو جانا چاہیئے مگر ۱۴ر نومبر تک یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں چند لڑائیاں لڑی جائیں جہاں ترقی یافتہ آلاتِ جنگ استعمال کئے جا سکتے تھے ہمیں ان تمام چوکیوں کی حفاظت کرنی پڑ رہی تھی جو آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کر دی گئی تھیں۔ اسی دن پنجاب گورنمنٹ سے مزید ڈیڑھ ہزار فوج کی درخواست کی گئی۔

۱۸ر نومبر کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے حملہ کیا۔ ہماری ایک چوکی پر قابض ہوگیا، اور افسروں کے علاوہ ایک سو چودہ آدمیوں کو قتل یا زخمی کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کرلیا۔ جسے ایک خون ریز جنگ کے بعد جس میں خود ہمارے جرنیل چیمبرلین شدید زخمی ہوئے دوبارہ حاصل کرلی گئی، اور افسروں کے علاوہ ایک سو پچیس آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے اور ۲۰ر کو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیج دینا ضروری سمجھا گیا، جن کی تعداد چار سو پچیس ہو گئی تھی۔

۱۹ر کو جرنیل صاحب نے ایک طویل تار دیا، جس میں موجودہ فوج کی بےکاری کا شکوہ اور تازہ دم فوج کا مطالبہ تھا۔ دوسرے دن ۲۳ دیسی پیدل فوج معہ چند یورپینوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ اس فوج کے پہنچنے سے خیال ہوا کہ دشمن پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اور اس بات سے اس خیال کی تصدیق بھی ہوئی کہ اگلے روز جمعہ کا

Marfat.com

دن تھا۔ مجاہدین جمعہ کے روز خاص طور پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ مگر آج کوئی حملہ نہیں ہوا۔ لیکن بہت جلد یہ خیال غلط ثابت ہو گیا، کیونکہ جیسے ہی ہماری یہ کمک پہنچی، کوہستانی علاقہ کے تازہ دم قبائل بھی آ موجود ہوئے۔ صرف ایک سردار (نصیحت لال خاں باجور) تین ہزار آدمی اپنے ساتھ لایا۔ اور ایک درویش (حاجی آف گُنھار) نے پانچ سو مجاہدین بھیجے۔ جو یہ عہد کرکے آئے تھے، کہ یا غازی کہلائیں گے یا شہید۔

۵ دسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی۔ جسے آگے بڑھنے کی پُر زور تاکید کی گئی تھی۔ اب ہمارے پاس باقاعدہ نو ہزار فوج تھی۔ جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں۔ مثلاً ۹۳ ہائی لینڈز، اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ بظاہر یہ امر ناقابلِ تسلیم تھا، کہ طاقت ور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ایک ہی درہ میں دبکی بیٹھی رہے۔ دشمن اس کو تنگ کرتے رہیں اور وہ اُن کو سزا دینے کے قابل نہ ہو سکے۔ مگر مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا، ہم نے اُس کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں ایک گواہ کا چشم دید بیان تھا "جوش و خروش دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا"۔[1]

مجاہدین کو شکست کس طرح دی گئی جہاں تک جنگ و جدال کا تعلق تو ان مجاہدین کا مقابلہ کون کر سکتا تھا جو ہزاروں میل طے کرکے خفیہ راستوں کی بے شمار مصیبتیں جھیلتے ہوئے راہِ حق میں مر مٹنے کے لئے یہاں پہنچے تھے مگر افسوس اس بد قسمتی کا کوئی علاج نہ ہو سکا کہ سرحدی قبائل کی دوستی ناپائیدار اور اُن کے

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صـ۵۲ تا صـ۵۷۔

Marfat.com

معاہدے یا در ہوا ہوا کرتے تھے۔ یہی مرض حضرت سید صاحب اور اُن کے جانشینوں کی شکست کا سبب بنا تھا۔ اور اسی مرض نے مولانا عبداللہ صادقپوری اور اُن کے ساتھی مجاہدین کو شکست کا منحوس چہرہ دکھایا۔ جنگی اقدامات اور معرکوں کے قصّہ کے بعد اب شکست کی حسرت ناک داستان سُنئے۔

ہنٹر صاحب فرماتے ہیں :

"کوہستانی قبائل کا اتحاد عام طور پر ناپائیدار ہوتا ہے۔ جو کام ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی، اُسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی نے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ۲۵ نومبر کو پشاور کا کمشنر بونیر کے بعض قبائل کو اتحاد سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک اور گروہ کو بھی جس کی تعداد دو ہزار تھی، اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ اور سوات کے پیشوا کو بھی آمادہ کر لیا تھا کہ اپنے خاص مریدوں کو منتشر کر دے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ ...... دوسرے دن بونیر کے قبائل نے فیصلہ کر لیا اور کمشنروں کے پاس حاضر ہو کر احکامات کے صادر ہونے کی درخواست کرنے لگے۔ یہ علیحدگی مجاہدین کی اُمیدوں کے لئے موت کا حُکم رکھتی تھی۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی قبیلہ علیحدہ ہو جاتا تھا .... یہ اتحاد کوہستانی کُہر کی طرح فوراً دُور ہو گیا اور بونیر کے قبائل نے جن پر مجاہدین کا بہت کچھ انحصار تھا، ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ مجاہدین کو اُن کے رہائشی غاروں ہی میں جلا دیا جائے گا۔

پھر ایک ہفتہ کے اندر اندر انگریزی فوج کا ایک دستہ

Marfat.com

بونیریوں کی کمک اور رہنمائی میں پوری سلامتی کے ساتھ پہاڑوں سے گذرتا ہوا مجاہدین کی آبادی ملکا تک پہنچ گیا اور اس کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ۲۳ دسمبر کو یہ بدقسمت فوج درۂ امبیلا میں واپس آگئی، اور ۲۵ دسمبر کو تمام کی تمام فوج میدان میں پہنچ گئی، اور گھر کو واپس آتے ہوئے اُن پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔

نتیجۂ جنگ بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اُس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں ہمارا نقصان جان ۸۴۷ تک پہنچ گیا تھا۔ یعنی تمام فوج کا دسواں حصہ جو ایک وقت میں مجموعی طور پر نو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نقصان صرف اس درہ میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سردی لگ جانے یا کسی بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی غیر معمولی تعداد تھی۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی تھی۔[1]

قبائل مجاہدین کے ساتھ کیوں ہوئے؟ ہنٹر صاحب اور ان کے ہمنواؤں کا دو لفظی جواب ہے "مذہبی جنون"۔ وہ مجاہدین کو بھی مذہبی مجنوں قرار دیتے ہیں اور اُن قبائل کو بھی جو مجاہدین کے ساتھ ہوئے "مذہبی مجنون" کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اُن کو نظرِ حقارت سے دیکھے۔ دوسری جانب ہندو اکثریت ان سے متنفر اور دہشت زدہ ہو، مسلمان ان کی قربانیوں کو حماقت سمجھیں اور ہندو اس کو فرقہ پرستی کہیں۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۵۸ و ص۵۹۔

Marfat.com

مگر مولوی محمد جعفر صاحب جو صاحبِ واقعہ ہیں اور قبائل کے حالات و رجحانات سے ہنٹر صاحب کی نسبت بہت زیادہ واقف ہیں، اُن کا جواب یہ ہے:

"بے گانے ملک میں سرکار کی مداخلتِ بے جا کے سبب سے ملّاں عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو لے کر آموجود ہوئے۔ مُلکی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے سرکار کے مقابلہ پر ٹُوٹ پڑے ..... بدعوائے حفاظت ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا[1]"

یہی جواب قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ مذہبی جنون چند روز میں ختم نہیں ہوا کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے نشیمن کی حفاظت کا مسئلہ غیور پٹھانوں کو برانگیختہ کر دیتا تھا اور جب کسی طرح اُن کو اُن کی آزادی اور حفاظتِ وطن کا اطمینان دلا دیا جاتا تھا تو وہ اپنے علاقہ میں واپس چلے جاتے تھے۔ کیا یہ مذہبی جنون ہے یا حفاظتِ وطن کا قابلِ قدر جذبہ؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

باقی رہی فرقہ واریت، تو سوال یہ ہے کہ یہ فرقہ واریت مُلک کے کسی اور گوشہ میں کیوں نہیں نمایاں ہوتی تھی۔ یہ تحریک کم و بیش پچاس برس تک زندہ رہی۔ پورے ہندوستان میں اس کے اثرات تھے۔ بالخصوص شمالی ہند میں اس کا باقاعدہ نظام تھا۔ بہار اور بنگال کے چپّہ چپّہ میں اُن کے مرکز قائم تھے اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ برطانوی سامراج کی چالاک سی۔ آئی۔ ڈی جو سمندر کی تہ تک کی خبر لاتی تھی، عرصہ تک اُن کا سراغ نہ لگا سکی۔ لیکن اس کی پوری تاریخ میں کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہُوا، جس کو ہندو مسلم فرقہ واریت کا رنگ دیا جا سکے؟

---

[1] تواریخ عجیب صہ ۸

Marfat.com

ظاہر ہے کہ پارٹی کی ضروریات کے لئے لاکھوں کروڑوں روپیہ درکار تھا۔ یہ روپیہ مذہبی صدقات اور قومی چندوں کے نام پر مسلمان ہی فراہم کرتے رہے، اور بقول ہنٹر صاحب مذہبی ٹیکس کے لئے مسلمانوں پر کبھی کبھی جبر بھی کیا جاتا تھا۔ مگر کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہے کہ کسی ہندو پر جبر کیا گیا ہو۔ انقلابی پارٹیوں کے لئے ڈاکہ ڈالنا معمولی بات ہے۔ اگر اس پارٹی کی طرف سے پورے ملک میں کوئی ایک واقعہ بھی کسی ڈکیتی کا ہوا ہوتا تو ہنٹر صاحب اور اُن کے بلند بانگ ساتھی آسمان سر پہ اُٹھا لیتے۔ مگر اس موقع پر ہنٹر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی بے لبسی اس بات کی کُھلی ہوئی شہادت ہے کہ ان پاک باز مجاہدینِ حریّت کا دامن فرقہ واریت کی آلائش سے پاک تھا۔ وہ اس مقدّس تحریک کی ذمّہ داریوں کو محسوس کرتے تھے اور دیانت، سچائی، اور پاک بازی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے تھے۔ اگر یہ مذہبی جنون ہے، تو بہت مبارک۔

ہنٹر صاحب نے کھود کرید کرکے دو واقعات اغوا کے بیان کئے ہیں مگر ہندوستان کے کسی حصّہ میں نہیں بلکہ فرنٹیئر کے علاقہ میں، جو جنگ کا علاقہ تھا، اور اگرچہ الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جن سے شبہ ہوسکتا ہے کہ اغوا شدہ ہندو ہیں۔ لیکن مشتبہ الفاظ کا استعمال خود اس کی دلیل ہے کہ وہ ہندو نہیں بلکہ انگریز تھے۔ کیا ہنٹر صاحب کو پریس ایکٹ کی کسی دفعہ کا خطرہ تھا، یا فرقہ وارانہ جذبات کے مشتعل ہونے سے ڈرتے تھے کہ ایسے محتاط الفاظ استعمال کئے۔ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مجاہدین کی صحیح تعداد ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

"۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کردینا دُنیا کے ترپین ہزار ۵۳۰۰۰ بہترین جنگ جُو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت

Marfat.com

کے ساتھ جنگ کرنا ہے[1]"

ہنٹر صاحب کا یہ بیان بہت مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سرکار کی مخالف فوج کی یہ تعداد ہوتی اور وہ بھی بقول ہنٹر صاحب "بہترین جنگ جو اور بہادر انسانوں کی" تو نہ چیمبرلین سات ہزار کی مختصر فوج لے کر حملے کی جرأت کر سکتے تھے، اور نہ پنجاب گورنمنٹ یا مرکزی حکومت اُن کو آگے بڑھنے اور دشمن کو جلد شکست دینے کی تاکید بار بار کر سکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدین کی یہ تعداد اور ان کی بہادری کی مدح سرائی صرف اس لئے تھی کہ امبیلا کی گھاٹی پر چیمبرلین کے حملہ کی ناکامی، خود چیمبرلین کے مجروح ہونے اور بقول ہنٹر صاحب اس مہلک گھاٹی کے چپّہ چپّہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں بن جانے سے جو ندامت ہو سکتی تھی، اس کی کوئی باعزّت تاویل کر لی جائے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مجاہدین کی اصل تعداد بارہ سو اور چودہ سو کے درمیان تھی، جیسا کہ یوسف زئی کی جنرل رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے[2]۔

البتہ اگر ہنٹر صاحب کے ارشاد کو صحیح قرار دینا ضروری ہو، تو اس کے یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ مجاہدین پر جب بھی حملہ کیا جائے، تو انگریزی فوج کی تعداد ایسی ہونی چاہیئے کہ پچاس ہزار کا مقابلہ بھی کر سکے۔ تاکہ جو قبیلے ہنگامی طور پر مشتعل ہو کر مجاہدین کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ جن کے جنگ جُو بہادروں کی تعداد تریپن ہزار تک پہنچ جاتی ہے، اُن کا مقابلہ فوجی قوّت سے کیا جا سکے۔ اور ڈپلومیسی سے کام لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ڈپلومیسی کیا تھی ہنٹر صاحب نے ڈپلومیسی کی تشریح نہیں کی۔ اس کی غمّازی منشی محمد جعفر صاحب نے اپنے بیان میں کر دی ہے کہ:

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۴۵۔ [2] ملاحظہ ہو جنرل رپورٹ آن یوسف زئی۔ ص۹۹ و ص۱۰۰ (General report on yusuf zais)

"اگر لاکھوں روپیہ دے کر اُن بگڑے ہوئے افغانوں کو راضی نہ کیا جاتا تو ایک آدمی بھی فوج انگریزی کا واپس نہ آتا۔"

ہندوستان میں گرفتاریاں سرحد پر جنگ کا یہ سلسلہ جاری تھا، کہ ہندوستان میں پولیس اور سرکاری جاسوسوں کی یورشش شروع ہوگئی اور جس پر بھی شُبہ ہوا، مجاہدین سے ساز باز کے جُرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سلسلہ ایک دو ماہ نہیں بلکہ:

"آخر ۱۸۶۳ء سے دس[۱۰] برس تک برابر قیامت برپا رکھی صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں، خوشامدیوں اور ذاتی عداوت رکھنے والوں نے خُوب دل کے چاؤ نکالے۔

دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصہ اور اس بحث کے کوئی دوسری بات کم ہوتی تھی۔ ایک محکمہ مع گواہ شاہدوں کے اس دار و گیر کے واسطے برسوں تیار رہا۔ جس کو چاہا پکڑ لیا اور جو چاہی رشوت لے لی اور جس نے نہ دی، اُس پر معمولی گواہوں سے گواہی دِلا کر دائم الحبس کر دیا۔"[۱]

دوبارہ جنگ ۱۸۶۸ء انگریزی فوجوں نے جو جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا، اور انگریزی ڈپلومیسی نے جس طرح دامنِ اتحاد چاک کیا تھا اُسکی بخیہ گری میں کچھ دن لگے۔ مگر ابھی چار سال پورے نہ ہوئے تھے کہ فروری ۱۸۶۸ء میں مولانا عبداللہ صاحب کی زیر کمان تازہ دم مجاہدین کا ایک دستہ پھر انگریزی فوج کے مقابلہ پر صف آرا تھا۔

انگریزوں کو ۱۸۶۳ء یاد تھا۔ اُنھوں نے پوری مستعدی اور چُستی سے کام لیا

---

[۱] تواریخ عجیب۔

Marfat.com

اور پورے ہندوستان[1] کی منتخب فوجیں مورچہ پر بھیج دیں۔ چھ ماہ تک کشت و خون ہوتا رہا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ہنٹر صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے، اور مجاہدین کی سخت جانی کی داد دیجئے۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں[2]:

"پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہوگئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال کر باہر کریں یا اُن کو اس بات پر آمادہ کرسکیں کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں"۔

ہنٹر صاحب ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

"یہ تین دفعہ انگریزی فوجوں کے ہاتھ سے تباہ و برباد ہوچکے ہیں لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک (۱۸۷۱ء زمانہ تصنیف کتاب تک) زندہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نوآبادی کو ہم فوجی قوّت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری مسلمان رعایا کے متعصّب عوام لاتعداد آدمیوں اور روپوں سے اُن کو مدد دے کر گویا ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، مگر جن کی بُجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے بھڑکنے لگتے ہیں[3]"

اس کے بعد یہ چنگاریاں سرحد پر اگرچہ تقریباً پچاس برس، بلکہ اگست ۱۹۴۷ء تک دھواں دیتی رہیں مگر ہندوستان میں تحریک کا نظام منتشر اور معطل ہوگیا تھا، اس کی کُل ہند حیثیت ختم ہوچکی تھی۔ لہٰذا اس کا بیان کرنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۲ - [2] ایضاً صفحہ ۶۶ - [3] ایضاً صفحہ ۶۶

Marfat.com

ہندوستان کے اندر نظامِ عمل

مرکز کے ذمّہ دار ۱۸۵۰ء میں مولانا ولایت علی صاحب کا قافلہ دوبارہ عازمِ ہجرت ہوا، تو صادق پور کا مرکز آپ کے برادرِ خورد مولانا سید فرحت حسین صاحب[1]

---

[1] مولانا فرحت حسین (برادرِ خورد مولانا ولایت علی صاحب متوفی ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ و مولانا عنایت علی غازی خلف مولانا فتح علی صاحب) پیدائش ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء۔ یہ وہی نوجوان ہیں جو اپنے والد ماجد کے ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں رائے بریلی میں حاضر ہوئے تھے کہ سید صاحب کے زیرِ سایہ ہجرت کریں اور حضرت سید صاحب نے اُن کے والد کو ضعفِ پیری اور اس بارہ (۱۲) سالہ نونہال کو صغر سنی کے باعث پٹنہ واپس کر دیا تھا۔ پٹنہ واپسی ضرور ہوگئی مگر سید صاحب اور آپ کے مسلک کی محبت کا تیرِ نیم کش کچھ اس طرح پیوست ہوا تھا کہ زندگی کے آخری لمحہ تک اس کی خلش کم نہ ہونے پائی۔ تکمیلِ علم کے بعد مراحلِ سلوک طے کئے اور تبحرِ علمی کے ساتھ رُوحانی کمالات میں مقامِ اعلیٰ حاصل کیا، اور جس طرح رُوحانی اور علمی کمالات کے مجمع البحرین تھے، فنونِ سپہ گری میں بھی آپ اعلیٰ مہارت کے مالک تھے۔ بہترین شہسوار، اعلیٰ درجہ کے قدر انداز، اُڑتی چڑیا پر بھی آپ کا نشانہ خالی نہ جاتا۔ بنوٹ وغیرہ میں ایسے چابکدست کہ آپ اپنے پائیں باغ میں کرسی پر بیٹھ جاتے، ہاتھ میں گدکا لے لیتے۔ کھلاڑی لڑکے سب طرف سے حملہ کرتے اور آپ ہر ایک کی کاٹ کر کے اس پر حملہ کر دیتے۔ کوئیں کے منہ پر ایک فٹ چوڑا تختہ رکھوا کر اُس پر کھڑے ہو جاتے۔ سب طرف سے آپ پر ڈھیلے برسائے جاتے مگر آپ سب کا وار خالی دیتے۔ ایک ڈھیلہ بھی بدن پر لگنے نہ دیتے۔ علم، تقویٰ اور شجاعت و سپہ گری کے ساتھ آپ بہترین منتظم، دُور اندیش مدبّر، فقیر منش، مہمان نواز، غربا پرور، علم دوست تھے۔ تقریباً تین سو طلبا آپ کے یہاں کھانا کھاتے۔ جاگیر کی تمام آمدنی طلبہ پروری اور مہمان داری میں صرف ہو جاتی۔ مسترشدین و معتقدین کا بھی اجتماع ہوتا۔ اور مولانا ولایت علی صاحب کے نظام اوقات کے مطابق ظہر بعد درسِ قرآن، صبح شام ذکر و مراقبے وغیرہ کے مشاغل جاری رہتے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی ایسی ہی متقی اور صاحبِ نسبت خدا رسیدہ تھیں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کے سپرد ہوا۔ یہ سپردگی کامیاب رہی۔ تقریباً آٹھ سال تک آپ کی زیر نگرانی مرکز اسی شان سے سرگرم عمل رہا۔ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) اس تحریک بالخصوص اس خاندان کے لئے عام الحزن تھا۔ کیونکہ اسی سال مولانا عنایت علی غازی رحمہ اللہ نے مہابن کی دشوار گذار پہاڑیوں میں اپنے شکستہ ساتھیوں کے ساتھ فاقہ اور تہی دستی کی مصیبت برداشت کرتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور یہی سال تھا کہ دریائے گنگا کے کنارے صادق پور کے مرکز میں چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین صاحب کو پیغامِ اجل[۱] پہنچا اور آپ رہ گرائے مُلک عدم ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہ و اِنَّا الیہ راجعون۔

مگر جس طرح ستھانہ کیمپ کا گرا ہوا عَلَم فوراً ہی مولانا نور اللہ صاحب نے بلند کر دیا، پٹنہ میں مولانا یحییٰ علی صاحب نے پوری مستعدی اور بلند آہنگی سے مرکز کا نظم و نسق سنبھالا اور اس بجھنے والی چنگاری کو آتش فشاں بنا دیا، جو ایک عرصہ تک برطانوی لشکروں پر آتش باری کرتا رہا۔

۱۸۶۴ء میں مولانا یحییٰ علی صاحب[۲] ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ذکر و مراقبہ سے نہ صرف واقف بلکہ ماہر۔ انہوں نے سات سال کی عمر میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور پھر ایسی بلند پایہ پاک باطن ہوئیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے استفاضہ کیا کرتے تھے طلبہ پر اتنی شفیق کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو بھول جاتے تھے رحمہا اللہ و رضی عنہا۔ (الدر المنثور ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۵)

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ عمر ۴۸ سال ہوئی۔ ۲؎ مولانا یحییٰ علی صاحب خلف مولانا الٰہی بخش صاحب پیدائش تقریباً ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۲ء۔ آبائی وطن مہدانواں تھا۔ والد صاحب نے (مولانا الٰہی بخش صاحب) صادقپور میں سکونت اختیار کر لی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انہیں کے ہو رہے۔ عالم باعمل، عابد و زاہد، بہترین واعظ و مقرر۔ اعلیٰ درجہ کے منتظم۔ آپ کی حیرت انگیز تنظیم نے انگریزوں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ پیدائش کی صحیح تاریخ اور سنہ مولانا عبدالرحیم صاحب کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔ آپکا یہی ارشاد ہے کہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کر کے انڈمان بھیج دیئے گئے تو اُن کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب[1] نے کام سنبھالا۔ مگر ابھی صرف ایک سال ہی کام کرنے پائے تھے کہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں اُن پر بھی مستقل مقدمہ چلایا گیا اور وہ بھی انڈمان بھیج دیئے گئے۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) کو وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد مولانا مبارک علی صاحب تنظیم کے ذمّہ دار ہوئے۔ یہ صادق پور کے نہیں تھے بلکہ اطراف حاجی پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علی صاحب یا مولانا فرحت حسین صاحب سے بیعت تھے۔ جماعت کی تنظیم کے سلسلہ میں یہیں رہ پڑے تھے۔

مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد جماعت کا نظام سنبھالنا بڑی آزمائش کا کام تھا۔ پٹنہ کی زمین خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ مُلک کے طول و عرض میں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) آپ کی عمر تقریباً ۴۶-۴۷ برس کی ہوئی (در منثور ص۷۹) ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو آپ انڈمان پہنچے۔ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ وہاں بھی شروع کر دیا۔ گھر گھر پہنچ کر حُسنِ اخلاق و صوم و صلوٰۃ کی تلقین کرتے تھے۔ اسی طرح یادِ خدا، تعلیم و تلقین اور خدمتِ خلق اللہ میں دو سال گذارے۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے داخلِ خلد بریں ہوئے۔ تقریباً چودہ روز بعارضہ بخار و درد و ورمِ رُکبتین[ع] علیل رہے۔ رحمہ اللہ و رضی عنہ۔ (در منثور ص۷۷)۔ مصائب و آلام کا مختصر تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا یحییٰ علی صاحب کے برادر بزرگ۔ پیدائش ۱۲۲۳ھ۔ مولانا ولایت علی صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مولانا منوّر علی صاحب ساکن شاہ آباد سے تکمیل کی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اپنی ریاست کے نظم و نسق، سرکاری سطح پر اہلِ شہر کی خدمت اور رفاہِ عام کے مشاغل کے ساتھ درس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۸۶۵ء (۱۲۸۱ھ) میں گرفتار کئے گئے۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ کو آپ نے تنگنائے دنیا کی قید سے رہائی پائی۔ جزیرہ انڈمن ڈنڈا سینٹ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلہ پر آرام گاہ بنایا (در منثور ص۷۵)۔

ع رُکبتان : دونوں گھٹنے

Marfat.com

دار و گیر کا سلسلہ جاری تھا۔ قسمتِ برگشتہ کی طرح سرکار کی چشمِ التفات کیا پھری کہ عظیم آباد (پٹنہ) کے رئیسوں اور جاہ پسندوں کے تیور بھی بدل گئے۔ ایک عجیب قیامت کا سماں تھا۔ مولانا مبارک علی صاحب نے جان جوکھم میں ڈال کر تنظیمِ جماعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصہ تک اپنا فرض حُسن و خُوبی سے انجام دیتے رہے۔ مقدماتِ سازش کی پیروی میں بھی مولوی محمد حسن صاحب ذبیح (فرزند مولانا ولایت علی صاحب) کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

جب آپ ضعیف ہوئے تو اپنی نیابت کے لئے مولوی محمد حسن صاحب ذبیح کو منتخب کیا اور اُن کی تربیت میں پوری کوشش کی مگر یہ تنظیم کا کام اُن دنوں اتنا آسان نہیں تھا کہ مولوی مبارک علی صاحب سرکار کی نظرِ عنایت سے محروم رہ جاتے کسی حیلہ سے اُنہیں بھی حبس و زنداں سے نوازا گیا، اور تقریباً ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں وہ بھی گرفتار کر لئے گئے۔

عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ لیکن اُنہیں قید میں اتنی تکلیفیں دی گئیں کہ انڈمان جانے سے پہلے ہی وہ جاں بحق ہو گئے۔

مولوی مبارک علی صاحب پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ اُنہوں نے جہاد پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔

مولوی محمد حسن صاحب[1] پر یہ سلسلہ جانشینی ختم ہو گیا اور انقلابی نظام درہم برہم ہو گیا۔

---

[1] مولوی محمد حسن صاحب، مولانا ولایت علی صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند۔ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا ولایت علی صاحب نے دوبارہ ہجرت کی تو آپ کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔ مولانا ولایت علی صاحب لال قلعہ میں بادشاہ کے مہمان ہوئے تو بہادر شاہ ظفر نے آپ کو اپنی گود میں بٹھایا۔ دریافت کیا۔ بیٹا کیا پڑھتے ہو؟ اس نونہال نے جواب دیا۔ قرآن شریف بامعنیٰ۔ بادشاہ کو اس جواب سے تعجب ہوا۔ بہر حال اعلیٰ درجہ کے ذہین و ذکی تھے۔ اس خاندان کے آخری فرد مولانا عبدالرحیم (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

نظامِ عمل پہلے گذر چکا ہے کہ :

(۱) یہ نظام دیہات و قصبات سے شروع ہوتا تھا۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے امام اور واعظ مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ باقاعدہ عالم ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہوتا تھا کہ جماعت کے نصب العین سے پوری طرح واقف اور اُس کے مقاصد کے جاں باز وفادار ہوں۔

(۲) کوشش کی جاتی تھی کہ جہاں ممکن ہو، ہم خیال لوگوں کی مُستقل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صاحب جب گرفتار ہوئے تو آپ نے مولوی محمد حسن صاحب سے فرمایا لو اب مَیں جاتا ہوں، لو اب گھر بار کی خبر گیری تم کرو۔ مولانا عبد الرحیم صاحب کا بیان ہے یہ سُن کر مولوی محمد حسن کا رنگ ہی دوسرا ہو گیا۔ اس وقت عمر کے صرف سترہ دَور پورے کئے تھے۔ مگر اس نوعمری میں وہ کارروائیاں کر دکھائیں جو پچاس سال کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار شخص سے ظہور میں آنی مشکل ہیں۔ خاندان کے بزرگوں کے مقدمات انبالہ، کلکتہ اور پٹنہ میں، تین جگہ چلے۔ اس سترہ سالہ نوجوان نے ان مقدمات کی پیروی میں چھ سال اس طرح گذارے کہ آج انبالہ میں ہیں تو کل پٹنہ میں، اور پرسوں کلکتہ میں۔ پیروی میں ہزاروں روپیہ کا خرچ تھا، اس کا انتظام اور پھر ولایت سے بیرسٹروں اور کونسلروں کو بُلوانے کا انتظام معمولی کام نہ تھا، اور پھر مقدمہ بھی ایسا نازک اور خطرناک، جس کی مدعی خود سرکار۔ اس کے باوجود سارے خاندان کی خبر گیری، ان کی ضروریات کی فراہمی بہر حال حیرت انگیز جدّ و جہد اور جانفشانی سے کام لیا، مگر ساتھ ساتھ اپنی پالیسی بھی بدل دی۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز، پر عمل کیا۔ کہاں صادق پور کے محلات جہادِ حریت کے رضا کاروں اور مجاہدین کے لئے وقف تھے اور کہاں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی بنیاد پڑنے لگی۔ سرکار نے بھی حُسنِ خدمات کی قدر کی۔ آپ کو جلد ہی شمس العلماء کا خطاب مل گیا۔ مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی۔ دو ہفتہ تپ محرقہ اور لرزہ میں رہ کر جوان عمری ہی میں ۷ ربیع الاوّل ۱۳۰۷ھ، ۲ نومبر ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ تقریباً چالیس سال عمر ہوئی۔ (در منثور ص ۱۵۲ تا ص ۱۵۸)۔

Marfat.com

آبادی قائم کردی جائے۔[1]

(۳) دیہات وقصبات کے مقامی مبلغوں اور کارکنوں کا نگران ایک بڑا امام ہوتا تھا جس کا مرکز علاقہ کا کوئی صدر مقام ہوتا تھا۔[2]

(۴) تبلیغی رسالے اور جہادی نظمیں بڑی تعداد میں چھاپ کر بانٹی جاتی تھیں۔

(۵) صادق پور کے بڑے مکان میں جو قافلہ کے نام سے مشہور تھا، بنگال وغیرہ سے آنے والے رضاکار کچھ دنوں قیام کرتے اور وہاں ناظمِ جماعت کے مواعظ سے مستفید ہوتے۔

جماعت کے ناظم ہر دور میں ایسے ہوتے رہے کہ علومِ مشرقیہ کی اعلیٰ قابلیت اور مہارت کے ساتھ اعلیٰ کردار، زہد وتقویٰ اور دیانت و صداقت میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مسلمان ان کی علمی قابلیت اور با اثر شخصیت کے علاوہ اُن کے رُوحانی کمالات کے بھی معتقد اور گرویدہ ہوا کرتے تھے۔

مولانا ولایت علی صاحب، اُن کے بعد مولانا فرحت حسین صاحب پھر مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب دینی اور دُنیاوی، علمی اور رُوحانی غرض ہر ایک لحاظ سے اعلیٰ حیثیت کے مالک رہے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے: وہابیوں نے باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ایک چوتھی راہ نکالی تھی۔ ابتدا رہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مریدوں کی تعداد اس بات کی اجازت دے، مبلغین کو چاہیئے کہ وہاں اپنی ایک مستقل بستی قائم کرلیں۔ اس طرح بنگال کے دیہات میں متعدد غدار بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۱۶)۔ [2] بغاوت کے یہ ضلع وار مرکز پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت سے باقاعدہ خط وکتابت رکھتے تھے۔ پھر مرکز روپیہ جمع کرنے اور آدمی بھرتی کرنے کا ایک انتظام کرتا۔ جو بذاتِ خود بالکل مکمل ہوتا تھا۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۱۶)

Marfat.com

مؤخر الذکر حضرات نے تو یہ کمال کیا کہ انگریزی حکّام اور اعلیٰ افسروں سے بھی بہت گہرے تعلّقات قائم کر لئے۔

چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر شکوہ سنج ہیں:

"یحییٰ علی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پٹنہ میں انگریزی حاکموں کے ساتھ اُس کے تعلّقات بہت اچھے تھے۔ اس کے خاندان میں سے ایک ہماری حکومت میں اعزازی عہدے پر مامور، اور دوسرا ہماری سرحد پر مجاہدین کی جماعت کی رہنمائی کر رہا تھا، جو ہماری فوجوں پر چھاپے مار رہی تھی"۔[1]

مولانا احمد اللہ صاحب کے تذکرہ میں ہے:

آپ کی عقل و دانش کا اس قدر شہرہ تھا کہ گورنمنٹ انگریزی بھی آپ سے اکثر رفاہ عام کے کاموں میں مشورہ لیا کرتی تھی۔ آپ برابر کمیٹی کے ممبر رہا کرتے تھے۔ آپ حکام رس تھے اور جلسۂ وائسرائے بہادر میں درجہ اوّل میں شمار ہوتے تھے۔ اکثر وہ مقدمات جو رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان اراضی کے متعلق ہوتے مثلاً کوئی زمین حکومت کو خریدنی ہوتی اس کی قیمت کا فیصلہ آپ کے ہی سپرد ہوتا تھا اور آپ اس خوبی سے فیصلہ فرماتے کہ حاکم اور محکوم دونوں راضی ہو جاتے۔ جب انکم ٹیکس کا نیا نیا بندوبست حکومت کی طرف سے شروع ہوا، اس وقت چار اسیسر، دو ہندو دو مسلمان نہایت دیانت دار منتخب کر کے سرکار کی طرف سے اس میں مقرر کئے گئے۔ آپ کا ان میں نمبر اوّل تھا۔ کسی مقدمہ میں اگر جج سے اختلاف رائے ہوتا تو مقدمہ صدر سے آپ ہی کی رائے پر فیصل ہوتا۔ کیونکہ آپ کی تحریر ایسی مدلل اور زوردار

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۴۸

Marfat.com

ہوتی کہ حکّامِ بالا کو تسلیم کے بغیر چارہ نہیں ہوتا تھا۔ حکومت میں آپ کا اثر ورسوخ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں مسٹر ٹیلر کمشنر پٹنہ نے آپ کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا تھا۔ تین مہینے آپ نظر بند رہے مگر جب حکومت بالا دست کی توجّہ اس طرف منعطف کرائی گئی، تو نہ صرف یہ کہ آپ کی رہائی کے فوری احکام صادر ہوئے، بلکہ مسٹر ٹیلر کمشنر پٹنہ کو برخاست بھی کر دیا گیا۔[1]

بنگال سے سرحد تک مسٹر ہنٹر کی کتاب کا مندرجہ ذیل اقتباس ایک تاریخی سند ہے۔ اس سے آپ راستہ کے نشانات بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

"سازشیوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کے دارالاشاعت سے جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے، مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے، رنگروٹوں کا پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی وہابی سے راستہ میں ہزاروں تکلیف دہ سوالات پوچھنے کا احتمال تھا۔ شمال مغربی صوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ اس کی اجنبیت ہر گاؤں میں اپنے قد اور اپنی زبان کی وجہ سے ظاہر ہو جاتی۔ لیکن اس خطرناک کام میں انتہائی ہوش مندی سے کام لیا گیا۔ تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ اور اُن کا انتظام معتبر مریدوں کے حوالے کیا گیا۔ جرنیلی[2] سڑک کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سرحدی کیمپ کو جانے والا ہر باغی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ہر پڑاؤ پر اُس کو اپنے دوست

---

[1] الدرالمنثور صفحہ ۱۲۵ و صفحہ ۱۲۷ ۔ [2] یعنی شاہراہِ اعظم، جو شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی کلکتہ سے پشاور تک ہے۔

مل جائیں گے جو اس کے لئے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راستے میں پڑتے، اُن کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے، مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ہمہ تن مصروف۔ ایک مقامی سازشی اُن کا صدر ہوتا تھا۔ ایسے اشخاص کے انتخاب میں بہترین مردم شناسی کا ثبوت دیا گیا تھا۔ کیونکہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا کسی بڑے سے بڑے لالچ سے اپنے تباہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔[1]

مالی تنظیم | مقامی مبلّغ اور امام اُن تمام مسلمانوں سے جو جماعت سے تعلق رکھتے تھے، چار قسم کے چندے (ٹیکس) وصول کرتے تھے۔

۱: عشر۔ یعنی مسلمان کاشتکاروں سے پیداوار کا دسواں حصّہ۔

۲: زکوٰۃ۔ صاحبِ نصاب سے اُس کے سرمایہ کا چالیسواں حصّہ سالانہ۔

۳: صدقہ فطر: عید کے موقع پر ایک خاص صدقہ جس کی مقدار فی کس تقریباً پونے دو سیر گیہوں ہوتی ہے۔

۴: متفرق امدادیں۔ چٹکی۔ یعنی صبح شام ہر ایک کھانے کے وقت ایک چٹکی آٹا۔

ڈاکٹر ہنٹر کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے۔ یہ بیان اگرچہ ایک خاص شخص کی کارگذاری سے متعلّق ہے، مگر اس سے پورے مالی نظم کا نمونہ سامنے آجائے گا۔ ہنٹر کا بیان ہے:

اُس نے (مولانا عبدالرحمٰن اور اُن کے بعد اُن کے فرزند مولانا امیر الدّین صاحب (مالدہ) نے) دیہاتوں کو مالی علاقوں میں تقسیم کر دیا تھا، اور ہر علاقے میں ایک محصل ٹیکس مقرّر کیا۔ پھر یہ افسر اپنے اعتماد پر ہر گاؤں میں

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۵ و ص ۱۳۶۔

Marfat.com

ایک محصل ٹیکس مقرر کرتا اور اُن کے جمع کئے ہوئے روپیہ کا حساب بھی لیتا۔ پھر اس روپیہ کو ضلع کے مرکز میں بھیجا جاتا۔ اصولاً ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس ضرور ہوتا۔ جہاں آبادی بہت زیادہ ہوتی وہاں زیادہ آدمیوں کو ملازم رکھ لیا جاتا۔ ایسے مقامات پر ایک امام ہوتا تھا، جو نماز باجماعت پڑھاتا اور چندہ وصول کرتا۔ امام کے علاوہ ایک جنرل منیجر (ناظم مالیات) ہوتا۔ جس کے ذمے جماعت کی مالی ضروریات کی خبر گیری ہوتی تھی۔ اور ایک اور افسر ہوتا جو مالی رقوم اور خفیہ وخطرناک خطوط کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے "قاصد" مہیا کرتا تھا۔[1]

زکوٰۃ، صدقہ فطر اور عشر کے علاوہ ایک اور ٹیکس بھی مقرر کیا گیا تھا جس سے کوئی غریب مسلمان بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ اس نئے ٹیکس کی تشریح ملاحظہ ہو:

اُنھوں نے حکم دیا کہ ہر خاندان کا مالک کھانا کھاتے وقت اُس کے خاندان میں[2] جتنے فرد ہوں، اتنے ہی مٹھی بھر چاول علیحدہ کرتا رہے اور ہر جمعہ کے روز گاؤں کے محصل ٹیکس کے حوالہ کر دے۔ اس طرح غلّے کے انبار کے انبار جمع کر لئے جاتے اور اُن مصارفِ جہاد کے لئے بھیج دیا جاتا۔ ان معیّنہ چندوں کے علاوہ غیر معمولی چندہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔ اور اس چندہ کے حاصل کرنے میں جادو بیان مبلّغین کی پُر اثر تقریریں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی تھیں۔ تمام ٹیکس جمع کرنے والوں کا

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صنا۔ [2] مذہبی اور تعلیمی اداروں کے لئے یہ طریقہ کبھی اب بھی رائج کر دیا جاتا ہے۔ اس کو چٹکی فنڈ کہا جاتا ہے۔ مگر اس میں ہر فرد کے حساب سے نہیں بلکہ ہر چولہے کے لحاظ سے ایک چٹکی فی وقت دی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اُس وقت بھی ہر چولہے پر ایک چٹکی رکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ ہر فرد کے حساب سے ایک مٹھی آٹا یا چاول کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ غریب آدمی اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

سردار ایک سالانہ دورہ بھی کرتا تھا۔ وہ عید کے موقع پہ اپنے علاقے کے ہر گاؤں میں جاتا اور اس بات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتا کہ ہر خاندان نے پچھلے سال کا بقایا ادا کر دیا ہے۔ بنگال کے ہر ضلع میں اس قسم کے اعلیٰ مرکز موجود تھے[1]

یہ بنگال کی صورتِ حال ہے۔ بہار کے متعلق مسٹر ہنٹر کی رپورٹ ہے :۔

دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے ہفتہ وار امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے[2]

ا : یوپی کے متعلق ہنٹر صاحب کی کوئی تحریر نظر سے نہیں گذری۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں فیض آباد جیل کے ایک ساتھی نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ اُن کے یہاں (ضلع غازی پور صوبہ یوپی) میں بیسویں صدی کے شروع تک "قافلہ کے مجاہدین" کے لئے عشر وغیرہ جمع کرنے کا انتظام قائم تھا۔ یہ ساتھی محمد یحییٰ نام[3] ایک خوش حال گھرانے کے فرد، سرگرم انقلابی تھے۔ بم کے ایک کیس میں ماخوذ ہوئے اور سات سال کی سزا بھگت رہے تھے۔

محمد یحییٰ صاحب غازی پوری کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے، کہ امیر المجاہدین مولانا عبداللہ صاحب صادق پوری کی وفات (۱۹۰۲ء) تک یہ نظم قائم رہا۔

ك ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۱۹ تا ص۱۲۲۔ ۲ه ایضاً ص۱۴۴۔ ۳ه ۱۹۳۰ء میں احقر جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کمیٹی صوبہ یوپی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تحریک ستیہ گرہ میں گرفتار ہوا، اور مراد آباد سے فیض آباد جیل میں منتقل کیا گیا تو وہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یحییٰ صاحب اگرچہ سیاسی قیدی تھے اور ایک معزز اور متموّل خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے آپ کو کلاس بھی "بی" ملی ہوئی تھی، مگر آپ کو اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا، اور کڑی نگرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے پاس قرآن شریف بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

Marfat.com

۲ : عشر وغیرہ کا یہ مالی نظام صرف بنگال ہی میں نہیں تھا بلکہ یو۔ پی تک پھیلا ہوا تھا۔

یہ نظام ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا کہ ریشمی رومال کی مشہور انقلابی تحریک کے سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبۂ حریت سے اپیل کی جانے لگی اور اسی قسم کا خفیہ نظام قائم کر دیا گیا جو ۱۹۲۰ء کے قریب تک رہا۔ پھر ۱۹۳۰ء کے قریب "فقیر ایپی" کی مشہور تحریک علاقہ سرحد میں جاری ہوئی۔ اس تحریک کے لئے بھی پوری راز داری کے ساتھ رقمیں وصول کی جاتی رہیں۔

غرض برطانوی سامراج کے پورے دور میں عام مسلمان انقلاب پسند اور انقلابی پارٹیوں کے مدد و معاون بنے رہے۔ اگر کسی وقت جانی قربانی نہیں پیش کر سکے، تو مالی قربانی سے تو کبھی دریغ کیا ہی نہیں گیا۔

مالی امداد مجاہدین تک پہلے ہنٹر صاحب کی شکایت سُن لیجئے۔[1]

"بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں اور روپیہ پہنچانے کے طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک انتہائی خطرناک کام ہے، کمال ہوشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا گیا ہے"۔

ایک ہندوستانی مصنف[2] کے الفاظ میں اس کی تشریح ملاحظہ فرمایئے۔

مُلک کے مختلف حصوں میں دیانت دار اور خوش حال تاجروں کے پاس اس نواح کی رقم جمع ہوتی۔ وہاں سے ہنڈیوں اور دوسرے ذرائع سے پٹنہ، دہلی، تھانیسر، راولپنڈی وغیرہ تک یہ رقومات پہنچائی جاتیں۔ جہاں سے خاص ذریعوں سے منزلِ مقصود تک پہنچتیں۔ اس قسم کے تاجر پبنہ (بنگال)، ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ میں خاص طور پر کام کرتے تھے۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۸۔ [2] مولانا مسعود عالم صاحب رحمہ اللہ مصنف اسلامی تحریک ص ۹۳۔

Marfat.com

امیر داد خاں حشمت داد خاں (رؤسائے پٹنہ) کا چمڑے کا بہت بڑا کاروبار کلکتہ اور پٹنہ میں تھا جن پر اسی پاداش میں ۱۸۷۱ء میں مستقل مقدمہ چلایا گیا۔ اور لاکھوں روپیہ کا فرم تباہ کر دیا گیا۔

راونشا[1] نے خاص ذرائع کی تفصیل یہ کی ہے:

۱: مولا بخش[2] ساکن پٹنہ۔ محمد شفیع میاں میر کیمپ لاہور میں۔

۲: عبدالکریم۔ محمد شفیع کا ایجنٹ راولپنڈی میں۔

نبی بخش۔ محمد شفیع کا دوسرا ایجنٹ راولپنڈی میں۔

۳: احمد علی (ساکن جگری۔ بہار) پشاور میں[3]۔

اچھا ہے اس موقع پر ان کا کچھ تعارف ہو جائے۔ اس بات میں یہ سب مشترک ہیں کہ یہ سرکاری آدمی تھے۔ سرکار کے خیر خواہ شمار کئے جاتے تھے۔ اس مشترک وصف کے علاوہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات ہنٹر صاحب کے عتاب آمیز الفاظ میں یہ ہیں۔

مولا بخش (الٰہی بخش)۔ یہ وہی شخص ہے جس کے ذریعہ پٹنہ کے مولوی جمع شدہ سرمایہ کو تھانیسر میں جعفر کے پاس پہنچاتے، تاکہ وہ ملکا اور ستھانہ کو بھیج دیا جائے[4]۔

محمد شفیع کے دادا پردادا معمولی چرواہے تھے۔ وارن ہسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں جب ہندوستان کی باقی ماندہ طاقتوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا تو محمد شفیع کا دادا گوشت کا ٹھیکہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کمسریٹ کے افسر انچارج کی پوری تسلی

---

[1] راونشا (T.R. Revensha) کلکٹر پٹنہ ۱۸۶۵ء۔ [2] ہنٹر نے مولا بخش کے بجائے الٰہی بخش لکھا ہے۔ بظاہر ایک ہی شخص کے دونوں نام ہیں۔ ایک اصلی نام ہے دوسرا جعلی نام۔ [3] پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۹۴ حاشیہ۔ [4] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۱۔

Marfat.com

کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکے پورے کرتا رہا۔ محمد شفیع کے والد نے اس سلسلہ کو مزید وسعت دی۔ والد کے بعد محمد شفیع حسن وخوبی اور پوری ذمّہ داری سے اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں تھیں اور جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اُس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اُس کے خاندانی یا تجارتی تعلّقات تھے۔ وہ ہر سال انگریزی حکومت سے لاکھوں پونڈ وصول کرتا۔ وہ اپنے کام میں وقت کا بڑا پابند تھا۔ وہ افسروں کا حکم خادموں کی طرح بجا لاتا تھا۔ اُس نے مجسٹریٹ کے افسر کو فریب دے کر اپنے ٹھیکہ کی اس حالت میں بھی تجدید کرالی، جب وہ مقدمۂ سازشں میں ماخوذ تھا۔[1]

عبدالکریم۔ محمد شفیع کا خفیہ ایجنٹ تھا اور باغیانہ مقاصد کے لئے پٹنہ کے منی آرڈروں کا روپیہ دلواتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے یحییٰ علی (امیر المجاہدین مولانا یحییٰ علی صاحب سے) خط وکتابت بھی کرتا تھا۔[2]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۳۷ تا ص۱۳۹۔ [2] ایضاً ص۱۴۱۔

تحریک کے نمایاں پہلو

قابلیّت، رازداری اور وفاداری

ثبوت کے لئے مسٹر ہنٹر سے بہتر کس کی شہادت ہو سکتی ہے

الفضل ما شهدت به الاعداء

مسٹر ہنٹر کا اعتراف ہے:

اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو جو دورانِ مقدمہ میں ظاہر ہوئے، یہ ہیں:

(۱) وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دُور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔[۱]

(۲) وہ رازداری جس کے ساتھ اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔

(۳) وفاداری کا وہ رویّہ جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ برتا۔

رازداری کے سلسلہ میں مسٹر ہنٹر فرماتے ہیں:

"اُن کی کامیابی کا راز اُن کے فرضی ناموں کی عمدہ ترتیب اور اُن کی خفیہ زبان پر تھا"

ایثار و اخلاص ایثار و اخلاص کے متعلّق مسٹر ہنٹر فرماتے ہیں:

لیکن میں اس یقین کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام سازشی سوائے محمد شفیع فوجی ٹھیکیدار کے اپنا کام انتہائی خلوص اور فطری

---

[۱] اور ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز دَور میں بھی باقی رکھا گیا۔ اتنا اور اضافہ کر لینا چاہیئے۔ محمدّ میاں۔

Marfat.com

جوش کے ساتھ خدا کا کام سمجھ کر کرتے تھے۔ اُن کا عہد تھا کہ مرتے دم تک اس فرض کو انجام دیں گے۔[1]

حیرت انگیز مضبوطی

تحریک کے یہی نمایاں پہلو اور کارکنانِ تحریک کے یہی ممتاز اور گراں قدر اوصاف تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کے طوفانوں میں بھی اس تحریک کو صحیح سالم زندہ رکھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے سیلاب نے سیاسی اقتدار کی بڑی بڑی چٹانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس تحریک کی زمین دوز جڑوں کے کسی ایک ریشہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ تعجب ہوتا ہے کہ منشی محمد جعفر صاحب جیسے ہوشیار کارکن ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے اور پھر بھی وہ ۱۸۵۷ء کے نتائج سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہنٹر صاحب تو یہاں تک فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اُس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ اُن لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔

دہلی میں جب باغیوں کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں تو جعفر اپنے پُرانے (عرضی نویسی کے) کام پر تھانیسر واپس آگیا، اور خدا کی ان غیر معلوم مصلحتوں پر غور کرنے لگا جنھوں نے کفار کو فتح دی۔[2]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۳ و ص ۱۴۴۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۱۔

Marfat.com

تادیبی مہم اور سیاسی مقدمے ناکام

ہنٹر صاحب کی کتاب کی چند سطریں اور پڑھ لیجئے اور ماضی کے اس سچے افسانے کی قدر کیجئے۔

"لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ، غداروں کا جوش ٹھنڈا کرنے میں ایسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلاف نے چند سال کے لئے انہیں سرحد پر خاموش رکھا۔ مگر اس کے باوجود ہمارے علاقے میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش سے ہوتی رہی۔ مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔[1]

خُفیہ زبان اور اصطلاحی الفاظ

کچھ نمونے خفیہ زبان کے بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ جو بقول ہنٹر اُن کی کامیابی کے راز تھے۔

اصل	اِصطلاح
پٹنہ	چھوٹا گودام
ملکا۔ ستھانہ	بڑا گودام
مولانا عبدالرحیم صاحب کا گھر	قافلہ گاہ۔ قافلہ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۴۴ - [2] ماخوذ از اسلامی تحریک ص۱۰۱ و ص۱۰۲ از مولانا مسعود عالم مرحوم بحوالہ کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء و وہابی ٹرائل۔ و فیصلہ مقدمہ از مسٹر ڈبلو۔ اینسلی۔

Marfat.com

اصل	اصطلاح
رضاکار اور مجاہد	خدمتگار۔ بیوپاری۔ مسافر۔ سانڈ۔ جہادی۔
رضاکاروں کا جتھہ	قافلہ
جنگ	مقدمہ
ہنڈی	سفید پتر
نقد رقم	کتابوں کی قیمت
روپے	جوتے۔ کتابیں۔
مولانا عبداللہ صاحب کا ہیڈ کوارٹر	گلشن
مولانا عبداللہ صاحب امیر المجاہدین	بابو صاحب

خاص خاص حضرات کے نام بھی بدل کر استعمال کیے جاتے تھے، مثلاً

اصلی نام	فرضی نام
مولانا یحییٰ علی	محی الدین
مولانا فیاض علی	بشیر الدین
مولانا عبداللہ صاحب	بابو صاحب۔ بابو جان۔ میاں جان
محمد شفیع	شفاعت علی
عبدالرحیم	رحیم بیگ
محمد جعفر	پیرو خاں۔ پیرو خلیفہ
عبدالقادر	غلام قادر
احمد اللہ	احمد علی
محمد احسان	رُوح اللہ

Marfat.com

اِنتقامی کارروائیاں

اِنکشاف، گرفتاریاں، فراہمیٔ ثبوت اور ترتیبِ مقدمات

سُراغ غزن خاں کے متعلق منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا ارشاد تو یہ ہے:

"غزن خاں مخبر نے تو محض ایک جھوٹا قصہ اپنے بیٹے کے قافلہ کو بھیجنے کا گھڑ کر ایک دو گاؤں جاگیر دھوکا دے کر سرکار سے لے لی۔"[1]

لیکن مسٹر ہنٹر اور اُن کے ہم نواؤں نے "غزن خاں" اور اُس کے بیٹے کو تاریخ کا ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے۔ غزن خان کے متعلق ہنٹر صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"اُس نے ایک ایسے جان جوکھوں کے کام کی تجویز سوچی جس کی مثال سپارٹا والوں کے استقلال اور رومن وفاداری کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔"[2]

اب غزن و ابنِ غزن اور اُن کی سُراغ رسانی کی دلچسپ کہانی[3] سُنئے:

۱۸۵۸ء کی سرحدی جنگ[4] میں غزن خاں نامی پٹھان[5]، بے قاعدہ سوار فوج میں بھرتی ہوا۔ جنگ ختم ہونے پر چناؤ کیا گیا۔ جن سپاہیوں میں صلاحیت دیکھی گئی، اُن کو رکھا گیا۔ باقی کو خارج کر دیا گیا۔ غزن خان بھی وہ خوش نصیب غلام تھا جس کو فوجی آقا نے خدمت گذاری کا شرف بخشا۔ غزن خاں کی خوش نصیبی نے ایک قدم آگے بڑھایا، وہ سارجنٹ بنا کر کرنال بھیج دیا گیا۔

---

[1] تواریخ عجیب ص۲ شائع کردہ اقبال اکادمی لاہور۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۲۷۔ [3] ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ [4] جو مولانا عنایت علی صاحب اور انگریزی فوجوں میں ہوئی۔ محمد میاں۔ [5] غزن خان یوسف زئی کے علاقہ کا باشندہ تھا۔ (اسلامی تحریک ص۱۰)۔

Marfat.com

۱۸۵۸ء کی جنگ میں جو مجاہد شہید ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں کا رنگ سانولا سیاہی مائل تھا اور وہ بنگالی معلوم ہوتے تھے۔ سرحدی جنگ میں ایسے مجاہدین کی شہادت انگریزی افسروں کے لئے معمہ بن گئی۔ مگر اس وقت سراغ لگانا مشکل تھا۔

۱۸۶۳ء میں غزن خاں ایک روز علی الصبح گشت پر تھا کہ اُس نے چار اجنبیوں کو سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ بقول ہنٹر:

اُن (اجنبیوں) کے پست قد، میلے کچیلے چہرے اور چھوٹی چھوٹی داڑھیوں سے غزن خاں کو وہ بنگالی غدار یاد آگئے جو اُس نے ۱۸۵۸ء کی جنگ میں مقتولین کے درمیان دیکھے تھے، اُس نے اُن سے باتیں شروع کر دیں، اور رفتہ رفتہ اُن کے رازوں کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر کار اُسے معلوم ہوا کہ وہ ملکا کے بنگالی سفیر ہیں اور اپنے وطن واپس جا رہے ہیں۔ تاکہ وہاں پہنچ کر آدمی اور روپیہ مہیا کرنے کا انتظام کریں۔ غزن خاں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ ان غریب الوطن بنگالیوں نے رہائی کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ انہوں نے رشوت کا لالچ بھی دیا، اور یہاں تک کہہ دیا کہ منہ مانگی رشوت وہ یہیں تھانیسر میں منشی محمد جعفر صاحب کے یہاں سے دلوا دیں گے مگر غزن خاں کا سخت دل نہیں پسیجا۔ اور اُس نے اُن کو لے جا کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے ان غریب الوطن مسافروں کو سزا دینے کی کوئی قانونی وجہ نہیں پائی۔ لہٰذا اُن کو رہا کر دیا۔ غزن خان کو بہت خفت ہوئی۔ اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کی بات جھٹلا دی گئی۔ اس وفادار کو یہ بھی خدشہ تھا، کہ ان مجاہدین کی طرف سے اس کے سفید فام آقاؤں کی سلطنت پر عنقریب کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ بلا کسی رخصت کے وہ ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے اپنے لڑکے کو وطن سے بلایا۔ اور یہ تمام قصہ اُس کے سامنے رکھ کر فرمائش کی وہ مجاہدین کے

Marfat.com

کیمپ میں پہنچ کر سُراغ لگائے۔ لڑکے نے باپ کے حکم کی تعمیل بڑی جوانمردی سے کی۔ وہ راستے کی تمام صعوبتوں اور تمام جانی اور مالی خطرات کو جھیلتا ہوا مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر "ملکا" میں پہنچا اور مجاہدین کے لشکر میں بھرتی ہوگیا۔ ستھانہ پر حملہ کیا تو وہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں سے خفیہ طور پر فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس پہنچا اور بہت سے راز جو سینے میں چھپا کر لایا تھا، باپ کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔[1]

غزن خاں نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے حکّام تک رسائی حاصل کرکے یہ تحفہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔

انگریزی سرکار کو یہ خزانہ ہاتھ لگا تو اُس نے دل کھول کر اُس سے کام لیا۔ اصل مجرموں تک پہنچنے کے لئے اب بھی وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت تھی۔ البتہ پولیس کی بے پناہ دست درازیوں نے ایسے سنگریزے ضرور فراہم کرلئے، جن کو گھڑ گڑھ کر کسوٹی کے کام میں لایا جاسکے۔

گرفتاریوں کی بھرمار دست درازیٔ پولیس کی داستان تو بہت طویل ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے اور پولیس کی سوسالہ تاریخ کی یکسانیت سے شمالی ہند کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے خوف و ہراس کا اندازہ کرلیجئے۔ مولانا محمد جعفر صاحب فرماتے ہیں:

> یہ ایسا وقت تھا کہ اگر کوئی شخص ہمارے واسطے ذرا بھی کلمۂ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ بیسیوں آدمی ہمارے شہر کے فقط اسی قسم کے قصوروں میں قید ہوگئے تھے کہ اُن کے پاس میرا کوئی سامان نکل آیا۔ یا میرے مکانات کی ضبطی اور نیلام کے بعد میرے بال بچوں کو کسی نے اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔[2]

---

[1] ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان صـ۱۲۵۔ [2] تواریخ عجیب صـ۳۴

پشاور سے لے کر مشرقی و شمالی کنارۂ بنگال تک شاید کوئی مالدار مسلمان یا مولوی و نمازی باقی رہا ہو جس کو ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر اس کی وسعت کے مطابق اپنی مٹھی گرم نہ کی ہو۔[1]

...... ہم نے دیکھا کہ بڑے بڑے صاحب لوگوں نے قانون و آئین طاق نسیاں پر رکھ دیا۔[2]

آخر ۱۸۶۳ء (یعنی دسمبر ۱۸۶۳ء) سے دس برس تک ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رکھی۔ صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں اور خوشامدیوں اور ہمارے دشمنوں نے خوب دل کے چاؤ نکالے۔ دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصے اور بحث کے کوئی دوسری بات کم ہوتی تھی۔ ایک محکمہ مع گواہ شاہدوں کے اس دار و گیر کے واسطے برسوں تیار رہا۔ جس کو چاہا پکڑ لیا، اور جو چاہا رشوت لے لی۔ اور جس نے نہ دی۔ اس کو معمولی گواہوں سے گواہی دلوا کر دائم الحبس کر دیا۔[3]

مولانا عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

جب ان لوگوں (مولانا عبداللہ صاحب اور اُن کے مجاہد رفقاء) کی امداد و اعانت کے جُرم میں مولانا یحییٰ علی وغیرہ گرفتار ہوئے تھے اُس وقت سرکاری پولیس نے صدہا آدمیوں کو از پشاور تا کلکتہ گرفتار کیا تھا۔[4]

ہنٹر صاحب کا قلم بھی غیر شعوری طور پر دس سال تک بے تحاشا گرفتاریوں اور پولیس کی چیرہ دستیوں کی تصدیق کر دیتا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب ۱۸۷۱ء میں لکھی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

۱؎ تواریخ عجیب ص۱۹۔ ۲؎ ایضاً ص۲۰۔ ۳؎ ایضاً ص۲۰۔ ۴؎ الدر المنثور ص۱۴۹۔

Marfat.com

گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔ فی الحقیقت سرحد کی ہر ایک جنگ کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی حدود میں بھی ایک سیاسی مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت بھی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد جو دُور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے۔ اپنے جُرموں کی سزا بھگت رہی ہے۔ یا اپنے مقدمے کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے[۱]

ہنٹر صاحب کی اس تصنیف کے سال تک سات سال ہوئے منشی محمد جعفر صاحب کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تین سال تک گرفتاریوں کا یہ چکر چلتا رہا۔ مولانا محمد جعفر صاحب کا ارشاد ہے:

۱۸۷۲ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلۂ گرفتاری بے گناہوں کا جاری رکھا[۲]

ضبطی جائداد یہ گرفتاریوں کا سلسلہ تھا۔ جائدادوں کے سلسلہ میں مشہور بنگالی قانون دان اور انگریزی حکومت کے خاص ذمہ دار سر عبدالرحیم صاحب مرحوم سابق اسپیکر مرکزی اسمبلی کے خطبۂ صدارت کا ایک فقرہ ملاحظہ فرمائیے۔

"۱۸۷۰ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو وہم و گمان پر مبنی تھی۔ بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبہ بنگال کی چوتھائی تھی، ضبط کر لی۔ جس سے ہزاروں مسلمان خانماں برباد اور پریشان ہو گئے[۳]

سازش کے چاروں مقدموں میں عبور دریائے شور کی سزا کے ساتھ جائدادیں بھی ضبط کی گئیں۔ جن کی قیمت اس زمانہ میں بھی

---

[۱] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۲۳۔ [۲] تواریخ عجیب ص۸۷۔ [۳] خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء۔

Marfat.com

کئی کروڑ روپیہ تھی ۔ صرف امیر الدین صاحب (پٹنہ) کی ضبط شدہ جائداد کی قیمت تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھی"۔

عجلت | پھر ضبطی جائداد میں اس قدر عجلت سے کام لیا جاتا تھا کہ مولانا محمد جعفر صاحب فرماتے ہیں :

"انگریزوں نے قبل از صدورِ حکم اخیر مقدمہ کے میری کل جائداد پہلے ہی دن قرق کر لی تھی ۔ دوسرے دن خود میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا"۔

اس عجلت پسندی کے ساتھ جابرانہ تغلب اور غاصبانہ چیرہ دستی بھی ملاحظہ فرمایئے ۔ مولانا موصوف فرماتے ہیں :

میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ کوئی جائداد قبل از قرقی علیحدہ کر لیں اور بعد صدور حکم ضبطی جب میرے بھائی نے جو نصف کا مالک تھا، اپنے حصہ کا دعویٰ کیا ۔ تو اس کو بھی فقط ایک کوٹھڑی دے کر کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر کے نیلام کر دی ۔ میں نے بنظرِ دُور اندیشی اپنے حصہ کی کُل جائداد اپنی بیوی کے مہر میں مکفول کر دی تھی . . . . مگر مارے غصہ اور تعصب کے کسی نے بھی نہ سُنا اور میری بیوی کو مع دو نا بالغ شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا[1]۔

سرکاری گواہ کس طرح بنایا جاتا تھا | یہ طولانی قصہ بہت دل خراش ہے ۔ نہ قلم میں لکھنے کی طاقت اور نہ سُننے والوں کو سُننے کا یارا ۔ طبیعت پر جبر کر کے کچھ سُن لیجئے مولانا محمد جعفر سے بڑھ کر سچا راوی کون ہو سکتا ہے جو دوسروں سے نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا مشاہدہ پیش کرتے ہیں ۔ اُن کا بیان ہے :

---

[1] تواریخ عجیب صفحہ ۳۸ ۔

Marfat.com

"مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پاتا تھا، جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا اور آموختہ (سکھایا ہوا) بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا، تو اسی روز رات کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از پیشی مقدمہ شمسن مرگیا[1]"

منشی صاحب کی آپ بیتی ملاحظہ فرمایئے:

"دوسرے دن فجر کے وقت، پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ میجر ونکفیل صاحب ڈی آئی جی پولیس اور کپتان ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یاجوج ماجوج میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتادو، تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا! اُس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کر دیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور گر پڑا۔ تو ٹائی صاحب اور ونکفیل صاحب کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہوگئے۔ اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتایا۔ تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہوکر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم و تعدی کی دیکھی، تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمے کچھ رمضان کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن میں نے اُن کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا، علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زد و کوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر لے گیا۔ جہاں پر وہ دونوں یعنی ٹائی صاحب اور میجر ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔

---

[1] تواریخ عجیب صہ ۲۲

Marfat.com

اُس دن اُنھوں نے میری چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں، کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونین جہاد کو بتلا دو، تو تم کو سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دینے کے علاوہ بڑا عہدہ بھی دیں گے، اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ مَیں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں باتیں کر کے مجھ کو الگ کمرے میں لے گیا جہاں لے جا کر پھر مارنا شروع کیا۔ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن میں بفضلِ الٰہی سب سہ گیا۔ مگر اپنے رب سے ہر دم دعا کرتا رہا کہ اے رب! یہی وقت امتحان کا ہے۔ مجھے ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئے تو لاچار آٹھ بجے رات کے مجھ کو جیل خانہ واپس بھیج دیا۔ مَیں تمام دن روزہ سے تھا۔ بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتّوں سے روزہ افطار کر لیا۔[1]

ظاہر ہے یہ استقلال و استقامت ہر ایک کو میسّر نہ تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کا بیان ہے:

"اسی کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی ...... ہمارے اُوپر گواہ بنائے گئے۔ لیکن اکثر گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے جاتے تھے، مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں تو قطعِ نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا۔[2]

فراہمیٔ ثبوت ثبوت کے ایک گواہ وہ تھے جن کو مار پیٹ کر اور پھانسی کی دھمکی دے کر گواہ بنایا گیا۔ ان میں بہت سے معزز خاندانوں کے علم دوست شرفاء بھی تھے جن کے حاشیۂ خیال میں بھی اس قسم کی توہین و تذلیل کا تصور نہیں آیا ہوگا، وحشیانہ

---

[1] تواریخ عجیب ص۱۷ و ص۱۸۔ [2] ایضاً ص۲۲۔

Marfat.com

سزاؤں کا جب بھیانک منظر اُن کے سامنے آیا، تو جو کچھ سُنا سُنایا تھا اُس کو بیان کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ مگر برطانوی سرکار کے حق میں ناانصافی ہوگی، اگر اُس کی فیاضیوں کا پہلو بھی پیش نہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ توہین و تذلیل کی وحشیانہ حرکتوں کے ساتھ سنہری روپہلی تمناؤں کا سبز باغ بھی جعلی گواہوں کے سامنے پیش کیا جاتا رہا۔

چنانچہ بقول مولانا محمد جعفر صاحب:

"سرکاری گواہوں کے عمدہ خوراک و لباس کا انتظام پولیس کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان بے جا کارروائیوں میں حکومت کا لاکھوں روپیہ صرف ہو گیا۔[۱]

"فلاں فلاں ...... ہندو مسلمان جو نہایت ادنیٰ عہدے پر تھے، ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔"[۲]

درحقیقت امتحان کا موقع وہی ہے کہ ایک طرف راحت و آرام اور ہری بھری تمناؤں کے سبز باغ ہوں، اور دوسری طرف دردناک سزاؤں کی وادیٔ پُرخار۔ اس صورت میں لالہ زارِ تنعم کی عیش و عشرت چھوڑ کر وادیٔ پُرخار کی جادہ نوردی اختیار کی جائے۔

پیٹنٹ گواہ بہرحال جس طرح بھی سرکاری گواہ بنائے گئے، صرف ایک مقدمہ میں اُن کو استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ جب کبھی ضرورت پیش آئی، اُنہیں کو پیش کر دیا گیا۔ تاکہ سفید فام آقاؤں کا منشاء پورا ہو جائے، اور پولیس کے سیاہ فام نمک خواروں کو زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑے۔

مولانا محمد جعفر صاحب شاہد ہیں:

"اس کے بعد (یعنی ان کے مقدمہ میں شہادت گذر جانے کے بعد) ۱۸۷۱ء تک جو مقدمات گرفتاری وہابیاں مثل مقدمہ امیر خاں صاحب

---

[۱] تواریخ عجیب صـ۲۲۔ [۲] ایضاً صـ۲

سوداگر چرم و مولوی تبارک علی صاحب و مولوی امیر الدین صاحب ساکن پٹنہ ملک بنگال اور ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور ہوتے رہے تو یہی معمولی گواہ یا گوئندہ جھوٹی گواہی کے لئے بلائے جاتے تھے۔ اور میں نے خود ان میں سے ایک گواہ کی زبانی سنا ہے کہ جب کبھی خلاف گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا تو ہم کو یہ کہا گیا، کہ تم لوگ شرطیہ طور پر فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور گوئندہ رہا کئے گئے ہو۔ اگر تم گواہی نہ دوگے تو پھر تم کو دائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی بھیج دیا جائے گا۔[1]

مقدمات، سازش، ملزمین اور سزائیں[2]

پہلا مقدمہ سازش انبالہ سنہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء

اس مقدمہ میں گیارہ ملزم تھے۔ نام اور ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) مولانا یحییٰ علی جعفری۔ صادق پوری۔ عمر ۴۲ سال

انہیں سرغنہ کے لقب سے یاد کیا، اور بجا طور پر ناظرینِ اوراق ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

(۲) مولانا عبد الرحیم۔ صادق پوری۔ عمر ۲۸ سال

تقریباً سولہ سال جزائر انڈمان میں رہ کر سنہ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ الدر المنثور آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ کا مفصل تذکرہ دوسری جگہ گذر گیا ہے۔

(۳) مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ عمر ۲۸ سال۔ ساکن تھانیسر ضلع انبالہ۔

---

[1] تواریخ عجیب صہ ۴۲۔ [2] یہ باب مولانا مسعود عالم صاحب کی تصنیف "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" سے ماخوذ ہے۔ حسب ضرورت ردّ و بدل اور اضافہ کیا گیا ہے۔ محمد میاں

Marfat.com

تمام اسیرانِ بلا میں سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ ایک عرضی نویس کی حیثیت سے زندگی شروع کی، اور اپنے فن میں یہاں تک ترقی کی کہ خود اپنی تصنیف میں نیرنگیٔ قسمت اور بوقلمونیٔ روزگار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنی خانہ تلاشی سے تھوڑی دیر پہلے تک میں ہزاروں روپیہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر قابض تھا۔ بیسیوں آدمی میری رعیت رہتے تھے۔ ایسے بڑے شہر کا نمبردار گھوڑے گاڑیوں میں سوار ہوا پھرتا تھا۔ ہر کام کے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے۔"[1]

تحریک کے ذمہ دار ارکان میں آپ شمار ہوتے تھے۔ روپیہ اور رضا کار پہنچانے کے سلسلہ میں آپ کی ذمہ داری بہت وسیع تھی۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بھی شرکت کی، اور یہ تمام خفیہ سازشیں عرائض نویسی کے پردہ میں پوشیدہ رہیں آپ نے اس پیشہ سے اس انقلابی سازش کے راستہ میں بہت فائدہ اٹھایا۔ آپ نے پورے مقدمہ کے دوران میں کوئی وکیل نہیں مقرر کیا، اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کرتے رہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے ساتھ رہا ہوئے اور پھر چند تصانیف قلم بند فرما کر اپنا اور اپنی جماعت کا تعارف کرایا۔ آپ کو عام طور پر منشی لکھا جاتا ہے۔

(۴) میاں عبدالغفار صاحب۔ ساکن پٹنہ۔

"راونشا" نے ان کا نام عبدالغفور ولد منگو۔ قوم کوئری عمر ۲۵ سال ملازم ملزم[۸] (یعنی مولانا عبدالرحیم) لکھا ہے۔ وہ کیا جانے کہ رؤسا رصادق پور اس ملازم کا آقا سے بڑھ کر احترام کیا کرتے تھے۔ یہ بزرگ امی محض تھے۔ مولانا ولایت علی صاحب کے خادم خاص تھے۔ مولانا فرحت حسین صاحب اور مولانا عنایت علی صاحب سے

---

[1] تواریخ عجیب ص ۳۸۔

Marfat.com

تربیت پائی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے ساتھ انڈمان سے واپس ہوئے۔ تقریباً ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ صادق پور کے علماء متاخرین ان کو "سیدی میاں عبدالغفار" کہا کرتے تھے۔[1]

(۵) قاضی میاں جان۔ ساکن کمرکلی ضلع پٹنہ۔ بنگال۔ عمر ۶۰ سال۔ انبالہ جیل میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کے بیان کے مطابق مراسلات کا سب سے زیادہ باغیانہ حصہ انہیں کے گھر پایا گیا۔

یہ پانچ حضرات جماعت کے رکن اور تحریک کے ذمہ دار تھے۔ یہ جس طرح جہادِ آزادی میں پیش پیش تھے، مصائب شکست برداشت کرنے میں بھی جواں مرد ثابت ہوئے۔ ان کے صبر و استقلال سے دورِ صحابہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ اس مقدمہ میں چھ ملزم اور تھے۔ یہ کاروباری لوگ تھے یا ملازمت پیشہ۔ یہ تحریک کے ذمہ دار نہیں تھے۔ البتہ تحریک کا کوئی کام ان کے ذمہ کر دیا جاتا تھا۔ اسی جرم میں یہ گرفتار کئے گئے۔ یہ لوگ ایک عرصہ تک شریکِ مصائب رہے۔ کسی نے سات سال اور کسی نے دس سال انہیں مصیبتوں میں گذار دیئے۔ پھر کسی قدر ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی، اور زیادہ تر حکومت نے ان کی مہمانی کو غیر ضروری سمجھا۔ لہٰذا رہا کر دیئے گئے۔ ان میں سب سے پہلے:

(۶) محمد شفیع انبالوی۔ فوجی ٹھیکیدار ہیں۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لاکھوں روپے کے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کا تعلق تحریک سے صرف اتنا تھا کہ اُن کے فرم کے ذریعے سرحد پار روپیہ بھیج دیا جاتا تھا۔ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا۔ پوری ہمت اور حوصلہ سے مقدمہ لڑایا۔ تمام جائداد ضبط اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ اس وقت قدم ڈگمگائے۔ سرکاری ایجنٹوں نے کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ اُن کو سرکاری گواہ بنا لیا۔ پھانسی کی سزا حبس دوام بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ مگر یہ سرکاری گواہ پہلے

---

[1] سب سے پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۱

بنائے جا چکے تھے۔ سرکاری گواہ بننے کے بعد بھی رہائی ایک سال بعد ہوئی۔ ضبط شدہ جائداد پھر بھی واپس نہیں ہوئی۔ یہ قربانی کیا کم ہے کہ کروڑ پتی دولت مند نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ منشی محمد جعفر صاحب کو محمد شفیع پر نہیں بلکہ حکومت کی عیاری پر افسوس اور غصہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"بملاحظہ مثل مقدمہ اور دلائل ثبوت جرم نسبت محمد شفیع واضح ہوگا کہ اوّل کس غیظ و غضب سے محمد شفیع کو پھانسی کا حکم دے کر پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کی تھی۔ پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اس کو رہا کر دیا تاکہ جائداد منضبطہ واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ جیسا کہ ایک برس بعد کی رہائی سے ثابت ہے، بے قصور تھا۔ تو پہلے اس شد و مد سے اس کی پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کر کے اس کو پھانسی کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔ اور اگر دراصل وہ بھاری قصوروار تھا اور صاحب سیشن جج کے سب دلائل مندرجہ فیصلہ صحیح ہیں تو ایک برس بعد کس واسطے اس کی رہائی کر دی"[1]

منشی صاحب کا منشا یہ ہے کہ محمد شفیع کا جرم قابلِ سزا تھا ہی نہیں۔ اس کو مقدمہ میں صرف اس لئے پھانسا گیا کہ پچاس لاکھ کی جائداد ہاتھ لگے اور کم از کم اس مقدمہ کا خرچ اس کی جائداد سے نکل آئے۔

(۷) عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال

یہ محمد شفیع کا مختار تھا۔ تین سال بعد رہا کیا گیا۔

(۸) عبدالغفور ولد شاہ علی خاں۔ ساکن ضلع شاہ آباد۔ صوبہ بہار۔ عمر ۲۵ سال ملزم نمبر ۱۱ کا ملازم تھا۔ دس سال جیل میں رکھنے کے بعد رہا کیا گیا۔

(۹) حسینی ولد محمد بخش عمر ۲۵ سال۔

---

[1] تواریخ عجیب ص ۴۱

Marfat.com

جماعت کے کاموں میں منشی محمد جعفر صاحب کا معاون رہا کرتا تھا۔ سات سال بعد رہا کیا گیا۔

(۱۰) حسینی ولد میگو۔ ساکن پٹنہ۔ عمر ۳۵ سال

یہ بھی الٰہی بخش ملزم ۱۱ کا ملازم تھا۔ دس سال سزا بھگتنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

(۱۱) الٰہی بخش ولد کریم بخش عمر ۴۲ سال

مولانا احمد اللہ صاحب صادق پوری کی جائداد کا مختار عام تھا۔ خوددار و بھاری آدمی تھا۔ اس سلسلہ میں اس کے ذریعہ روپیہ بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ وعدہ معاف گواہ بنایا گیا۔ مگر پانچ سال جیل کی ہوا پھر بھی کھلائی گئی۔

دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء اس مقدمہ کے ملزم مولانا احمد اللہ صاحب صادق پوری تھے۔ آپ مولانا یحییٰ علی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا یحییٰ علی صاحب کی گرفتاری ۱۸۶۴ء کے بعد آپ مرکز صادق پور کے نظم و ضبط کے ذمہ دار قرار دیئے گئے، اور صرف ایک سال گذرنے پایا تھا کہ آپ گرفتار کر لئے گئے۔ آپ کی ذاتی قابلیت، عظمت و شہرت، اور سرکاری حلقوں میں آپ کے اثر و رسوخ کا تذکرہ "ذمہ دار حضرات" کے زیر عنوان پہلے آچکا ہے۔ اس مقدمہ کے نتیجہ میں مولانا احمد اللہ صاحب کو پہلے پھانسی اور پھر اپیل کے بعد حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ تمام جائداد ضبط کی گئی، اور صرف قافلہ والی حویلی ہی نہیں بلکہ احاطۂ صادق پور کے تمام مکانات مسمار کر دیئے گئے۔ قبرستان کی قبریں تک اُکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ ایک نہایت قیمتی اور نادر کتب خانہ تھا، وہ ضبط کر کے برباد کر دیا گیا۔ یہ ضبط شدہ اور مسمار کردہ احاطہ میونسپلٹی کو عطا ہوا۔ جہاں پٹنہ سٹی میونسپلٹی کا دفتر تعمیر کیا گیا اور باہر چھوٹا سا بازار بنا یا گیا۔

اور خاص بات یہ کہ تمام خانہ ویرانی ٹھیک عید کی صبح کو شروع ہوئی۔ آزمائش بر آزمائش۔ کریلا اور نیم چڑھا۔

Marfat.com

مولانا احمد اللہ صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم عبد الحمید صاحب[1] عظیم آبادی مطب کیا کرتے تھے۔ اُن کا دواخانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔

آپ کی مشہور نظم "مثنوی شہر آشوب" اس سانحہ کی منظوم تاریخ ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے والد ماجد مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری اور ضبطی جائداد کے متعلق فرماتے ہیں:

کنم الحال مختصر مرقوم ماجرائے عیال آن[2] مظلوم
چون شب عید را سحر کردند ہمہ را از مکان[3] بدر کردند
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع نقد و جنس و ہمہ اثاث و ضیاع
بہر ما بود آہ جرمے سخت بروں سوزنے ز جملہ رخت
احدے را نہ بد چہ مرد و چہ زن حکم ہمراہ بردن سوزن
ہمہ سرگشتہ بے سر و سامان نہ غم جیب نہ غم دامان
من نہ تنہا کہ ہم ہم تنہا بچگان و زنان و شیونہا
مایۂ عیش ساز ماتم شد عید ما غرہ محرم شد

---

[1] جلیل القدر عالم و فاضل۔ بہت بڑے شاعر۔ بقول سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم "خاقان ہند" (اسلامی تحریک صفحہ ۱۲)۔ [2] یعنی مولانا احمد اللہ صاحب۔ [3] عید کی صبح ہوئی اور خاندان صادقپور کی تمام عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر نکال دیا گیا۔ جو کچھ تھا سب ضبط کر لیا گیا۔ کسی کو ایک سوئی تک لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ خانہ برباد گھر سے نکل کر حکیم ارادت حسین صاحب کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ حکیم ارادت حسین صاحب بھی اگرچہ خاندانِ صادق پور سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ مقدمہ انبالہ کے فوراً بعد (رجب ۱۲۸۱ھ۔ نومبر ۱۸۶۴ء) مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ اس لئے ان کا مکان دست بردِ اغیار سے محفوظ رہا۔ اور پورے صادق پور میں یہی ایک مکان اپنی حالت پر باقی رہ گیا تھا۔ حکیم ارادت حسین صاحب نے ۱۳ سال زندگی کے گذار کر مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ اُن کے اہل و عیال صادق پور میں رہے۔

Marfat.com

کُتب خانہ کی ضبطی پر حکیم صاحب کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔

کتبِ ملّتِ مسلمانان رفت در دست حرف ناخوانان
داند او ہر کہ با تمیز بود مالِ یغما کرا عزیز بود
راست گوینده ایں مثل گفت است دلِ بے رحم و دولت مفت است

دواخانہ کی ضبطی کا مرثیہ ملاحظہ ہو:

نام و نشانِ قوّتِ میرس صورت قوت لایموت میرس
حال قوت و نشان و منزلِ من عالم الغیب داند و دلِ من
یک دواخانہ وجہِ قوتم بود مایۂ قوتِ لایموتم بود
آمد آں خانہ ہم بمعرضِ ضبط شد ہمہ نظم و رزیم بے ربط

ان بے چاروں کی قلبی حالت کیا تھی۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مثنوی کے یہ تین شعر کافی ہیں:

صرصرِ فتنہ چوں وزیدے تند حسبِ حال ایں دو بیت دل میخواند
دلِ ظالم بقصدِ کشتن ماست دلِ مظلوم ما بسوئے خداست
او دریں فکر تا بما چہ کند ما دریں فکر تا خدا چہ کند[1]

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری کا ذکرِ خیر مقدمۂ سازش انبالہ میں گذر چکا ہے۔ جب بیس سال بعد ۱۳۰۱ھ میں رہائی پاکر واپس ہوئے تو محلہ صادقپور کی تباہی اور قبرستان کی بربادی دیکھ کر آپ سے نہ رہا گیا۔ آپکی تصنیف الدر المنثور کے مندرجہ ذیل اقتباسات خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔

مَیں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلہ سے رخصت ہو کر محلہ نمو ہیہ[2] پہنچا جہاں میرے اہل و عیال مقیم تھے۔ اس کی صبح ہو کے صادق پور گیا

---

[1] مثنوی شہر آشوب مطبوعہ الہ آباد۔ [2] صادق پور اور موجودہ بانکی پور کے درمیان شہر پٹنہ کا ایک محلہ۔

Marfat.com

تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کُل منہدم کرکے کف دست میدان بنا دیا گیا ہے اور اُس پر بازار اور میونسپلٹی کے مکانات بنا دیئے گئے ہیں۔ مَیں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو جہاں چودہ پُشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جاکر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفراللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اُس پر دعاء مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کہ کوشش کی، پتہ نہ چلا۔ بعد تجسس و تفحص بسیار و غور و فکر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اُس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے .....

اے حضرات ناظرین! اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پر گذرا، وہ بیرون از حیطہ تحریر و تقریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن تک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جُرم میں ہمارے اموات اور آباء و اجداد کی قبریں کیونکر کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبطی میں آیا۔ ہماری عادل گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا۔ بہرکیف مَیں نے اُسی جگہ کھڑے ہوکر جہاں اُن کی قبر میرے خیال میں آئی دعاء مغفرت کرلی، اور آج تک بھی ایسا ہی کر لیا کرتا ہوں۔[1]"

تیسرا مقدمہ سازش مالدہ ۱۸۷۰ء اس کی مختصر روئداد تو یہ ہے، کہ مولوی امیر الدین صاحب پر یہ مقدمہ چلایا گیا۔ ہائی کورٹ سے ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مولوی امیر الدین صاحب مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔ دس گیارہ سال سختی اور جلاوطنی کے گذار کر ۱۸۸۳ء (۱۳۰۰ھ) میں رہا ہوئے۔

---

[1] الدر المنثور

مولانا امیرالدین صاحب کون تھے اور اُن کی باغیانہ سرگرمیاں کیا تھیں؟

جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ ص ۲۷ میں اختصار کے ساتھ اور ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں تفصیل سے مولانا امیرالدین صاحب کا تعارف اور اُنکی سرگرمیاں بیان کی ہیں۔ ہم ہنٹر صاحب کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

مولانا امیرالدین صاحب[1] ضلع مالدہ کے باشندہ تھے۔ اُن کے والد رفیق منڈل، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے معتقد اور اُن کی تحریک کے خاص رکن تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھنؤ کے باشندے اور مولانا ولایت علی صاحب کے خلیفہ تھے۔ تقریباً ۱۸۴۰ء میں جب مولانا ولایت علی صاحب کی زیر قیادت پورے ہندوستان بالخصوص بہار و بنگال میں بغاوت کے لئے زمین ہموار کی جارہی تھی، مولانا عبدالرحمٰن صاحب ضلع مالدہ کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ ایک مدرسہ میں تعلیمی خدمت انجام دینے لگے اور اجنبیت ختم کرنے کے لئے وہیں ایک خاتون سے عقد کرلیا۔ آپ کی جدّ وجہد بارآور ہوئی۔ زمینداروں کے نوجوان لڑکے آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ رفیق صاحب بھی اُنہیں میں سے تھے، اور چونکہ اپنے علاقہ کے چوہدری تھے، اس لئے ان کو "منڈل" کہا جاتا تھا۔ (منڈل اس نواح میں چوہدری یا پٹیل کو کہتے ہیں)۔

منڈل صاحب نے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ کر کام کیا اور اس تنظیم کو پورے ضلع بلکہ آس پاس کے دوسرے اضلاع میں پھیلا دیا اور جماعت کے نظام کے مطابق مجاہدین کی بھرتی کرنے لگے، اور مالیہ فراہم کرکے صادق پور کے مرکز میں بھیجنے لگے۔

۱۸۵۱ء میں سرحد پر کچھ مقابلہ ہوا۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اُس

---

[1] کسی صاحب نے مولانا امیرالدین صاحب کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا لڑکا کہہ دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے دیکھو راونشا کی یادداشت (میمورنڈم) بنام حکومت بنگال بحوالہ کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء۔

Marfat.com

وقت مقامی حکّام کی نظر رفیق صاحب کی سرگرمیوں پر پڑی - ان کو گرفتار کیا گیا۔ مگر پھر چھوڑ دیا گیا۔ اب رفیق صاحب کے صاحبزادے مولانا امیرالدین صاحب میدان میں آئے، اور اتنی سرگرمی سے کام کیا کہ تین ضلعے اُن کے چارج میں دے دیئے گئے۔

دسمبر ۱۸۶۳ء میں مقدمہ سازش انبالہ دائر ہوا، اور داروگیر کی ایک لہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے شمالی ہند میں پھیل گئی - (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی) - لیکن بقول ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کا جوش ٹھنڈا کرنے میں ایسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۴ء کی تادیبی مہم[1]

اس اثنار میں مولانا امیرالدّین صاحب کی سرگرمیوں کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بقول ہنٹر صاحب مجاہدین کی سرحدی چوکی پر جو تعداد تھی اُس میں دس فیصدی رنگروٹ (مجاہد) اسی شخص کے زیر اثر علاقوں سے آئے ہوئے تھے[2]

پھر اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ ۱۸۶۸ء میں ایک طرف سرحد پر میدانِ کارزار گرم تھا اور دوسری جانب مولانا امیرالدّین صاحب کی سرگرمی کی حالت یہ تھی کہ خلیفہ کے لڑکے کو مدد کے لئے بلا بھیجا[3]

اس کے علاوہ چونکہ اُن کا مرکز جنوبی بنگال سے شمال مغرب کو جانے والی سڑک پر واقع تھا، لہٰذا ہر بغاوت پھیلانے والے مبلّغ کی قیام گاہ تھا۔ دونوں خلیفہ (مولانا ولایت علی صاحب و مولانا عنایت علی صاحب) اس کے یہاں قیام کر چکے تھے، اور باغی کیمپ کے موجودہ (۱۸۷۰ء کے) سرداروں میں سے بھی ایک شخص سرحد کو جاتے ہوئے یہاں قیام کر چکا ہے[4]

پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا یحییٰ علی صاحب نے بنگال کی انقلابی پارٹی "فرازی" کو اس تحریک میں شریک اور بقول ہنٹر مدغم کر لیا تھا - یہ جماعت اسی علاقہ میں تھی۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۴ - [2] ایضاً صفحہ ۱۱۹ - [3] ایضاً صفحہ ۱۱۹ - [4] ایضاً صفحہ ۱۲۲

Marfat.com

جو مولانا امیر الدین صاحب کے چارج میں تھا۔

ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

"۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک جمع شدہ سرمایہ اور آدمی حسب دستور سرحد جاتے رہے۔ چنانچہ اس سازش کو قابو میں لانے کے لئے ہمیں ایک علیحدہ محکمہ قائم کرنا پڑا۔ اس وقت وہابیوں کی دیکھ بھال اور اُن کو اعتدال پر رکھنے کے لئے صرف ایک ہی صوبہ کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا جتنا ایک انگریزی ضلع کا جس میں اسکاٹ لینڈ کے ایک تہائی انسان بستے ہیں ..... یہ شر انگیزی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لئے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے، اور اُن کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو اُن کے مُرید ہوں۔ لیکن اُن کا یہ حال ہے کہ اپنے سردار سے غداری کے بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں[1]۔"

۱۸۶۸ء میں پولیس کی تگ و دو اور سرحد پر فوجی چوکیوں کے باوجود ان مجاہدین کی سازشوں نے حکومتِ ہند کو ایک اور خونریز جنگ میں دھکیل دیا۔ جس میں ہمارا بہت سا روپیہ خرچ ہوا۔ اسی سال مالدہ کے مرکز نے بے خطر ہو کر پٹنہ کے خلیفہ کے لڑکے کو دعوت دی کہ وہ بنگال کے عین وسط میں پہنچ کر بغاوت کی تبلیغ کرے۔ روزمرہ کی عدالتی کارروائیاں اس بحران کو روکنے کے لئے بالکل بیکار ثابت ہوئیں، اور حکومت کو ان اختیاراتِ خصوصی سے کام لینا پڑا جن کے استعمال کا ایسے موقع پر اس کو اختیار دیا گیا ہے (یعنی

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۹۔

Marfat.com

ریگولیشن نمبر III ۱۸۱۸ء نمبر ۱[۱]"

ہنٹر صاحب کی برادری کو صرف اپنے اقتدار کی فکر ہی نہ تھی، بلکہ فکر یہ بھی تھی کہ انگلستان نے بہت بڑی بازی ہندوستان میں لگا رکھی ہے۔ جب سے یہ ملک زیر اقتدار آیا ہے، انگریزی سرمایہ دار کروڑوں پونڈ سالانہ ریلوں، نہروں اور دیگر منفعت بخش کاموں میں لگاتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت میں عارضی طور بھی فرق آگیا تو یہ ایک عظیم الشان مصیبت ہوگی[۲]۔

مختصر یہ کہ:

"جب سرحد پر تباہ کن لڑائیاں اور ملک کے اندر عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کا اتحاد توڑ سکیں۔ تب ۱۸۶۸ء میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے استحقاقِ گرفتاری کو سختی کے ساتھ استعمال کرے[۳]۔

اس استحقاق کی بنا پر جن مشتبہ مسلمانوں کو نظر بند کر دیا گیا اُن کی صحیح تعداد نہیں معلوم ہوسکی۔ یہ یقینی بات ہے کہ ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگی[۴]۔ ہمارے سامنے مقدماتِ سازش کی تفصیلات ہیں۔ اُن میں سے ایک یہی زیر بحث مقدمہ ہے۔ باقی دو مقدمے وہ ہیں جو راج شاہی اور پٹنہ میں چلائے گئے۔ ان کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

چوتھا مقدمہ سازش راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء راج محل، صوبہ بہار بھاگل پور کمشنری کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ مالدہ ضلع گو بنگال میں

---

۱ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۹۔ ۲ ایضاً ص ۱۵۱۔ ۳ ایضاً ص ۱۵۱۔ ۴ ہنٹر صاحب کے یہ الفاظ پہلے گذر چکے ہیں کہ اس وقت بھی (یعنی جون ۱۸۷۱ء میں) قیدیوں کی بہت بڑی تعداد، جو دُور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے، اپنے جرموں کی سزا بھگت رہی ہے یا اپنے مقدمے کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۳)

Marfat.com

ہے۔ لیکن دریا کی راہ سے راج محل اور مالدہ بالکل ملے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے راج محل، مالدہ ضلع میں تھا۔ پھر مُرشد آباد میں ضم کیا گیا۔ آج کل سنتھال پرگنہ کمشنری بھاگل پور میں شامل ہے۔

راج پور کے نواح میں ایک قصبہ اسلام پور ہے۔ وہیں ایک بزرگ "ابراہیم منڈل" تھے[۱]

۱۸۷۰ء میں جب وہابی تحریک کے مرکزوں پر دھاوا بولا گیا[۲] تو ابراہیم منڈل اُن میں سے تھے جن کو خاص مقدمۂ سازش کے لئے منتخب کیا گیا۔ چنانچہ مولانا امیرالدین صاحب کی طرح اُن پر بھی مقدمہ چلا۔ اور یہ بھی اُسی سزا سے بہرہ اندوز ہوئے جو مولانا امیرالدین صاحب کے لئے تجویز کی جا چکی تھی۔ یعنی حبسِ دوام بعبور دریائے شور۔

"اس جرم وسزا کے متعلق مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری کو تو یہ افسوس ہے کہ:

"ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں پکڑا اور اپنے معمولی گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چاروں کو کالے پانی روانہ کر دیا۔"[۳]

لیکن ہنٹر صاحب کو خفگی یہ ہے کہ:

"ان کی سازش کا جال کسی بھی کمزور حکومت کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔"[۴]

پانچواں مقدمۂ سازش پٹنہ ۱۸۷۱ء یہ مقدمہ مارچ ۱۸۷۱ء میں پٹنہ میں دائر ہوا۔ اس مقدمہ میں ملزم کُل سات تھے جن پر ثبوت کے لئے ۱۳۶ گواہ پیش کئے گئے۔ یہ گواہ شمالی ہند کے تقریباً ہر ایک حصّہ کے تھے۔ پشاور، ہزارہ اور

---

[۱] پہلی اسلامی تحریک ص ۱۲۹۔ [۲] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۶۔ [۳] تواریخ عجیب ص ۸۷۔
[۴] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۶۔

Marfat.com

ماوراء سرحد سے لے کر مدناپور اور باقر گنج جیسے بنگال کے مشرقی اضلاع سے یہ گواہ لائے گئے تھے۔ ملزمین کے نام اور مختصر تعارف ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مولانا مبارک علی صاحب۔ جو مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد مرکز صادق پور کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے مرکز کی تنظیم سنبھالتے ہوئے دائر شدہ مقدمات کی پیروی میں بھی کافی مدد کی۔ مقدمہ انبالہ کے سلسلہ میں ایک دفعہ انبالہ بھی تشریف لے گئے۔ پہلے ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوئے۔ ابھی اس سے فراغت نہیں ملی تھی کہ ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمہ میں مبتلا کر دیئے گئے اور یہاں تک اذیت دی گئی کہ جان عزیز جب قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی، تب ان اذیتوں سے نجات ملی۔

(۲) مولانا تبارک علی صاحب۔ مولانا مبارک علی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ امبیلا کی مہم ۱۸۶۳ء میں مولانا عبداللہ صاحب کے شریک تھے اور ایک دستہ کی کمان ان کے سپرد تھی۔ حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں مولانا امیر الدین صاحب وغیرہ کے ساتھ کالے پانی پہنچے۔ جہاں منشی محمد جعفر صاحب وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔ صرف دس برس قید کاٹنے کے بعد لارڈ رپن کی سفارش سے رہا کر دیئے گئے۔[1]

(۳) حاجی دین محمد صاحب۔

(۴) حاجی امین الدین صاحب۔ ان پر باغیوں کی اعانت کا الزام تھا۔

(۵) حشم داد خاں۔ پٹنہ کے ایک سوداگر تھے۔ یہ سیشن جج کی عدالت سے رہا ہوئے۔

(۶) پیر محمد۔ ہائی کورٹ سے رہا کر دیئے گئے۔

(۷) امیر خاں۔ اس مقدمہ کے خاص ہیرو ہیں۔ یہ پٹنہ، محلہ عالم گنج کے رہنے والے تھے۔ گرفتاری کے وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔[2] ان کا چمڑے کا کاروبار

---

[1] تواریخ عجیب ص۸۷۔ [2] پہلی اسلامی تحریک ص۱۳۶۔

Marfat.com

بنگال و بہار میں پھیلا ہوا تھا۔ کروڑپتی تاجر سمجھے جاتے تھے۔ انگریز تاجر بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۹ء کو ایک بجے بغیر کسی قانونی وارنٹ کے جائے قیام کولوٹولہ (کلکتہ) سے گرفتار کئے گئے۔ اُن کو "ہوڑے" لایا گیا۔ پھر گیا (صوبہ بہار) پہنچا دیا گیا۔ جہاں ۳ر اگست ۱۸۶۹ء تک رہے۔ پھر اُن کو علی پور جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمر رسیدہ قیدی (امیر خاں صاحب) سید صاحب شہید یا مولانا ولایت علی صاحب سے بیعت تھے۔ جہاد کے کاموں میں روپے سے مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقمیں باقاعدہ ادا کرتے تھے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتیں وہ بسا اوقات اُنہیں کے کلکتہ والے فرم کے ذریعہ پٹنہ اور پنجاب بھیجی جاتی تھیں۔ مگر بایں ہمہ جو سزا اُن کو دی گئی، وہ اُن کے جُرم سے کہیں زیادہ تھی اور باوجودیکہ اس مقدمہ کے ۱۳۶ سرکاری گواہوں میں ۱۱۳ خاص امیر خاں صاحب کے برخلاف پیش کئے گئے۔ مگر پھر بھی قانون دانوں کی نظر میں ثبوت ناکافی رہا۔ کیونکہ گواہوں نے قیدیوں کے بارے میں بہت کم کہا[۱]۔ ایک شریف انگریز بیرسٹر نے تو مقدمہ کی پیروی اس لئے چھوڑ دی کہ اس کی کارروائی شرم ناک تھی[۲]۔ ملزم کو گرفتار کلکتہ میں کیا گیا مگر مقدمہ پٹنہ میں پیش ہوا[۳]۔ کیونکہ کلکتہ میں سرکاری حلقوں کے من مانے فیصلے کا امکان بہت کم تھا[۴]۔

سزا انصاف پرور فاضل ججوں نے جن کا قلم خاص خاص اشاروں کے مطابق حرکت کر رہا تھا، صرف حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پر اکتفا نہیں کی بلکہ پوری جائداد بھی ضبط کر لی۔ جس کا تخمینہ اُس زمانہ کے نرخوں کے لحاظ سے کروڑوں روپیہ تھا۔

حریف سے تاوان جنگ وصول کرنا یورپ کا عام طریقہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں یہ جدت کی کہ صرف دشمنوں سے تاوانِ جنگ وصول نہیں کیا بلکہ

---

[۱] مسٹر ای۔ رہسٹک۔ اسلامی تحریک ص۱۳۵ و ص۱۳۹۔ [۲] مسٹر انسٹی بیرسٹر بمبئی جو امیر خاں ملزم کی طرف سے پیش ہوا تھا۔ [۳] اسلامی تحریک ص۱۳۸۔ [۴] ایضاً ص۱۳۹۔

Marfat.com

اُن دوستوں سے بھی خرچۂ جنگ کے نام پر بڑی بڑی رقمیں اور مُلک کے بڑے بڑے حصّے اینٹھ لئے جن کی مدد کے لئے اس کو بھی فوج بھیجنی پڑی تھی۔

یہ رسوائے عالم حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو چکی تھی۔ اب ملکہ وکٹوریہ کی باضابطہ اور مہذّب حکومت قائم تھی۔ مگر اس مہذّب حکومت کے ایجنٹوں نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کو زندہ رکھنا ضروری سمجھا اور بقول مولانا محمد جعفر صاحب اس تحریک کو ختم کرنے کی جدّوجہد میں جو کچھ صرف ہُوا تھا، وہ تنہا امیر خاں صاحب کی غیر معمولی جائداد سے وصول کر لیا۔ اس کے علاوہ علماء صادق پور وغیرہ کی املاک اور جائدادوں کی ضبطی سے جو کچھ وصول ہوا، وہ سود در سود۔ اور کارکنانِ حکومت کے لئے مالِ غنیمت تھا۔

چار سال بعد امیر خاں صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ مگر ضبط شدہ جائداد کا ایک حبہ بھی واپس نہیں کیا گیا۔ مولانا محمد جعفر صاحب نے دل کا غبار نکالنے کیلئے محمد شفیع صاحب (ملزم مقدمۂ سازش انبالہ) کے معاملہ میں جو اعتراض کیا تھا وہی اعتراض امیر خاں صاحب کے معاملہ میں بھی کیا۔

"امیر خاں اگر مجرم نہیں تھے تو یہ شورا شوری اور یہ ہنگامۂ محشر آفریں کیوں کیا گیا۔ اور اگر واقعی اُن کا جُرم اتنا بڑا تھا تو پھر چار سال بعد اُن کو رہا کیوں کر دیا گیا۔[1]

مگر مولانا محمد جعفر صاحب کو شاید معلوم نہیں تھا یا تعصّب میں بُھول گئے تھے کہ انگریزوں کی مہذّب و متمدّن حکومت سزا کی حالت میں کسی قیدی کا مرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ سن رسیدہ بوڑھا قیدی[2] صرف ۷، یا ۸ سال کی قلیل مدت میں

---

[1] امیر خاں ۱۸۷۹ء میں رہا کئے گئے۔ رسالہ اشاعت السنہ جلد ۱۲/۵ میں رہائی کا ۱۸۷۸ء تحریر کیا گیا۔ بہر حال مدّتِ سزا چار سال نہیں بلکہ ۷، یا ۸ سال ہوتی ہے۔ [2] بار بار اپیل اور "ہیبس کورپس" کے نتیجہ میں مہربان گورنمنٹ نے صرف یہ عنایت فرمائی کہ ان کو انڈمان نہیں بھیجا بلکہ ہندوستان ہی کے جیل خانہ میں رکھا گیا۔ اسلامی تحریک صفحہ ۱۴۲۔

Marfat.com

جب جاں بلب ہوگیا تو (۱۸۷۹ء میں) اس کو رہا کرنا ضروری سمجھا گیا تاکہ برطانیہ کی گردن نازک پر مرگ ناحق کا بار نہ ہو، اور موت کی آخری رسومات اُس کے وارث انجام دے سکیں۔ چنانچہ رہائی کے ایک دو روز بعد انتقال ہوگیا[1]

سفینۂ حکومت کے ناخداؤں نے اس تحریک کو ختم کرنے اور گرفتاران بلا کو سزایاب کرنے کے لئے جو بے ضابطگی اور دستور و آئین کی خلاف ورزی کی اُس کی داستان دُہرانی بے سُود ہے۔ کیونکہ بتانا یہ ہے کہ کیا ہوا۔ یہ بحث کہ جو بہانہ تراشا گیا۔ وہ کہاں تک قرین انصاف تھا۔ بحث سے خارج ہے۔ لہٰذا نہ ہمیں اس نقطہ پر خامہ فرسائی کی ضرورت ہے، اور نہ حضرات ناظرین کے لئے ہم یہ کاوش پسند کرتے ہیں۔

رودادِ مقدمہ ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ کی یہ خصوصیت بھی ظاہر کر دی جائے کہ اس کے متعدد ملزم صرف اسی مرتبہ نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی بار بار گرفتار ہو چکے تھے۔ چنانچہ

(۱) مولانا مبارک علی صاحب مشتبہ خطوط کے سلسلہ میں ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۴ھ میں گرفتار کئے گئے۔

(۲) حاجی دین محمدؒ پیر محمدؒ اور مولانا تبارک علی صاحبان ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں مختلف وارنٹوں کے تحت گرفتار کئے گئے اور بار بار ممالک مغربی و شمالی کی جیلوں میں منتقل کئے گئے۔

(۳) مولانا مبارک علی، مولانا تبارک علی، امین الدین، اور حاجی دین محمد صاحبان ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء میں شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں رہا ہوئے اور پھر اس آخری مقدمہ سازش کے لئے پکڑ لئے گئے۔

(۴) امیر خاں صاحب پہلے پہل ۱۸۶۴ء (رمضان ۱۲۸۰ھ) میں مقدمہ انبالہ

---

[1] ماخوذ از اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۹ و صفحہ ۱۳۴۔

Marfat.com

کے دوران گرفتار کئے گئے۔ پھر ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ پھر ۱۰ ر جولائی ۱۸۶۹ء (ربیع الاوّل ۱۲۸۶ھ) کو گرفتار کئے گئے۔ اور یکم مئی ۱۸۷۱ء تک (جب کہ ان کا مقدمہ پٹنہ میں شروع ہوا) کسی قانونی وارنٹ کے بغیر صرف گورنر جنرل کی مرضی پر قید رکھے گئے۔

مقدمات کی بحث ختم کرتے وقت دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:

(۱) دار و گیر اور گرفتاریوں کا یہ سلسلہ ۱۸۶۳ء میں شروع کیا گیا۔ ۱۸۶۸ء تک ایک طرف گرفتاریوں اور سزاؤں کا سلسلہ جاری رہا اور دوسری جانب تحریک اپنی پوری قوت سے چلتی رہی۔ (ملاحظہ ہو ہنٹر کی کتاب کے اقتباسات جو مقدمہ سازش مالدہ کے زیرِ عنوان گذر چکے ہیں)۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۳ء میں صرف چھ سال کا فاصلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں عام ہندوستانیوں بالخصوص حریت پسند مسلمانوں پر جس ہولناک وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا چار پانچ نسلیں گذر چکنے کے بعد آج تک بھی دماغ اُن سے متاثر اور مظالم کی داستانیں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں اگرچہ دستوری اور آئینی طور پر حکومت بدل چکی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا واسطہ ختم ہو کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی مگر حکمران وہی تھے۔ مشین کے پرزوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی وہی سفید فام درندے اقتدار کے مالک تھے اور وہی سیاہ فام ہندوستانی اُن کے شکار تھے۔ مگر یہ ہولناک مظالم، اس جماعت کے عزائم اور ارادوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ تحریک کی وہی شدت[1]

---

[1] ۱۸۷۱ء میں مسٹر ہنٹر نے لکھا تھا "سالہا سال سے سرحد کے مجاہدین کی نو آبادی ہماری سرحد پر چھاپے مار رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ متعصب لوگوں کے گروہ کو بھیج دیتی ہے جو ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور ہمارے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری فوج اُن کے ساتھ تین تباہ کن لڑائیاں لڑ چکی ہے۔ اس مخالف نو آبادی کے لئے نہایت ہی منظم طریقہ پر بنگال میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں، اور یکے بعد دیگرے مختلف سازشی مقدمات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ سازش کا یہ جال ہمارے تمام صوبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ پنجاب سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

باقی رہی۔ بلکہ اُس کی جارحانہ کارروائی پہلے سے زیادہ ہوگئی۔[1] بڑی سے بڑی کمزوری یہ ظاہر ہوئی کہ کچھ افراد وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور ہو گئے۔ مگر جب ان کارروائیوں کا خیال کیا جاتا ہے جو وعدہ معاف گواہ بنانے کے لئے عمل میں لائی جاتی تھیں تو غصّے کے بجائے ان غریبوں کی حالت پر ترس آتا ہے۔ خدا جانے کیسی کیسی سختیوں اور دھمکیوں کے بعد یہ غریب اس گناہ پر آمادہ کئے گئے ہوں گے۔

(۲) مذکورہ بالا گرفتاران بلا وہ ہیں جن پر خاص طور سے سازش کے مقدّمات چلائے گئے اور اس وجہ سے اُن کے نام محفوظ رہ گئے۔ لیکن وہ ہزاروں گرفتاران بلا جو اندھا دھند گرفتاریوں کی عام وبا میں گرفتار ہوئے، اُن کے ناموں کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے اور پتہ چلا کر کسی کتاب کا جزو بنانا بھی مشکل۔ اس کے اندازے کے لئے مسٹر ہنٹر کے کچھ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) پرے کا کوہستانی غیر آباد علاقہ گرم ملک کی اُن دلدلوں سے جہاں دریائے گنگا سمندر میں جا کر گرتا ہے، اس قسم کے مسلسل سازشی اداروں سے ملا ہوا ہے ان مقدمات سے ایسے سازشی اداروں کا بھی پتہ چلا ہے جو گنگا کے دہانے سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ روپیہ اور آدمی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ہماری جرنیلی سڑک پر منزل بہ منزل گذارتے ہوئے باغی کیمپ میں پہنچا دیتے ہیں جو یہاں سے دو ہزار میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصّہ لے رہے ہیں اور روپیہ پہنچانے کے طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک نہایت ہی خطرناک کام ہے۔ کمال ہوشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا ہے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۷ و ص۱۸)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] بہرحال تاریخ کی یہ بات دُہرا دینا ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ہولناک سزائیں بھی مسلمانوں کے دماغوں سے بغاوت کے جراثیم ختم نہ کر سکیں۔ ۱۸۷۱ء میں مسٹر ہنٹر نے لکھا تھا۔ اب تک یہ (مجاہدین اور اُن کا کیمپ) ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی اُمید کا مرکز بنا ہوا ہے ...... ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے ڈر نہیں۔ اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے جن کو یہ غدار (مجاہدین) ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کرتے ہیں (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۶۴ و ص۶۵)

Marfat.com

بیانات پہلے گذر چکے ہیں - ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"بنگال جیسے دور دراز صوبے نے اپنے خرچ پر سرحدی کیمپ کے لئے زنگروٹوں کے گروہ کے گروہ تیار کئے۔ اس کے ہر گاؤں بلکہ ہر خاندان نے اُن کی مثال کی پیروی کی اور مصارفِ جنگ میں حصّہ لیا۔ ان بدنصیب بہکائے ہوئے غداروں کے گروہ کے گروہ ہم نے قید خانوں میں ڈال دیئے اور عدالتوں نے یکے بعد دیگرے ان کے سرغنوں کو سمندر پار کے بے آب و گیاہ جزیروں میں بھیج دیا۔ لیکن اس کے باوجود سارے مُلک نے ہماری سرحد پر اسلام کی بے کسانہ اُمیدوں کی آبیاری روپیہ اور آدمیوں سے کی۔ بلکہ اب تک عیسائی حکومت کے خلاف خونی احتجاج پر مصر ہے۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۷۶)

گرفتارانِ بلا کے مصائب

بے پناہ جذبۂ انتقام اور بے مثال صبر و استقامت

کشتگانِ خنجرِ تسلیم کے قصّے دردناک ہیں مگر مختصر۔ کسی کو چند سیکنڈ یا منٹ لگے اور کسی کو چند گھنٹے۔ بہت سے بہت چند دن، خون آلود زخموں کی اذیت برداشت کر کے عالمِ بقا کی راہ لی اور دعاءِ مغفرت کے مستحق ہو گئے۔ رضی اللہ عنہم۔

لیکن وہ گرفتارانِ بلا جو داغِ ناکامی کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ زندگی کا آخری نصب العین "شہادت" بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی داستان زندگی طویل بھی ہے اور دلخراش اور حسرتناک بھی۔ سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے اور لکھنے کے لئے ایسا قلم چاہیے، جو آشنائے درد ہو۔

دستوری حکومتوں کی اصلاحات نے جیل خانہ کی ہولناکیوں میں کچھ کمی کر دی،

Marfat.com

ہے اور سیاسی قیدیوں کے لئے تو جیل خانہ صرف خلوت کدہ رہ گیا ہے مگر گفتگو اس زمانہ کی ہے جو موجودہ ترقیات سے ایک صدی پیچھے تھا۔ جس زمانہ میں سفید فام متعصب درندوں کی زبان، آئین تھی۔ اور اُن کے خود غرضانہ اور خود پرستانہ ارادوں کو قانون کی شکل دے دی جاتی تھی۔ اس وقت آہنی پنجرے، بیڑی، ڈنڈا، وغیرہ سب کچھ تھا۔ غذا اور مشقت کے بارے میں سیاسی اور اخلاقی قیدی یکساں درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ یورپین اور اینگلو انڈین افسروں کا رویّہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ زیادہ دل آزار، توہین آمیز اور معاندانہ ہوتا تھا۔ مثال اور نمونہ کے لئے چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

حوالات جو جیل خانہ نہیں، بلکہ جیل خانہ کی تمہید ہوتی ہے، اس کی سرگذشت ایک حوالاتی (مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری) کے الفاظ میں یہ ہے:

"ہر ایک علیحدہ علیحدہ کوٹھری میں جس کو سنگین کوٹھری کہتے ہیں، بند کر دیئے گئے۔ وہ کوٹھری پانچ فٹ لانبی اور چار فٹ چوڑی ہوگی اور چھت اس کی نہایت بلند، اور اُوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشندان تھا کہ آدمی اس میں سانس لے سکے، نہایت تنگ و تاریک تھی۔ اس کوٹھری میں تقریباً ڈھائی تین مہینے ہم لوگ رہے۔ جملہ گیارہ آدمی تھے۔ شب و روز میں ایک بار اُس کا دروازہ کھلتا تھا اور ایک جمعدار اور تین سپاہی اور اُن کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتی، اور ایک سقّہ جس کی مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملا لئے ہوئے آتا اور ہر ایک کوٹھری کو کھولتا۔ باورچی دو روٹیاں اور کچھ دال دے دیتا اور سقّہ ایک کوزہ پانی دے دیتا اور بھنگی گملا صاف کر دیتا، اور پھر یہ لوگ چلے جاتے۔

جو جو تکلیفیں اس میں گذریں، اُن کا بیان طول ہے اور فضول۔

بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا۔ اس وقت ہم گیارہ آدمی قبروں سے نکال کر حوالات کی ایک بارک میں جمع کر دیئے گئے۔ بعد تین مہینے کے ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی، از حد خوشی ہوئی۔[۱]

یہ رہائش کی کیفیت تھی۔ اب خوراک ملاحظہ فرمایئے۔ ایک دوسرے حوالاتی مولانا محمد جعفر تھانیسری کی تحریر ہے:

"دو روٹی اور تھوڑا سا ساگ۔ ساگ میں موٹے موٹے ڈنٹھلوں کے سوا پتی کا نام نہ تھا۔ روٹیوں میں قریب چوتھائی کے بالو اور مٹی ملی ہوئی۔"[۲]

ایک دفعہ جیل خانے میں وبائی بخار پھیل گیا۔ قیدیوں کو اس سے نجات ملی، تو مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری کا بیان ہے:

"اس قدر بھوک کا غلبہ ہم سب لوگوں کو رہتا کہ دو روٹیاں سرکار سے ملتی تھیں۔ اُن کے کھانے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ جیل میں جس قدر گھاس تھی مع بیخ (جڑ) اکھاڑ کر قیدی چٹ کر گئے۔ ہر طرف سے الجوع الجوع ہائے بھوک ہائے بھوک، کا شور تھا۔"[۳]

۱؎ پھانسی کے مجرمین کے ساتھ انگریزی دور میں آخر تک یہی طرزِ عمل رہا۔ کوٹھڑیوں کی ساخت میں کہیں کہیں فرق کر دیا گیا۔ مثلاً یہ کہ پشت کی طرف بھی آہنی جنگلا لگا دیا گیا۔ پھانسی گھر کی کوٹھڑیوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ دروازہ کا آہنی جنگلا ایسا رکھا جاتا تھا کہ سنتری کی نظر ہر ایک گوشہ پر پڑتی رہے۔ تاکہ ملزم کسی گوشہ میں چھپ کر خودکشی جیسے جرم کا ارتکاب نہ کر سکے۔ پاخانہ، پیشاب سب کچھ اسی کوٹھڑی میں کرنا پڑتا۔ جس میں پردہ کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ ۲؎ تواریخ عجیب ص۱۵۔ ۳؎ الدر المنثور ص۷۳۔

ایک طرف مفتوح اور مغلوب مسلمانوں کو فنا کر دینے کا یہ جذبہ کہ بقول ہنٹر:

"اعلیٰ حکام اُن کی ہستی تسلیم کرنے کو بھی تیار نہ تھے"۔[1]

اور دوسری طرف ان فدا کارانِ حریت، محبانِ وطن کی یہ جرأت کہ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں اور لاکھوں خاندانوں کی تباہی و بربادی کے بعد بھی شمالی مغربی سرحد پر مورچہ قائم کئے ہوئے انگریزی فوجوں کا قلع قمع اور انگریزی کمانڈروں کے دانت کھٹے کر رہے ہیں۔ اگر یورپ کی کوئی سفید فام قوم اس جرأت اور اس غیرت و حمیت سے کام لیتی تو اُس کے جنگی قیدیوں کا احترام کیا جاتا۔ عمدہ قسم کی غذا، پھل اور بہتر ضروریاتِ زندگی اُن کے لئے فراہم کی جاتیں، اور اگر کوئی مشقت بھی تجویز کی جاتی تو تہذیب و انسانیت کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکالا جاتا۔ مگر یہاں معاملہ گوروں اور کالوں، آقاؤں اور خود ساختہ غلاموں کا تھا۔ ادب و احترام یا تہذیب و انسانیت تو درکنار، صورتِ حال یہ تھی کہ بقول مولانا عبدالرحیم صاحب و مولانا محمد جعفر صاحب:

"تمام ضابطے اور قانون بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے"۔[2]

"جو کارروائیاں کی گئیں، اُن کو دیکھ کر غیر جانب دار انگریز بھی انگشت بدنداں ہوتے"۔[3]

"امیر خاں صاحب نے اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے بمبئی کے مشہور بیرسٹر اینسٹے کو وکیل کیا۔ وہ دو ایک پیشی پر حاضر ہوا۔ پھر بمبئی واپس چلا گیا اور معذرت کر دی کہ اس مقدمہ کی کارروائیاں ایسی شرمناک ہیں کہ کوئی شریف انسان برداشت نہیں کر سکتا"۔[4]

یہ بہادر اور انگریز کے حق میں دیدہ دلیر مسلمان، تہذیب کے بجائے وحشیانہ سزاؤں کے مستحق گردانے گئے۔ ہندوستانی ملازم اگر کسی قدر نرمی بھی برتتے تو یورپین

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۴۳۔ [2] تواریخ عجیب صفحہ ۲۰۔ [3] الدر المنثور صفحہ ۷۔
[4] E. Rehatsek بحوالہ پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۸۔

Marfat.com

افسر دل کھول کر وحشت و بربریت کا تختۂ مشق بناتے۔ چنانچہ جب ان اسیران بلا کو لاہور منتقل کیا گیا اور سنٹرل جیل کے پھاٹک کے سامنے لائن لگا کر ان کو بٹھا دیا گیا تو کشمیری ہندو داروغۂ جیل نے کسی قدر افسوس کیا۔ مگر جب ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل تشریف لائے تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ان قیدیوں کو غضب آلود نظر سے دیکھا۔ پھر

"بڑے غصّے سے حکم دیا کہ ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہوئے۔ اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ پانچ انچ سے زیادہ لمبا نہ تھا، ڈال دیا گیا"[1]

مولانا محمدؒ جعفر صاحب فرماتے ہیں:

"یہ حکم از راہِ تعصب فقط ہم لوگوں کے واسطے ہی تھا۔ تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہوگیا، اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا"[2]

یہ لاہور جیل کا عطیہ تھا۔ انڈمان جاتے ہوئے ملتان اور کراچی کے درمیان ایک اور زنجیر کا اضافہ ہوا۔

"اور سوائے بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی آہنی زنجیر بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں پھنسائی گئی کہ جس سے اپنی اپنی جگہ سے کوئی ہل نہیں سکتا تھا۔ جب تک ہم جہاز پر رہے، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اس وقت قریب قریب آدھا آدھا من کے

---

[1] تواریخ عجیب ص۴۲۔ [2] ایضاً ص۴۲۔

لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود پانی کی اس کثرت کے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا، ہم پڑے پڑے تیمّم سے نماز پڑھتے تھے"۔[1]

کراچی سے آگے بھی جہاز کی روئداد کچھ کم دل خراش نہیں۔ مولانا عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"جب میرا جہاز سیلون کے سمندر میں پہنچا، نہایت سخت طوفان کا سامنا ہوا۔ جملہ قیدی جہاز کے نیچے "تو تنگ" میں ایک کٹگرہ جو مانند "پنجرہ شیر" تھا، نہایت بے رحمی کے ساتھ بند کر دیئے گئے۔ ہر ایک کو دوران سر اور دست و قے جاری تھا۔ یہ غلاظت اور پاخانہ و پیشاب مل کر ایک تالاب کی سی کیفیت اس "تو تنگ" کی ہو گئی تھی۔ اس میں شب و روز رہنا پڑتا تھا۔ میں اپنی نماز پنج وقتی اس نجس حالت میں بلا وضو و تیمّم کسی طور پر ادا کر لیتا تھا"۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت "یعظم عظیم کل قوم" زعیم قوم کی تعظیم کیا کرتے تھے، رفتہ رفتہ مہذّب حکومتوں کا دستور العمل بن گئی ہے۔ چنانچہ سیاسی رہنماؤں کو جیل خانوں میں بھی خاص خاص رعایتیں دی جاتی ہیں انکو مشقّت بھی اگر دی جاتی ہے تو ایسی نرم اور سہل جو اُن کی بدنی اور دماغی صحت پر بُرا اثر

---

[1] تواریخ عجیب ص۴۷۔ [2] الدر المنثور ص۱۶۷۔ مولانا عبدالرحیم صاحب اگرچہ مقدمہ سازش انبالہ میں مولانا یحییٰ علی صاحب اور مولانا محمد جعفر صاحب وغیرہ کے ساتھ تھے۔ مگر جب ان ملزمین کو انبالہ جیل سے لاہور منتقل کیا جا رہا تھا تو اُن کو (مولانا عبدالرحیم صاحب کو) انبالہ جیل ہی میں روک لیا گیا تھا تاکہ اُن کے ذریعہ مولانا عبداللہ صاحب سے (امیر لشکر مجاہدین سے جو اُن کے چچازاد بھائی تھے) صلح کی بات چیت کی جائے اس کے علاوہ تنفس کی بھی آتنی شدت تھی کہ ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہیں دی تھی۔ گفتگوئے صلح میں واسطہ بننے سے مولانا عبدالرحیم صاحب نے انکار کیا تو اُن کو بھی انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس بہانہ سے یہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے جُدا ہو گئے اور دو سال بعد انڈمان پہنچ کر ملاقات ہو سکی۔ (ملاحظہ ہو الدر المنثور ص۴۷)

Marfat.com

نہ ڈالے مگر ان محبّانِ وطن کے حق میں معاملہ برعکس تھا۔ ان کے واجب الاحترام رہنما مولانا یحییٰ علی صاحب جو بلاشبہ لاکھوں حریت پسندوں کے سرتاج تھے، اُن کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اُس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کے رفیقِ جیل کا چشم دید بیان ہے:

"(سزا کا حکم ہونے کے بعد اگلے روز) صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس جیل میں آئے اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا کو سخت تر مشقت دی جائے۔ چنانچہ خود اُس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا اور آٹھ دس آدمی اس رہٹ کو عین تمازتِ آفتاب میں چلا رہے تھے، اور وہ بمشکل چلتا تھا، آپ کو بھی اُسی میں دے دیا۔ آپ دو تین روز تک تمام روز اُسی کو چلاتے رہے۔ آپ کو بباعثِ حرارتِ آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا آپ نہایت صبر و شکر کے ساتھ اس کو انجام دیتے رہے۔ دوسرے قیدی جو نہایت قوی اور توانا تھے۔ اس رہٹ کو کھینچتے کھینچتے تھک کر بیٹھ جاتے مگر آپ صبح سے شام تک اُس میں لگے ہی رہتے تھے"[1]

---

[1] الدر المنثور صہ ۷۲۔ اس مشقت سے نجات پانے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں "چونکہ اس وقت (جب یہ مشقت مولانا کو سپرد کی گئی) ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے۔ مجسٹریٹ صاحب نے یہ کارروائی اپنے دل کا غصہ نکالنے کو کر لی۔ جب ڈاکٹر صاحب دو تین روز کے بعد جیل میں آئے اور نو آمد قیدیوں کا ملاحظہ کیا۔ مولانا موصوف کو رہٹ کے کام میں دیکھ کر داروغہ پر نہایت خفا ہوئے ۔۔۔۔۔۔ داروغہ نے عرض کیا کہ مجسٹریٹ صاحب خود آ کر لگا گئے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان چشمک تھی فی الفور آپ کو وہاں سے چھڑوا کر برعکس اس کے ایک نہایت آسان کام میں لگا دیا۔ یعنی دری بافی کے کارخانہ میں سُوت سلجھانے کا کام آپ کے سپرد کر دیا۔ جو سایہ میں چھت کے نیچے بیٹھ کر انجام دیتے تھے (الدر المنثور صہ ۷۲)

Marfat.com

یہ آپ کی دیانت تھی کہ مشقت میں اپنی طرف سے کوتاہی روا نہ رکھی۔ تاکہ جیل کی خوراک اکل حلال ہو، اور کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

بے نظیر صبر و استقلال اور چیلنجانہ میں ان بزرگوں کے مشاغل!

یہ مصائب کے چند نمونے تھے۔ اب ان بزرگوں کے صبر و استقلال کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مولانا محمد جعفر صاحب کو سرکاری گواہ بنانے کے شوق میں جس طرح بارہ گھنٹہ پیٹا گیا، اس کا مختصر تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔

مولانا محمد جعفر صاحب اپنے شہر کے نمبردار اور باوضع رئیس تھے۔ پیشہ بھی باعزت یعنی قانون دانی اور مقدمات کی پیروی و عرائض نویسی۔ خود اپنی سوانح میں تحریر فرماتے ہیں:

"بیسیوں آدمی میری رعیت تھے۔ ایسے بڑے شہر کا نمبردار گھوڑے اور گاڑیوں پر سوار ہوا پھرتا تھا۔ ہر کام کیلئے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے"۔

ایسے باوضع، باعزت، نستعلیق رئیس کے لئے مار پیٹ کی دھمکی بھی کافی تھی [۱] مگر آفریں، صد آفریں، کہ نہ پہلے روز کی خوشامد اس بامروت و شرافت پسند رئیس کو رام کر سکی۔ اور نہ اگلے روز صبح سے رات گئے تک بوٹ کی ٹھوکروں، بید اور ڈنڈوں کی مار دھاڑ اس کوہ استقلال کے پائے استقامت میں لغزش پیدا کر سکی۔

(۲) اس صبر و استقامت کے ساتھ ذوقِ خدا پرستی ملاحظہ ہو:

"اوّل روز جب ہم لوگ اجلاس پر حاضر کئے گئے اور وقت نماز ظہر کا آیا۔ ہم لوگوں نے درخواست کی کہ ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت ملے کہ کچہری سے باہر جا کر وضو کر کے نماز پڑھ کر اپنی جگہ پر آئیں۔

۱ے تواریخ عجیب صفحہ ۲۸

Marfat.com

صاحب مجسٹریٹ نے فرمایا۔ تم لوگوں کے لئے مقدمہ ملتوی نہیں کیا جائے گا۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ ہم لوگوں کا مطلب یہ نہیں، کہ آپ مقدمہ کو ملتوی رکھیں بلکہ آپ جس طور پر اظہار گواہان لے رہے ہیں اور کارروائی کر رہے ہیں، سب اُسی طرح کرتے رہیں۔ ہماری غیر حاضری کے وقت گواہوں کا اظہار نہ سُننے کی وجہ سے جو کچھ نقصان ہوگا، اُس کی ذمہ داری خود ہمارے اُوپر ہوگی۔ ہم اس نقصان کو بخوشی برداشت کرتے ہیں مگر نماز قضا نہیں کر سکتے۔ اس پر صاحب نے غصّہ ہو کر اور جِھلّا کر فرمایا کہ تم لوگ باہر نہیں جانے پاؤ گے۔ ہم نے کہا۔ بہت خوب! اور فی الفور زمین پر تیمّم کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور مولانا اور ہم دس آدمیوں نے جماعت سے نماز شروع کر دی۔ دو سو مسلح جوان پلٹن اور پولیس کے بندوقیں بھرے ہوئے اور سنگینیں چڑھائے واسطے حفاظت ہم لوگوں کے منتظر حکم پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ تماشہ بین اور اخبارات کے نامہ نگار وغیرہ مقدمہ کی کیفیت دیکھنے اور سُننے کے لئے جمع تھے۔

اُس وقت کا نظارہ بھی عجیب و غریب تھا۔ بجز خدائے غالب کے کسی کا خوف و خطر دل پر نہیں تھا۔ دو تین روز ہم لوگوں نے نماز ظہر اسی طرح ادا کی، اور عصر کی نماز بالکل آخر وقت میں کچہری سے واپسی کے وقت ادا کرتے تھے۔ جب مجسٹریٹ نے دیکھا کہ عین اجلاس میں سلسلۂ نماز و جماعت شروع ہو گیا۔ تو بالآخر حکم دیا کہ ایک ایک آدمی کو دو سپاہیوں اور ایک نائک کی حفاظت میں باہر لے جایا جائے اور کچہری کے متصل باغ میں نماز پڑھوا کر واپس لے آیا جائے۔ تب ہم لوگ تمام ایام دوران مقدمہ میں

Marfat.com

نماز ظہر اس طرح ادا کرتے رہے کہ ایک آدمی جاتا اور جب وہ واپس آلیتا، تب دوسرا آدمی جاتا تھا"۔[1]

(۳) **سزائے موت کا خیر مقدم اور سزا میں تبدیلی** یہ قصہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ خود صاحبِ قصہ سے سُنئے۔ مولانا محمد جعفر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"جج صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

تم بہت عقل مند، ذی علم، قانون دان، اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس تھے۔ تم نے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی سرکار کی مخالفت میں خرچ کی۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا، اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی، اس واسطے تم کو پھانسی دی جاوے گی۔ اور تمہاری کُل جائداد ضبط سرکار ہوگی، اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جائے گی، اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا (دیکھ کر) بہت خوش ہوں گا"۔

سزائے موت کا خیر مقدم کس مسرت و شادمانی سے کیا گیا۔ اس کا ذکر تو آگے آئے گا۔ بطور جملہ معترضہ ایک گفتگو سُن لیجئے۔

مولانا موصوف کا ارشاد ہے:

"یہ سارا بیان صاحب موصوف کا میں نے نہایت سکون سے سُنا مگر اس آخری فقرہ کے جواب میں میں نے کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت

---

[1] الدر المنثور صـ۶۹

قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔ لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کے حکم سے زیادہ اور میرا کیا کر سکتا تھا۔ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں سب دے چکا تھا۔ لیکن اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو اس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم دینے کے تھوڑے عرصہ بعد ناگہانی موت سے راہئ ملک عدم ہوا۔"[1]

حاکم اور محکوم کے درمیان تبادلۂ موت کے اس دلچسپ قصہ کے بعد پھانسی کے ریشمین پھندے کا بھی عجیب و غریب لطیفہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا محمد جعفر صاحبؒ کا بیان ہے:

"اس حکم کے بعد ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے نئی پھانسیاں اور اُن کے ریشمین رسّے تیار ہوئے، اور بوجہ میرے بھاری مجرم[2] ہونے کے میرے واسطے ایک ریشمین رسّہ اور پھانسی کی لکڑی خاص طور پر نہایت مضبوط تیار کی گئی۔ مگر تقدیر کی زبردستی سے میری پھانسی تو موقوف ہو گئی۔ اس اثناء میں بجرم قتل ایک خاص ولایت کے انگلش مین گورے کو پھانسی کا حکم ملا، اور وہ سب سامان پھانسی جو میرے واسطے تیار ہوا تھا، اُس بے چارے یورپین ہم قوم کے نصیب ہوا۔ "چاہ کندہ را چاہ در پیش"۔

جو رسّہ بڑے اہتمام سے میرے گلے میں ڈالنے کے واسطے تیار ہوا تھا، اس قادرِ مطلق، مقلب القلوب نے ایک ذات

---

[1] تواریخ عجیب ص۲۸ و ص۲۹۔ [2] تواریخ عجیب کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں "بھاری مجرم" کا لفظ ہے۔ بظاہر یہ غلط ہے کیونکہ مجرم سب یکساں تھے۔ ایک ہی دفعہ میں سب ماخوذ تھے۔ اس کے علاوہ جرم کی بناء پر خاص قسم کے ریشمین پھندے کا قاعدہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے بظاہر "بھر کم" کے بجائے کاتب صاحب نے "مجرم" لکھ دیا ہے۔

Marfat.com

برادری کے بھائی کے گلے میں ڈلوایا اور مجھ کو صاف بچالیا۔ اس واقعۂ عجیبہ کے بعد لوگ اس اسرارِ الٰہی کو ایک بڑی آیات الٰہی سے (قدرت کا معجزہ) سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے بعد پھانسی اُس گورے کے وہ رسّہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تبرّکاً لوگوں میں تقسیم ہو گیا۔[1]

ان معترضہ جملوں کے بعد خیر مقدم کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

مولانا تھانیسری کا بیان ہے:

"مجھ کو اپنی اُس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا خوش ہوا تھا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ میرے بعد مولانا یحییٰ علی صاحب کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ میں نے مولانا یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا (مقدمہ کے باقی ملزمین[2] کو عبور دریائے شور کا حکم سنایا) اُس دن پولیس والے اور تماشہ بین مرد اور عورت بکثرت حاضر تھے ضلع انبالہ کی کچہری کا تقریباً تمام احاطہ بھرا ہوا تھا۔ پولیس کپتان "پارسن" میرے پاس آکر کہنے لگا۔ "تم کو پھانسی کا حکم ہوا ہے، تم کو رونا چاہیئے، تم کس واسطے اتنا بشاش ہے"۔ میں نے اُس کو چلتے چلتے بولا کہ "شہادت کی اُمید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو"۔

۲ مئی ۱۸۶۴ء سے (پھانسی کا حکم سنانے کی تاریخ سے) ۱۶ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ اہالیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے

---

[1] تواریخ عجیب ص ۳۵ - [2] محمد شفیع صاحب سوداگر چرم کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا مگر وہ وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے۔ لہٰذا اس فہرست سے خارج ہیں۔ محمد میاں

Marfat.com

تھے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آئے تھے۔ مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پاکر یورپین زائرین بہت تعجب کرتے۔ اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہوگی، تم خوشی کس واسطے کرتے ہو؟ ہم اس کے جواب میں صرف اسی قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجۂ شہادت ملتا ہے اس واسطے ہم کو خوشی ہے[1]

سزا میں تبدیلی یہ تھا پھانسی کے حُکم کا استقبال۔ اب سزا میں تبدیلی کی بھی حیرت انگیز داستان سُنئے۔

مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری فرماتے ہیں:

"اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی سُنئے۔ جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا۔ تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے، یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت "شہادت" جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہیئے بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرنا چاہیئے ...... چنانچہ صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ، ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں آئے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سُنایا کہ تم لوگ پھانسی کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔"[2]

---

[1] تواریخ عجیب صد ۳۲ ـ [2] ایضاً صد ۳۴ و ۳۵۔

Marfat.com

غالباً خود مولانا تھانیسری کا شعر ہے جو حسب حال ہے ؎

مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا[1]
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ڈپٹی کمشنر صاحب نے تبدیلئ سزا کا سبب یہ بیان فرمایا مگر ڈاکٹر ہنٹر اسکی وجہ اور بیان کرتے ہیں اور انگریزی ڈپلومیسی اور اس کی شاطرانہ سیاست ہنٹر صاحب ہی کی توجیہ کو درست اور صحیح قرار دیتی ہے۔

ہنٹر صاحب اپنی کتاب کے آخری صفحات میں تحریر فرماتے ہیں :

"اب تک[2] ہم نے میدانِ جنگ کے سوا کہیں بھی کسی کا خون نہیں گرایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہادت کے شوق نے لوگوں کو وہابیوں کی فوج میں داخل ہونے کی بجائے بہتوں کو اُن سے منحرف کر دیا ہے ......

اگر ان ملزمین کی اصلی سزا پر عمل کیا جاتا تو ہر سال ہزاروں زائرین اُن کی خانقاہ پر زیارت کے لئے جایا کرتے۔ ہر زمانے میں مذہب کے لئے مرنا (معاذ اللہ ہنٹر کے خیال کے بموجب) بدکرداری کی زندگی کو نیک نام کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے ...... حکومت کو ایسی سزا سے احتیاط کرنی چاہیئے، جس کو اس کی مسلمان رعایا شہادت تصوّر کرے"۔

اس باب کو ہم مولانا یحییٰ علی صاحب کے ذکرِ خیر پر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جس طرح ان گرفتارانِ بلا کے قائد و رہنما تھے، اُن کا صبر و استقلال بھی سبق آموز تھا۔ اور قدرتی طور پر اُن کے لئے شدائد و مصائب کا رنگ بھی گاڑھا تھا۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم :

---

[1] تواریخ عجیب ص۳۲ ۔ [2] سفید جھوٹ کی بھی انتہا ہو گئی ۱۸۵۷ء میں جو ہزاروں بیگناہ محض شبہ پر پھانسی پر لٹکا دیئے گئے وہ شاید خون گرانا نہیں تھا، یا ان بے گناہوں کے جسم میں خون ہی نہیں تھا۔

Marfat.com

اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔

سب سے زیادہ ابتلاء اور آزمائش انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے پھر جس قدر افضل ہو، درجہ بدرجہ اُس کے امتحان و آزمائش میں شدت ہوتی رہتی ہے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری، اُن کے قرابت دار تحریک اور نتائج تحریک کے شریک و رفیق ہیں۔ قید و بند کی رفاقت، کھرے کھوٹے کی کسوٹی بھی ہوتی ہے رفاقت میں جب ایک دوسرے کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور عادات و اطوار کو پرکھا جاتا ہے تو بہت سے جگری دوست دشمن بن جاتے ہیں، اور فدا کار معتقدوں کے دلوں سے احترام و عقیدت کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا یحییٰ علی صاحب کے اعلیٰ اخلاق اور بلند ترین کردار کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھیوں نے جتنا آپ کو پرکھا، آپ کو اُتنا ہی زیادہ کھرا پایا۔ اور جتنے آپ کے قریب ہوئے، اُتنے ہی زیادہ آپ کے عقیدت مند اور قدر دان بنے۔

سالہا سال کی جانچ اور پرکھ کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی گرویدگی یہاں تک بڑھ گئی کہ وہ آپ کا نام لینا ہی سوءِ ادب سمجھتے ہیں۔ آپ کے لئے "ہمارے حضرت" یا "جناب حضرت مولانا" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی تحریر کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ گرفتاری کے بعد انبالہ جیل میں پہنچا کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

"اُس وقت جناب حضرت مولانا کا صبر و استقلال قابلِ دید تھا۔ واقعی یہ ہے کہ اگر آپ کا ساتھ ہم لوگوں کا نہ ہوتا، تو قدم ہم لوگوں کے ڈگ جاتے۔ اس کے بعد جب مقدمہ کی پیشی شروع ہوئی

لہ الدر المنثور صـ۳ و صـ۶۸

Marfat.com

تو اجلاس کے وقت جناب مولانا بالکل ساکت یادِ خدا میں مصروف رہتے اور آپ کے ذمّہ کے سوال کا جواب بھی میں ہی دیتا۔"[1]

آپ کی رائے نہیں تھی کہ مقدمہ کی پیروی کی جائے یا کوئی وکیل مقرّر کیا جائے۔ اور بقول مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری اگر دوسرے لوگ اُن کو نہ روکتے، تو وہ نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے۔ مگر اُن کی طبیعت کچھ ایسی سیدھی اور بے عُذر تھی کہ جب اُن سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو بے عُذر اس پر بھی دستخط کر دیئے۔ یہ مقدمہ اور اجلاس کی صورتِ حال تھی خلوت کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

"شب کو میں اور آپ ایک ہی جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسبِ معمول نماز اور دُعا وغیرہ میں مشغول رہتے، اور اکثر اشعارِ عاشقانہ دیوان شاہ نیاز وحافظ وغیرہ کے پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔

ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور وخوش۔ آپ کے چہرے بشرے سے کچھ بھی آثارِ رنج ومحن کے پائے نہ جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر سے بھی جو حضرت خبیب صحابیؓ کا ہے، مترنم ہوتے۔

ولست ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان فی اللہ مصرعی
وذلك فی ذات الالہ وان یشاء
یبارك علی اوصال شلو ممزعی

"جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ

---

[1] الدر المنثور ص ۶۹

Marfat.com

راہِ خدا میں کس پہلو پر میری جان نکلتی ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں ہے وہ چاہے تو پارہ پارہ جسم کے منتشر اعضا میں (زندگی کی) برکت عطا فرما دے۔"

مولانا عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

"میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اس کیفیتِ وجدی و شکر کا ایک شمّہ بھی بیان کر سکوں اور اسکی تصویر کھینچ کر ہدیۂ ناظرین کرنا تو ایک امرِ محال ہے۔"

پھانسی کے حکم کے بعد ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ضبط و تحمّل اور صبر و استقلال کے ساتھ ساتھ مولانا یحییٰ علی صاحب کی خصوصیت یہ تھی:

"جب کوئی پہرہ والا سپاہی یا کوئی اور سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آجاتا، ہندو یا مسلمان سب کو آپ توحیدِ باری کا وعظ سُناتے، اور عذابِ آخرت و پاداشِ عمل سے ڈراتے۔ الغرض ایک عجیب طرح کا فیض آپ کا اس قیدِ تنہائی میں بھی جاری رہا۔ سپاہی جو پہرے کے واسطے آتا، وہ سِکھ ہوتا یا گورکھا، اور مسلمان نہ ہوتا، آپ اُس کو اِس آیہ کریمہ کا وعظ سُناتے۔

ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار

سپاہی کھڑا روتا اور جب اُس کے پہرے کی بدلی ہوتی، تو اس صحبت کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

میں کچھ لکھ نہیں سکتا کہ کس قدر فائدہ اُس وقت پہرے والوں کو پہنچا، اور کتنے موحد ہو گئے اور کتنے دین آبائی چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ لا یعلمه الا اللہ۔ آپ کا فیض کبھی کسی حالت میں بند نہیں ہوا۔ آپ کا جسمِ مبارک قیدی تھا مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے۔ اُس پر کسی کی حکومت نہ تھی بجز اُس حاکمِ حقیقی کے۔ اگر

Marfat.com

دومنٹ کے واسطے بھی کوئی سامنے آجاتا، آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بجالاتے۔[1]

بہرحال جیل خانہ اور پھر جلاوطنی کی مصیبتیں آپ نے کس طرح شاداں و فرحاں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور ہر موقع پر خدمتِ خلق، بندگانِ خدا کی خیر خواہی، اتباعِ شریعت اور سنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے جذبات کار فرما رہے ہیں، اُن کی تفصیل بہت طویل ہے۔ صرف دو واقعے بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

(۱) حکمِ سزا کی تبدیلی کے بعد پھانسی گھروں سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا، اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری مونچھ داڑھی اور سر کے بال تراش کر مُنڈی بھیڑ بنا دیا۔ یہ جیل خانہ کا ایک جبری قانون تھا۔ جس کی تعمیل مجبوراً کرنی پڑی۔[2] مگر اس ترکِ سُنّت کا اثر مولانا یحییٰ علی صاحب پر یہ تھا کہ:

"اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اُٹھا اُٹھا کر کہتے کہ افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کتری گئی۔"[3]

(۲) رنج و محن کی اس زندگی میں یکے بعد دیگرے جو خبریں پہنچتی رہیں اُن پر ایک نظر ڈال لیجئے اور پھر کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ایمان کا جائزہ لیجئے۔

○ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب جو پورے خاندان کا آخری سہارا تھے، گرفتار کر لئے گئے۔

○ مولانا احمد اللہ صاحب کو پھانسی اور ضبطی جائداد کا حکم سُنایا گیا۔

---

[1] الدر المنثور صلا۔ [2] اگر تعمیل نہ کرتے تو جیل خانہ کی کوئی سزا دی جاتی۔ اور داڑھی رکھنا اگرچہ واجب یا سنّتِ مؤکدہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن غالباً مولانا موصوف کی رائے میں اس سُنّت کی یہ حیثیت نہیں تھی جس کے لئے سزا کی کوئی نئی مصیبت برداشت کی جاتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [3] تاریخ عجیب صلا ۳۵

Marfat.com

○ پھانسی کی سزا عبور دریائے شور سے بدل دی گئی مگر ضبطیٔ جائداد کا حکم بدستور باقی رہا۔

○ تمام جائداد قرق کر کے نیلام کی جا رہی ہے۔

○ مکانات خالی کرالئے گئے۔ بچوں اور عورتوں کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ تمام سامان و اسباب اور تمام کتابیں اور مسودات ضبط کر لئے گئے۔

○ تمام مکانات مسمار کرا دیئے گئے۔

○ خاندانی قبرستان کھدوا کر پھنکوا دیا گیا۔

کس کا کلیجہ ہے کہ ایسی ہوش رُبا اور لرزہ خیز خبریں سُنتا رہے اور متاعِ عقل و ہوش برباد نہ کر دے۔ مگر اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم جس کو چاہتا ہے بے پناہ ضبط و تحمّل عطا فرما دیتا ہے۔ جہادِ حریت کے شیدائی اور خونِ شہادت کے یہ آرزومند جب گھر سے نکلے تھے تو یہ مستقبل اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ سب کچھ قربان کر دینے کا تہیّہ کر کے ہی گھر سے نکلے تھے۔ صرف ایک تمنّا تھی کہ اُن کی یہ قربانیاں محبوبِ حقیقی کی نظر میں شرفِ قبولیت حاصل کر لیں۔ وہ دنیا میں نہ کسی معاوضہ کے آرزومند تھے، نہ کسی کے شکریہ کے اُمیدوار تھے۔ یہ جیسے سیاسی تھے ایسے ہی پابندِ مذہب خدا پرست بھی تھے۔ سیاست کا تقاضہ یہ تھا کہ وطنِ عزیز کی خاطر قربانیاں پیش کریں۔

مذہب کا تقاضا تھا کہ یہ قربانیاں کسی دنیاوی غرض کے لئے نہ ہوں بلکہ ایک فریضہ کی حیثیت سے محض ادائے فرض کی غرض سے ہوں۔

خدا پرستی کا تقاضا تھا کہ اللہ اور اُس کے رسول کی خوشنودی ان قربانیوں کا آخری نصب العین ہو۔

بس کوئی بھی اشارہ جس سے رضائے مولیٰ کا پتہ چلے، زخمِ دل کا مرہم اور تمام بے چینیوں اور پریشانیوں کے لئے تریاقِ مسرت تھا۔

چنانچہ ان تمام حوادث کے سُننے کے بعد ایک خط کے چند فقرے بھی ملاحظہ

Marfat.com

فرمالیجئے۔ یہ خط اس شہیدِ وفا نے اپنی اہلیہ کو لکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یحییٰ علی کی طرف سے۔ بخدمت ام حبیبہ ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نورِ چشم محمد حسن مد عمرہٗ کے حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتّہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گذرا، کیونکہ مکانِ سکونت قدیم سے خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو، اور کاروبار فریضہ بہت اجراء پائے ہوں مؤمنین کو انس و محبّت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔

بشارت اُسی روز شب کو روحِ انور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسّم کناں فرمانے لگے کہ البتّہ انہدام سے مکانوں کے، مالکانِ مکان کو خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے، اور ہونے کی جگہ ہے، اور ان آیاتِ کریمہ کو زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ[1] ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○

---

[1] اور جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، انہیں (کامیابی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی اُن پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو اُن کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں اور جو اُس رحمت کا مورد ہوتے ہیں، اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں (ترجمان القرآن)۔

Marfat.com

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ[1] ○

عَسٰى رَبُّنَا اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ[2] ○

اور فرمایا، ان آیاتِ کریمہ کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجدِ اقصیٰ اور مکاناتِ انبیاء علیہم السلام بخت نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیًا منسیا ہوگئے اور یہ اماکن متبرکہ از سرِ نو بنا ہوئے، اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے[3]۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی اُمید رکھو۔ . . . اللہ تعالیٰ

---

[1] اے ہمارے پروردگار ہمیں صبر کی نعمت سے شاد کام فرما، اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اُٹھا۔ [2] شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ [3] یہ تاریخی مثالیں سب درست ہیں لیکن اس موقع پر یہ بھی مسجدِ اقصیٰ وغیرہ کے انہدام اور دوبارہ آبادکاری، دو چار یا دس پانچ سال میں نہیں ہوئی۔ بلکہ صدیاں گذر گئیں۔ تب یہ انقلاب عمل میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابی طاقتیں اوّل تخم کی طرح نشوونما پاتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے زلزلہ اور طوفان بن جاتی ہیں۔ ابتدائی اور آخری منزل میں بسا اوقات صدیوں کا فرق ہوتا ہے۔ چشمِ ظاہر بیں ابتدائی منزلوں کو محسوس بھی نہیں کر سکتی۔ مگر درحقیقت مستقبل کا تخم یہی ابتدائی منزل ہوتی ہے اور اس منزل کی بنیاد رکھنے والے ہی عظیم الشان مستقبل کے اوّلین معمار ہوتے ہیں۔ پس مولانا یحییٰ علی صاحب اور اُن کے رفقاء کی جدّ و جہد کا کوئی ثمرہ اُس وقت ظاہر نہیں ہوا۔ مگر حبِّ وطن اور ولولہ آزادی کا وہی تخم تھا جو دن بدن بڑھتا رہا اور یہاں تک کہ اس کا ایک ثمرہ وہ ہے جو تقریبًا نوے سال بعد آزادیٔ ہند شکل میں نمودار ہوا جس نے انگریزوں کو پورے ہندوستان سے مُلک بدر کر دیا۔ پس مولانا کی یہ خواب نظرِ ظاہر بیں میں وہم و خیال ہو سکتی ہے لیکن دور اندیش اور حقیقت شناس نظریں اس کو رویاء صادقہ قرار دیں گی۔ محمد میاں

Marfat.com

کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشقِ خالق دونوں جہاں میں ہم
نام و نشانِ دارِ فنا کے ڈوبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
ہم جوگی ہوئے محرمِ اسرار کے لئے

○

اے فدائے من فدایت جانِ من
جملہ فرزندان و خان و مانِ من

(اقتباس از مکتوب مؤرخہ ۲۱ جمادی الاولی روز یکشنبہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء)

محمد میاں

۲۵ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ - ۱۵ اگست ۱۹۵۵ء - یوم دوشنبہ

Marfat.com

اَسْمَاءُ الرِّجَال

ان شخصیتوں کے نام جن کا کسی بھی مناسبت سے اس کتاب میں ذکر آیا ہے اور حوالہ صفحات

ضروری گذارش (۱) اصل نام (یا مشہور کنیت) حروف ہجا کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں خطابات یا تعظیمی الفاظ نام کے بعد لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا الحاج سید ابوالحسن علی ندوی مصنف "سیرت سید احمد شہید"، ابوالحسن علی کے نام و کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ تو اُن کا نام الف کے باب اور با کی ترتیب میں لایا گیا ہے، اور تعظیم و تعارف کے تمام الفاظ بعد میں لائے گئے ہیں۔

(۲) اکثر ناموں میں اسمِ مبارک "محمد" تبرکاً بڑھا دیا جاتا ہے، اصل نام کا جز نہیں ہوتا ایسے موقع پر اصل نام ترتیب میں لایا گیا ہے۔ لفظ "محمد" بعد میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید کا اصل نام "اسمٰعیل" فہرست میں باب الف ترتیب س میں لایا گیا ہے۔ باقی تمام الفاظ بعد میں لکھے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۸

الف

۱ ابراہیم منڈل ۱۲۲، ۱۵۴
۲ اتم سنگھ، ۴۳
۳ اجیت سنگھ سندھان والا ۴۶
۴ احمد اللہ، مولانا-۳۹، ۹۷، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۵۸
۵ احمد حسین، مولانا قاضی شاہ ۱۸
۶ احمد علی ۱۲
۷ اسحاق دہلوی، شاہ محمد ۲۰، ۲۸
۸ اسمٰعیل شہید، شاہ محمد ۹، ۲۰
۹ اشرف، محمد ۱۳، ۱۴
۱۰ اکبر شاہ، سید ۶۰
۱۱ اکبر علی ۴۰، ۵۳
۱۲ الٰہی بخش ۳۹
۱۳ الٰہی بخش ۱۲۶
۱۴ امام الدین، شیخ ۴۸
۱۵ امیر الدین، مولانا ۱۲۹ تا ۱۳۲، ۱۳۴
۱۶ امیر خاں ۱۳۵ تا ۱۳۸
۱۷ امین الدین، حاجی ۱۳۵

Marfat.com

ب

۱۸ بدیع الزماں، بردوانی ۲۹، ۳۸

پ

۱۹ پشوراسنگھ ۴٦

۲۰ پیر محمدؐ ۱۳۵، ۱۳۸

ت

۲۱ تبارک علی، مولانا ۱۳۵، ۱۳۸

۲۲ تیج سنگھ ۴۷

ج

۲۳ جعفر تھانیسری، مولانا محمدؐ ۷۹، ۹۰، ۹۲، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲٦، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۳ تا ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۰ تا ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۷ -

۲۴ جواہر سنگھ ۴٦

۲۵ جہاں داد خاں ٦۸

چ

۲٦ چتر سنگھ ۵۱

۲۷ چندرکور، رانی ۴۴، ۴٦، ۴۸، ۵۰

ح

۲۸ حسینی ولد محمد بخش ۱۲۵

۲۹ حسینی ۱۲٦

۳۰ حشم داد ۱۳۵

د

۳۱ دلیپ سنگھ ۴٦، ۵۱، ۵۴

۳۲ دوست محمدؐ خاں ۵۰

۳۳ دھیان سنگھ ۴۱ تا ۴۵

۳۴ دیبی پرشاد، مصنف گلشن پنجاب ۴۳، ۴۷، ۵۲ -

۳۵ دین محمد، حاجی ۳۵، ۱۳۸

ر

۳٦ راونشا، کلکٹر پٹنہ، ٹی آر ۱۰۷

۳۷ رحمت اللہ غازی ۱۰۷

۳۸ رفیع الدین حسن خاں ۱۲

۳۹ رفیق منڈل ۱۳۰، ۱۳۱

۴۰ رنجیت سنگھ، مہاراجہ ۴۱، ۴۲، ۴۷

ز

۴۱ زین العابدین حیدرآبادی ۳۹

س

۴۲ سڈنی کاٹن، سر ۷۵

۴۳ سلطان محمد خاں ۵۰

۴۴ سوجیت سنگھ ۴۱

۴۵ سید احمد شہید، حضرت - ۹، ۱۴، ۱۸، ۱۹

Marfat.com

ش

۴۶ شریعت اللہ، حضرت مولانا ۶۶

۴۷ شفیع انبالوی، محمدؐ ۱۲۳، ۱۲۵

۴۸ شیر سنگھ ۴۴، ۱۴۵

۴۹ شیر سنگھ، رئیس ۵۱

ض

۵۰ ضامن شاہ، سید ۴۰، ۵۲، ۵۳

۵۱ ضامن شاہ، سید تھانہ کیمپ ۵۹، ۶۰

ع

۵۲ عبّاس، سید رئیس ۶۷

۵۳ عبّاس، مولانا محمدؐ ۳۹

۵۴ عبدالحمید، حکیم ۱۲۷

۵۵ عبدالحئی، حضرت مولانا ۹، ۲۰

۵۶ عبدالرحمٰن، مولانا ۱۳۰

۵۷ عبدالرحیم، سر سپیکر مرکزی اسمبلی ۱۰۷

۵۸ عبدالرحیم، مولانا
۲۰، ۲۷، ۲۸، ۵۷، ۶۱،
۶۹، ۷۰، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۲۸،
۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۵۵، ۱۵۷

۵۹ عبدالعزیز دہلوی، حضرت شاہ۔
۹، ۱۹، ۲۷

۶۰ عبدالغفار میاں۔ ۱۲۳

۶۱ عبدالغفور ۱۲۵

۶۲ عبدالکریم ۷۷، ۱۲۵

۶۳ عبداللہ، مولوی ۲۸، ۵۳، ۷۶، ۷۷

۶۴ عمر شاہ، سید۔ ۷۳

۶۵ عنایت علی غازی، حضرت مولانا ۷، ۲،
۳۸ تا ۴۰، ۵۳، ۵۹، ۶۱، ۶۴، ۶۵
۶۷، ۶۸، ۷۳، ۷۴، ۸۶

غ

۶۶ غزن خاں۔ ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵

۶۷ غلام رسول مہر مصنف سید احمد شہید۔ ۵۶

ف

۶۸ فتح علی، مولانا۔ ۱۷، ۲۲، ۲۳، ۲۷

۶۹ فرحت حسین، سید۔ ۵۳، ۹۵، ۹۶

۷۰ فیاض علی۔ ۳۹، ۵۳

ک

۷۱ کھڑک سنگھ ۴۲، ۴۳، ۴۴

۷۲ کہمان سنگھ ۵۰

گ

۷۳ گرے، ڈاکٹر ۴۵

۷۴ گلاب سنگھ ۴۰، ۴۱، ۴۴، ۴۶،
۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۵۴۔

۷۵ گلاب سنگھ ۵۰

۷۶ گنگارام ۵۰

Marfat.com

ل

۷۷ لال سنگھ۔ ۴۶، ۴۷، ۴۸

۷۸ لہنا سنگھ، سندھان والا ۴۶

م

۷۹ مبارز الدولہ ۲۴، ۲۵

۸۰ مبارک علی، مولانا۔ ۹۷، ۹۸، ۱۳۵

۸۱ محمد حسن ذبیح، مولوی ۹۸

۸۲ محمد حسین شاہ۔ ۲۷، ۳۱

۸۳ محمد علی رامپوری، سید۔ ۲۴، ۲۷

۸۴ مسعود عالم، مولانا محمد، مصنف اسلامی تحریک۔ ۶۶

۸۵ مقصود علی، میر ۷۵

۸۶ مولراج، دیوان ۴۹، ۵۰

۸۷ میاں جان، قاضی۔ ۱۳۴

ن

۸۸ ناصر الدولہ۔ ۲۴

۸۹ نثار علی عرف ٹیٹو میاں۔ ۲۶

۹۰ نعمت اللہ ۷۷

۹۱ نور اللہ، مولانا۔ ۴۷، ۷۵، ۹۶

۹۲ نونہال سنگھ ۴۲، ۴۳، ۴۴

و

۹۳ ولایت علی، حضرت مولانا۔ ۱۶، ۲۰ تا ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۸، ۴۰، ۵۱، ۵۳ تا ۵۶، ۵۹، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۹۵۔

۹۴ ولی اللہؒ، شاہ ۹، ۱۱

ھ

۹۵ ہنٹر، ڈاکٹر ولیم ولسن ۹، ۲۸ تا ۳۱، ۳۴، ۵۹، ۷۰، ۸۰، ۸۸ تا ۹۲، ۹۴، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵ تا ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۵۴۔

۹۶ ہیرا سنگھ۔ ۴۱، ۴۵، ۴۶

ی

۹۷ یحییٰ علی جعفری، مولانا۔ ۴۰، ۵۳، ۹۶، ۱۲۲، ۱۳۱، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱

۹۸ یحییٰ علی، غازی پوری۔ ۱۰۵

تم بالخیر والحمد للہ

مرتبہ:

خالد میاں عفی عنہ

۵ صفر ۱۳۷۷ھ، یکم ستمبر ۱۹۵۷ء

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com